ڈاکٹر سید تقی عابدی

بطور اقبال شناس

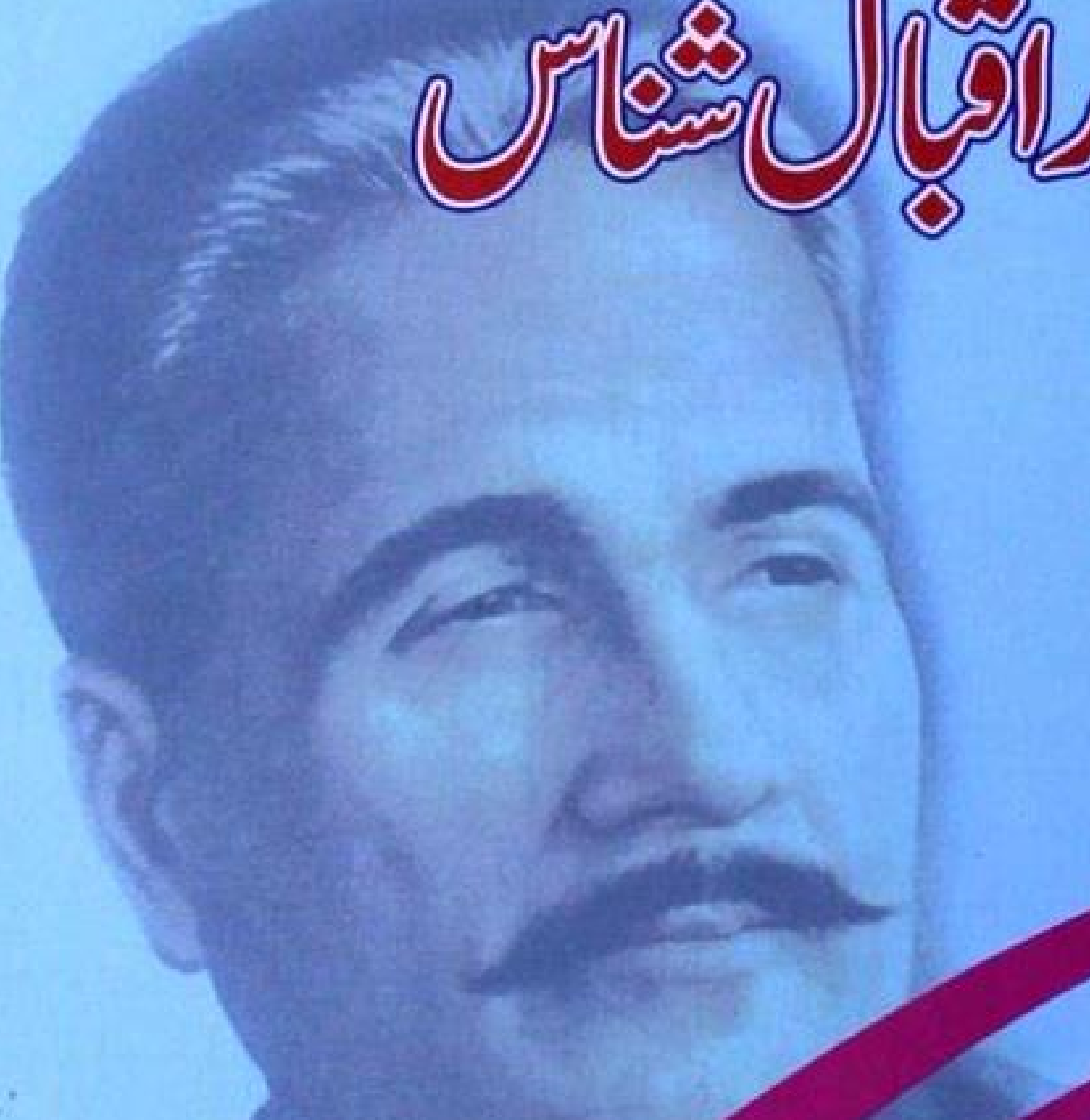

شازیہ گل

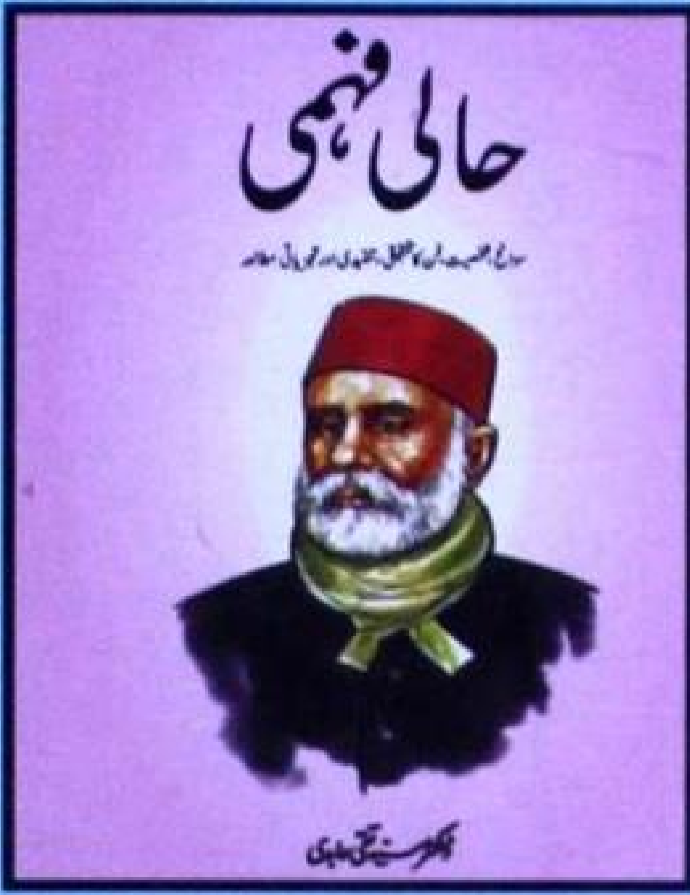
حالی فہمی

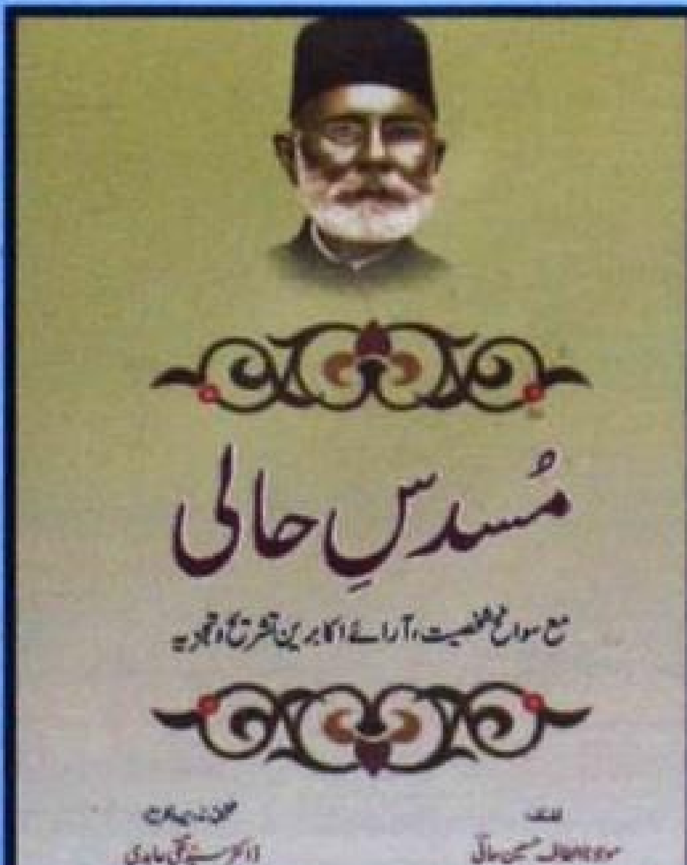
مُسدسِ حالی
مع سوانح شخصیت، آرائے اکابرین تشریح و تجزیہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی

بطور اقبال شناس

شازیہ گُل

ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی

©جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

کتاب : ڈاکٹر سید تقی عابدی: بطور اقبال شناس

مصنف : شازیہ گل

مطبع : ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

ناشر : ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز

10 میٹروپول مارکیٹ، 25-2724 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

Dr. Syed Taqhi Abedi: Bator Iqbal Shanas

by

Shazia Gul

ISBN: 978-93-86125-30-9
First Edition :2016
Price: **₹ 300/-**
Library Edition: ₹ 475/-

Printed & Published by

M. R. Publications

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

 # 10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com

انتساب

استاد گرامی پروفیسر ڈاکٹر شاہد اقبال کامران

کے نام

جن کی توجہ، رہنمائی اور سرپرستی نے اس مقالے کی تکمیل کے ہر مرحلے کو آسان کر دیا

ع شاگرد جو بنا اُسے استاد کر دیا

شازیہ گل

نوٹ: اس کتاب کو پاکستان میں شائع کرنے کی ذمہ داری وحقوق بک کارنر، جہلم، پاکستان کے پاس ہیں۔

Our Distributors

Delhi/New Delhi
Kutub Khana Anjuman Taraqqi Urdu 011-23276526
Maktaba Jamia Ltd. 011-23260668
Ahluwalia Book Depot 09818441306
Al-Balagh Publications 09971477664
Nai Kitab Publishers 011-65416661

Ahmedabad
Amreen Book Agency 08401010786, 09898102956

Aurangabad
Mirza World Book House 09325203227
Shalimar Book House 02402338849
Hanafia Book Depot 02402324667
Alamgeer Book Depot 09273150398

Nagpur
Haneef Book Depot 0712-2722546, 09823237556

Aligarh
Educational Book House 09358251117
Maktaba Jamia Ltd. 0571-2706142

Kerala
Payam Publications 09946705110

Surat
Kazee Book Depot 08401786081 0261-2491985

Pakistan
Book Corner, Jhelum Pakistan
0323-5777931 Email: bookcornershowroom@gmail.com

Mumbai
Maktaba Jamia Ltd. 022-23774857
Kitab Daar 022-23411854,9869321477
Saifi Book Agency 09820480292
Siddiqai Book Depot 022-23455652
Aqsa Book Depot 022-23454730
Abdus Salam Qasmi 09322603836

Hyderabad
Huda Book Distributors 9849330850, 040-24514892

Kolkata
Usamania Book Depot 9433050634, 09433050635

Jammu, J & K
Qasmi Kutub Khana 09797352280

Srinagar, J & K
Maktaba Ilm-o-Adab 09419407522, 0191-2482371

Allahabad
Shabkhoon Kitab Ghar 0532-3295063, 09450615881

Malegaon
City Book Depot 09226728995

Lucknow
Maktaba Lari 8187962851, 872602878[illegible]

ابواب بندی

حرفِ آغاز — شازیہ گل — 9

باب اوّل — ڈاکٹر تقی عابدی کی سوانح — 12

☆ ڈاکٹر تقی عابدی کی متنوع علمی دلچسپیاں — 16

☆ ڈاکٹر تقی عابدی اور ترویج زبان وادب — 25

☆ ڈاکٹر تقی عابدی کی انیس شناسی — 26

☆ ڈاکٹر تقی عابدی کی فیض فہمی — 33

☆ ڈاکٹر تقی عابدی اور مطالعات غالب — 37

باب دوم — چوں مرگ آید — 42

مقدمہ کا توضیحی مطالعہ — 42

چوں مرگ آید کا توضیحی اور تجزیاتی مطالعہ — 48

باب سوم — اقبال کے عرفانی زاویے ایک تجزیاتی مطالعہ — 123

☆ اقبال عاشقِ رسول ﷺ اور اہل بیت — 123

علامہ اقبال کی دعا — 141

اقبال عاشق امام حسینؓ — 150

منقبت حضرت فاطمہؓ (اقبال کی قلبی واردات) — 155

اقبال اور عشق حضرت علیؓ 160
قصیدہ بردہ بوصیریؒ اور اقبال 169
☆ اقبال اور شخصیات
مولانا ندوی سے اقبال نے کیا دریافت کیا 174
علامہ اقبال اور حسن نظامی کی قلمی جنگ 178
علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی 188
علامہ اقبال اور ٹیپو سلطان 189
علامہ اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد 201
علامہ اقبال اور ڈاکٹر راس مسعود 205
علامہ اقبال اور آفتاب اقبال 209
کیا داغ دہلوی کے علاوہ علامہ کسی اور کے شاگرد ہیں 217
معلم اقبال شمس العلماء مولوی میر حسن 223
مولانا گرامی اور علامہ اقبال 230
علامہ اقبال کا ابتدائی کلام 232
☆ اقبال اور فلسفیانہ نظر
اقبال کا تصور زمان و مکاں 239
☆ متفرق مضامین
علامہ اقبال کا شاہین 251
علامہ اقبال پر تہمت شراب نوشی 261
علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی 269

☆ اقبال اور عالمی و سیاسی صورت حال

علامہ اقبال اور مسئلہ فلسطین 274

علامہ اقبال اور حیدر آباد دکن 284

باب چہارم ڈاکٹر تقی عابدی کی علمی زندگی میں مطالعہ اقبال کی اہمیت و معنویت 305

کتابیات 324

حرف آغاز

شکر گزار ہوں اس علیم و کریم کی جس نے لفظ (اقراء) سکھا کر انسان کے دل و دماغ کو تحقیق اور جستجو کے لیے معطر کیا۔ انسان کے قلب و فکر میں علم کی تمازت دی کہ وہ کائنات کی وسعتوں میں اس کی نشانیاں تلاش کر سکے۔ غور و فکر کے ذریعے تحقیق کی مزید راہیں کھولتا چلا جائے۔ دوسری صد شکر کے لائق حضور کی بابرکت ذات ہے۔ جس نے خود لفظ (اقراء) پڑھ کر انسان کی تعلیم کا آغاز کیا اسی اُمی لقب کے عشق میں سرشار ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی فکر و جستجو کا مادہ میرے اندر بھی موجود تھا۔ اقبال کی فکر کو سمجھنا ہر کس و ناکس کے لیے آسان نہیں۔ ایک تجسس تھا کہ میں اقبال کی فکر کو اور ان کی نجی زندگی کو عام قاری سے ہٹ کر سمجھ سکوں۔ چنانچہ اسی شوق کی تکمیل کے لیے میں نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کا رُخ کیا۔ دور دراز دیہاتی علاقے سے تعلق کی بناء پر مجھے تحقیق جیسے مشکل اور دلچسپ مرحلے کے متعلق کوئی خاطر خواہ آگاہی نہ تھی۔ یونیورسٹی کے شعبہ اقبالیات نے اس سلسلے میں میری ڈھارس بندھائی اور رہنمائی کے لیے ایک تحقیقی ورکشاپ کا اہتمام کیا۔ جس میں ماہرین اقبالیات نے قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی اور موضوع کے انتخاب کرنے میں ہر ممکن امداد کی شعبہ اقبالیات علامہ اقبال اوپن یونیوسٹی کی طرف سے مجھے تحقیقی موضوع ''ڈاکٹر تقی عابدی کی اقبال شناسی'' تفویض ہوا۔ اس ورکشاپ کے بعد میں اس قابل ہو چکی تھی کہ تحقیق میں پہلا قدم رکھتی۔ میرے لیے وہ لمحہ ناقابل فراموش ہے جب میری درخواست پر شعبہ اقبالیات کے چیئرمین ڈاکٹر شاہد اقبال کامران نے مجھے اپنی زیر نگرانی کام کروانے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ انہوں نے میرے موضوع کو سراہا اور مجھے مواد اکٹھا کرنے کے لیے مفید مشوروں کے علاوہ قدم قدم پر اعانت کرنے کی بھی یقین دہانی کرائی۔ اس صبر آزما اور کھٹن تحقیقی کام میں میرے نگران استاد محترم کی طرف سے کی گئی حوصلہ افزائی

میرے شامل حال نہ ہوتی تو یقیناً میں اپنے شوق اور اس علمی کام کو با آسانی پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکتی۔

چونکہ میرا موضوع اقبال شناسی پر مبنی تھا اور ڈاکٹر تقی عابدی کے افکار کا تجزیہ و توضیح میری تحقیق کا حصہ بن چکا تھا۔ لہٰذا مجھے اب اپنی معلومات کو وسیع کرنے کی ضرورت تھی۔ مجھے پیشے کے طبیب اور ادب کے مریض کے اس علم کے سمندر کو علمی جہت کے لحاظ سے سمجھنا تھا۔ جس نے اقبال پر تو کام کیا ساتھ ہی زبان و ادب کے بہتر مستقبل کی خاطر انیس، دبیر، اور غالب جیسی شخصیات پر قابلِ قدر کام کیا اردو اور فارسی ادب کے باب میں ڈاکٹر تقی عابدی کا مطالعہ قابل رشک حد تک وسیع ہے وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے مزاج شناس، ان کی تاریخی و ثقافتی پس و منظر سے واقف اور اس دور کے نمائندہ شعراء کے محاسن و کمالات کا سچا ذوق رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال کے فلسفہ پیغام، عمل اور فکر و فن کے حوالے سے پرستار اور شیدائی ہیں۔ رثائی ادب کے عمدہ لکھاری ہیں۔

میرا مقالہ ڈاکٹر تقی عابدی کی شخصیت فن اور ادبی خدمت کا جائزہ ہے۔ اس جائزے کو مدنظر رکھ کر پہلا باب تقی عابدی کی سوانح پر مشتمل ہے۔ شعبہ اقبالیات سے تعلق کی بناء پر مجھے ان کی وہ کتابیں منتخب کرنا تھی جو اقبال شناسی پر مبنی ہوں۔ اردو زبان و ادب کی دیگر جہات کے علاوہ اقبال کا فکر و فن بھی ان کی توجہ کا مرکز ہے۔ اس ضمن میں ان کی دو کتابیں نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔

ان میں پہلی کتاب ''اقبال کے عرفانی زاویے'' ہے جو دوسرے باب میں رکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں تقی عابدی نے متفرق مضامین شامل کیے ہیں جن کے ذریعے ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کی فکری جہتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کتاب اقبال کی نجی زندگی کے بہت سے گوشوں پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ تقی عابدی نے ان اکتیس (۳۱) مضامین میں اقبال کی فکر کو مستند نظم و نثر کے موثر حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دوسری کتاب ''چوں مرگ آید'' ہے یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک نادر تحفہ ہے۔ جس میں علامہ اقبال کی بیماریوں کو مستند خطوط کے آئینے میں پیش کیا گیا ہے۔ کوئی ایسی بیماری نہیں جو اقبال کو لاحق ہوئی ہو اور تقی عابدی نے اس کا ذکر اس کتاب میں نہ کیا ہو۔ بیماریوں کے دوران اقبال کی امید اور استقامت کے تاثرات کو بھی بیان کرنا تقی عابدی کا قابل تحسین کارنامہ

ہے۔عوارض کے علاج کے سلسلے میں ادویات اور معالجین کا ذکر بھی کیا گیا۔ یہ کتاب میرے مقالے کے تیسرے باب میں شامل ہے۔ چوتھا باب میری تمام تحقیق کا ثمر سمجھا جا سکتا ہے۔

اپنے تحقیقی کام کو بخوبی احسن انجام دینے کے لیے میں نے اپنے نگران پروفیسر ڈاکٹر شاہد اقبال کامران کے توسط سے اردو ادب کے درخشنداں ستارے ڈاکٹر تقی عابدی سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا۔ میں دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے موضوع سے متعلقہ ہر طرح کا مواد کینیڈا اور انڈیا سے ارسال کیا۔ ان کی مدد کے بغیر میں اپنے مقالے کو مکمل کرنے کا سوچ بھی نہ سکتی تھی۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی کتب کے علاوہ مجھے تحقیق کے سلسلے میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے کتب خانے سے استفادہ کا موقع ملا۔ اس کتب خانے سے مجھے تسلی بخش مواد میسر آیا جس کی روشنی میں سندی تحقیق ممکن ہوئی۔ اس کتب خانے میں مجھے سب سے مفید مواد مظفر حسین برنی کا چار جلدوں پر مشتمل کلیات مکاتیب اقبال ملا جو میرے کام کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ اقبال سے متعلقہ بہت سی گراں بہا کتب میرے لیے کارگر ثابت ہوئیں۔

میں اپنی تمام تر کامیابیوں کی ذمہ داری اپنی والدہ محترمہ کو سمجھتی ہوں جن کی دعاؤں کے اثر سے میں ایم۔فل اقبالیات کے درجے تک پہنچ گئی۔ ورنہ ایک دور دراز دیہاتی علاقے سے تعلق ہونے کی بناء پر میں اعلیٰ تعلیم کا سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ والد صاحب کی دعا کے ساتھ ساتھ مالی اعانت نے میرے اندر ایک اعتماد پیدا کیا۔ محمد انور چوہدری صاحب کی تہ دل سے مشکور ہوں کہ انہوں نے کمپوزنگ کے ساتھ ساتھ پروف ریڈنگ میں بھی رہنمائی فرمائی۔ ان تمام گراں قدر شخصیات کے تعاون محبت اور توجہ کے عوض رب عزوجل سے دعا گو ہوں کہ وہ بابرکت ذات ان کو آسانیاں عطا فرمائے۔ (آمین)

شکریہ

شازیہ گل

باب اوّل

ڈاکٹر تقی عابدی کی سوانح

سنجیدہ اردو داں ادبی حلقے سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر تقی عابدی اعلیٰ درجے کے محقق شاعر اور نقاد ہیں۔ اُردو کی ہمہ گیری کو استحکام بخشنے کے لیے عالمی پیمانے پر سمیناروں اور کانفرنسوں کا انعقاد بھی کرتے رہتے ہیں تاریخ میں بڑے بڑے سخن ور گزرے ہیں جنھوں نے ادب کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچادیا۔ادب کے یہ مریض پیشہ ورانہ طور پر طبیب ہیں۔ آپ یکم مارچ ۱۹۵۲ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد سبط نبی قانون دان تھے۔ جب کہ دادا شبیر علی زمیندار تھے۔ آپ کے خاندان میں بے شمار علماء گزرے ہیں۔ اس لیے مذہب سے محبت اور تہذیب سے وابستگی ان کو وراثت میں ملی تھیں گھر کا ماحول بھی ادبی تھا۔ بلکہ گھر میں مطالعہ کے لیے چھوٹی سی لائبریری کھول رکھی تھی۔ مسلمان بچوں کی طرح ابتدائی قرآنی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان دار الشفاء ہائی سکول حیدآباد دکن سے پاس کیا۔ ایف ایس۔سی سیف آباد کالج حیدرآباد دکن سے پاس کی۔ بچپن سے ہی شاعری سے دلچسپی تھی اردو ادبیات کے ساتھ لگاؤ کی وجہ سے ہندی زبان سیکھی تھی۔ ہندی زبان کے علاوہ انگریزی اور اردو میں عبور حاصل تھا۔ ایم۔بی۔بی۔ایس ۱۹۷۵ء میں حیدرآباد انڈیا سے کیا۔ ایم ایس سی (پتھالوجی) گلاسکو یونیورسٹی برطانیہ سے کی۔ اور ایف سی اے پی کی ڈگری (ڈپلومیٹ آف امریکن بورڈ آف پتھالوجی) سے حاصل کی ایف۔آر۔سی۔پی کی ڈگری فیلو آف رائل کالج آف فزیشن اینڈ سرجن کینیڈا سے حاصل کی ۱۹۷۵ء میں ایران تشریف لے گئے۔ ایرانی ادب کا مطالعہ کرنے کے لیے فارسی زبان سیکھی۔ اسی دوران محترمہ گیتی صاحبہ سے ملاقات ہوئی اور بڑوں کی اجازت سے یہ رشتہ ازدواج میں تبدیل ہوگیا۔ محترمہ گیتی سے ان کی چار اولادیں ہیں دو بیٹیوں کا نام معصومہ اور رویا ہے جب کہ دو بیٹے ہیں جن کا نام رضا اور مرتضٰی ہے۔ طبی تحقیق کے سلسلے میں امریکہ، برطانیہ، کینڈا،

ایران اور ہندوستان کا دورہ کرتے رہتے ہیں۔ آج کل کینڈا میں پتھالوجسٹ اور فزیشن کے طور پر معروف ہیں۔ ان کا پیشہ تھکا دینے والا ہے اپنی بے حد مصروفیات میں سے ادب کے لیے اوقات کار وقف کر رکھے ہیں۔ ذہنی اور اعصابی طور پر تھکاوٹ کے باوجود ادبی اور لسانی کام مسلسل سرانجام دیتے جا رہے ہیں۔ اپنے تعارف کے متعلق چند الفاظ یوں رقم کرتے ہیں:

''میرا آبائی تعلق امروھہ سے متعلق سادات کی بستی نوگاؤں سادات سے ہے ہمارا خاندان سید بڑے کا خاندان کہلاتا ہے۔ اور ہمارا شجرہ نسب حضرت نظام الدین اولیاء سے جا ملتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی ثانی اسی نسبت سے مجھے اپنا رشتہ دار کہا کرتے تھے۔ ہمارے خاندان میں رائج علوم کے بے شمار علماء گزرے ہیں ہمارے جد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ''حق الیقین'' نامی دو سو اٹھارہ سال پرانی کتاب میرے پاس ابھی بھی محفوظ ہے۔ میری پیدائش البتہ دہلی میں ہوئی اور حیدر آباد دکن بچپن سے میرا وطن بن گیا۔ بچپن ہی سے شعروادب سے خاصی دلچسپی رہی جس کے باعث سکول و کالج کے ایام میں شعری مشغلہ جاری رہا'' (۱)

محترمہ گیتی سے ملاقات کے متعلق ڈاکٹر تقی عابدی فرماتے ہیں:

''بطور طبیب جب میں ایران میں مشغول تھا تو میری خاتون خانہ سے وہیں ملاقات ہوئی اور تھوڑے عرصے بعد ہم دونوں کی رضامندی اور بڑوں کی اجازت سے ہماری شادی ہوگئی۔ میری شریک حیات گھر کی دیکھ بھال بچوں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ میرے علمی جہاد میں ہمیشہ میری معاونت کرتی رہی ہیں اور آج بھی ان کے تعاون کے بغیر میرا ادبی سفر جاری رکھنا ناممکن ہے۔'' (۲)

مطالعہ کے لیے درکار وقت کے حوالے سے تقی عابدی خود بیان کرتے ہیں:

''اگر سچ کہا جائے تو زندگی میں وقت کی کمی نہیں ہے۔ وقت کی کمی کو بہانہ بنا کر ہم لوگ بہت سے کاموں سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ میں

اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود ہر ہفتے اوسطاً پینتالیس سے چالیس گھنٹے لکھنے پڑھنے پر صرف کیا کرتا ہوں ہر وقت میرے ذہن کے خاکے میں ان موضوعات پر غور وفکر جاری رہتا ہے جن پر میں آئندہ لکھنے کی منصوبہ بندی کرتا ہوں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ادب ہی میرا اوڑھنا اور بچھونا ہے جسے میں اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے خود پر طاری رکھتا ہوں معنی اور مطالب خود بہ خود سانچوں میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں اور جب قرطاس وقلم لیکر بیٹھتا ہوں تو الفاظ بارانِ رحمت کی طرح خود بخود برسنے لگتے ہیں یہ بات صرف ذوق و شوق کی ہے۔" (۳)

شاعری اور ادبی تحقیق ان کا ذوق مطالعہ اور تصنیف ان کا شوق ہے۔ جب کہ کسی استاد سے باقاعدہ استفادہ بھی نہیں کیا ان کے ادبی فن پارے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ادب کو اوڑھنا اور بچھونا بنا رکھا ہو اور ان کی زندگی کا مقصد اور محور تحقیقات ہی ہوں۔ انیس، دبیر اور اقبال تو بطور خاص ان کی دریافتوں اور فکر انگیز تجربوں میں شامل ہے۔ ان گراں قدر شخصیات کے علاوہ انشاء اور فانی کو بھی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ تحقیق کے علاوہ تنقید سے بھی خاصہ شغف ہے ۱۹۶۹ء میں ۱۵ سال کی عمر میں، مَیں نے پہلا اُردو آرٹیکل روزنامہ سیاست حیدر آباد دکن سے شائع کیا جس کا عنوان ''قطب شاہی گنبد'' تھا۔ پہلا کتابچہ ۱۹۶۷ء میں قطب شاہی سلطنت کے پانچویں حکمران ''عبداللہ قطب شاہ'' پر تھا۔ مطالعے کے شوق میں دوستوں سے تحفہ صرف کتابی شکل میں لینا پسند کرتے تھے ۱۹۸۱ء میں مشہور عالم مطہری کی فارسی کتاب کا اردو ترجمہ کیا جو شہادت کے فلسفے پر ہے۔ تحقیق وتنقید کے علاوہ ترتیب وتدوین کا میدان بھی تقی عابدی کی شخصیت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ مجلوں میگزینوں میں شعری اور نثری فن پارے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مرزا دبیر پر سات کتابیں لکھ چکے ہیں۔ مجتہد نظم مرزا، دبیر، طالع مہر، مصحف فارسی، مثنویات دبیر، سلکِ سلام دبیر، رباعیات دبیر خاص طور پر مقبول ہو چکے ہیں۔ مقدمات کی صورت میں تخلیقی نثر میں بھی جوہر دکھا چکے ہیں چوں مرگ آید کا مقدمہ اپنی مثال آپ رکھتا ہے۔ معروف شعراء کے علاوہ گم شدہ اور گم نام شاعروں کو بھی ادبی دنیا میں ان کا نام دلوانے کی پوری کوشش کرتے رہتے ہیں۔ نجم آفندی اور نقش لکھنوی پر کام اس سلسلے میں

ہے۔علم کی پیاس بجھانے کے لیے کینڈا میں تقی عابدی لائبریری کے نام سے لائبریری بنا رکھی ہے۔ وہ سلسلہ جو بچپن سے لائبریری سے منسلک تھا ابھی تک وہ جاری و ساری ہے۔ متفرق موضوعات پر اس لائبریری میں تقریباً ۱۳۰۰۰ سے ۱۴۰۰۰ تک کتابیں موجود ہیں۔ ۱۵۰۰ مخطوطات فارسی اور اردو میں ہیں جن میں زیادہ تعداد مرثیوں کی ہے۔ کاغذات کی تعداد تقریباً ۸ سے ۹ لاکھ ہے۔ تقی عابدی نے اپنی حیات میں ہی اس لائبریری کے متعلق وصیت کر رکھی ہے کہ ان کی وفات کے بعد یہ علمی ذخائر کسی یونیورسٹی کو بطور عطیہ دے دی جائیں۔ غرض تقی عابدی نے مغرب کی سرزمین میں رہ کر مشرق کے علم و ادب کا ستارہ روشن رکھا ہوا ہے۔ نظم، نثر، مرثیہ، منقبت، تغزل اور مقالہ نگاری یہ تمام علمی جہتیں تقی عابدی کو عروج کمال تک پہنچا چکی ہیں۔ تقی عابدی اپنی تمام تر کامیابی کو رسولؐ اور آل رسولؐ سے عشق کا ثمر قرار دیتے ہیں۔

خود فرماتے ہیں:

> ''شاعری میں میرا کوئی باقاعدہ استاد تھا اور نہ ہے۔ علوم و عروض اور قافیہ سے بے خبر شعر کہنے سے بعض اوقات تحسین ناشناس اور سکوت سخن شناس کا سامنا کرنا پڑا جس کی طرف توجہ کر کے میں نے از خود علوم و عروض قافیہ اور شاعری سے مربوط دیگر علوم و ادب کا دقیق مطالعہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شعر کی تقطیع میرے لیے مدرسہ کی وہ تختی بن گئی جن پر اطفال حروف تہجی کی مشق کیا کرتے ہیں۔'' (۴)

تقی عابدی نے شاعری کے رموز کو سمجھنے کے لیے خود بھی ''رموز شاعری'' کے نام سے کتاب لکھی۔ جس میں اُردو کے مروجہ اوزان کی تقطیع مثالوں کے ساتھ پیش کی۔

مخطوطات کے متعلق خود تقی عابدی بیان کرتے ہیں

> ''جہاں تک قلمی ذخائر اور مخطوطات کا تعلق ہے میرے کتب خانے میں چودہ سو کے لگ بھگ مخطوطات ہیں جن میں زیادہ تعداد علمی مرثیوں رثائی بیاضوں اور قدیم مسودوں کی ہے۔ ان مخطوطات کو میں نے تیس سال کے عرصے میں جمع کیا ہے کتب خانے کی نادر کتابیں اور مخطوطات تمام

برصغیر سے جمع کی گئی ہیں رثائی ادب کی کتابیں اور کچھ قلمی مرثیے اور قلمی بیاضیں راقم کو ''جعفر منزل'' سے حاصل ہوئیں۔ جن کی تعداد بہت زیادہ نہیں مجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ بہت سی کتب کینڈا نہیں پہنچ سکیں اور یہ بھی پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کہاں رہ گئیں۔'' (۵)

لائبریری کو بطور عطیہ دینے کے متعلق ایک سوال کے جواب میں تقی عابدی بیان کرتے ہیں

''چونکہ میرا تعلق تحقیق و تنقید کے ساتھ بہت گہرا ہے اور میں نے ذاتی تجربات سے بھی محسوس کیا ہے کہ میرے پاس محفوظ ذخائر مستقبل میں تحقیق و تنقید کے لیے بے حد کارآمد اور مفید رہیں گی لہٰذا تا حیات تک ان ذخائر سے میں استفادہ کرتا رہوں گا میرے بعد فوری طور پر یہ علمی اور ادبی ذخائر یونیورسٹی کے ذخائر علمی میں ضم ہو جائیں گے میں نے اپنی اولاد اور قریبی رشتہ داروں کو بے دخل کرنا اس لیے مناسب سمجھا کہ عام پرستاروں کی اس تک رسائی آسانی سے ہو سکے میرے مشاہدے میں یہ تلخ حقیقت بارہا آئی ہے کہ خاندان کا کوئی فرد اس طرح کے نادر کتب خانے پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور دوسروں کو قریب بھٹکنے نہیں دیتا جس کے نتیجے میں دیمک علمی ذخیروں کا مقدر بن جاتی ہے۔'' (۶)

ڈاکٹر تقی عابدی کی متنوع علمی دلچسپیاں

ڈاکٹر تقی عابدی کی شخصیت علمی، ادبی اور تخلیقی جہات پر مشتمل ہے۔ موجودہ اردو زبان کی ترویج کے دعوے داروں میں جو چہرہ ہم آپ کو سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے وہ ڈاکٹر تقی عابدی کا ہے۔ زبان و ادب میں اضافے کے ساتھ ساتھ عقیدت کا جو اظہار تقی عابدی نے کیا ہے وہ کم ملتا ہے حافظ اور خسرو سے عقیدت کا اظہار نرالا نہیں ہے مگر ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے ان بلند قامت شعراء کی شاعری کو تنقیدی بصیرت کے آئینے میں جانچا ہے اور پرکھا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اردو اور فارسی کلاسیکی اور جدید شاعری کے رموز سے آگاہ ہیں اردو شاعری میں میر

،غالب ، انیس اور دبیر کے شاعرانہ مرتبے اور خصوصیت کے ساتھ علامہ اقبال کی شاعری اور شخصیت پر ایک محقق کی نظر سے خامہ فرسائی کرنا قابل ستائش ہے۔ اردو رسم الخط کی حفاظت اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق اردو ایک زندہ کتاب ہے جو مکمل توانائی کے ساتھ پھیلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس قدر کم عمری میں اتنی بڑی زبان بن جانے کا راز صرف یہی ہے کہ یہ دوسروں کے ساتھ لین دین کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لہٰذا اس تہذیبی ورثے کی حفاظت اور ترویج کو ذمہ داری سمجھ کر نباہ رہے ہیں سخن گوئی کے ساتھ ساتھ سخن شناسی کا سچا ذوق تقی عابدی کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ رثائی ادب کا مسیحا ڈاکٹر تقی عابدی کو جانا جاتا ہے۔ آپ نے اتنے کم وقت میں شعرائے رثائیات یعنی میر انیس، مرزا دبیر اور فرید لکھنوی پر انوکھی جہات سے قابل تحسین اور نا قابل فراموش کام کیا ہے۔ تجزیہ یادگارِ مرثیہ انیس میں میر انیس کے صرف ایک مرثیے ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' کو جس تحقیقی انداز سے ترتیب دی۔ وہ دنیائے ادب میں کسی شاہکار سے کم نہیں ہے۔ چہار سو میں ڈاکٹر عظیم امروہوی نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

> ''یہ ایک کتاب نہیں بلکہ نکات وضاحت و رموز بلاغت کا ایک سرچشمہ ہے محاسن لفظی ومعنوی کا ایک خزانہ ہے اردو مرثیہ نگاری کی تفہیم و تحسین کی ایک انسائیکلو پیڈیا ہے اور انیس شناسی وانیس فہمی کے باب میں ایک نادرہ کاری ہے۔'' (۷)

ڈاکٹر تقی عابدی نے ہر باب میں انیس کے اس شاہکار پر روشنی ڈالی ہے انیس کی قدرالکلامی اور معجز بیانی اس مرثیے میں اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ انیس نے اس مرثیے میں ۲۵ جانوروں کا تذکرہ مربوط خصوصیت کے ساتھ تو کیا ساتھ چیونٹی جیسی ذی روح کا حال بھی بیان کردیا۔

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

ڈاکٹر تقی عابدی نے میر انیس کے اس مرثیے پر خوب عرق ریزی کی ہے اس دقت طلب کام میں آپ نے میر انیس کے مرثیے کے اندر چھپی فصاحت و بلاغت تشبیہات مجاز مرسل، تمثیلات و محاورات عمدگی، سادگی، منظر نگاری غرض ہر صفت پر محنت صرف کی ہے اور بغور جائزہ لینے کے بعد

میر انیس کو وہ مقام مرثیہ میں عطا کیا ہے جس کے وہ حقدار تھے۔ رثائی ادب میں اگر میر انیس کو نکال دیا جائے تو اردو ادب نامکمل سا دکھائی دینے لگے گا۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب اور رثائی ادب میں میر انیس کے مرثیے کو شاندار شاہکار مانا جاسکتا ہے۔

رثائی ادب میں جس عظیم شخصیت پر ڈاکٹر تقی عابدی نے محنت شاقہ سے کام لیا ہے وہ مرزا دبیر ہیں۔ مرزا دبیر کے متعلق ڈاکٹر تقی عابدی کی سات کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ یہ اردو ادب میں سب سے زیادہ شعر کہنے والا عظیم شاعر ہے۔ دبیر نے سب سے زیادہ رباعیات لکھیں اردو لغت کا زیادہ سے زیادہ وسیع استعمال کیا کہ ڈاکٹر تقی عابدی کے مطابق کلام دبیر کو کالج اور یونیورسٹی کے نصاب کی حیثیت ہونی چاہیے۔ جب مولانا شبلی نعمانی نے میر انیس اور دبیر کا موازنہ کیا تو اس نے انیس کے مقابلے میں مرزا دبیر کی حق میں انصاف نہیں کیا۔ تقی عابدی لکھتے ہیں:

> ''افسوس موازنہ انیس و دبیر میں علامہ شبلی نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ دبیر کے فن حسب نسب کسب اور کلام پر بے رحمانہ حملے کیے گئے ہمیں دبیر کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ مرزا دبیر کے کلام میں میر انیس کا رنگ نظر آتا ہے لیکن میر انیس کے کلام میں دبیر کا پرتو بالکل نہیں۔'' (۸)

مصحف فارسی (مجموعہ فارسی کلام) مثنویات دبیر، مجتہد نظم مرزا دبیر، طالع مہر، سلکِ سلام دبیر، ابواب المصائب، رباعیات دبیر، مرزا دبیر پر تقی عابدی کی کتابیں مرزا دبیر کے ساتھ تقی عابدی کی علمی دلچسپی کو ظاہر کرتی ہیں۔ ابواب المصائب میں تقی عابدی نے مرزا دبیر کی زندگی کی عکاسی کرنے کے لیے زندگی نامہ کے عنوان سے ان کا احسن مرقع کھینچا ہے۔ مقدمہ بھی ساتھ ہی تحریر فرمایا ہے۔ تاکہ اگر قاری کو کسی مشکل کا سامنا ہو تو وہ الفاظ کی تشریح سے فائدہ اٹھا سکے۔ کتاب کا انتساب عاشق دبیر امیر کبیر راجہ میسور رام افتخار الدولہ کے نام کیا ہے۔ تقی عابدی اس شخصیت کے متعلق فرماتے ہیں:

> ''جو عشق محمد آل محمد میں ڈوب کر ابھرے تو کشتی اسلام میں نجات ملی۔
> جنہوں نے اپنی دولت سے عالی شان امام باڑہ بنوا کر عزاداری کو رونق بخشی جہاں رمضان کی شہادت کی شبوں میں دبیر مرثیہ خوانی کرتے تھے وہ آخر عمر کربلائے معلیٰ جا کر مجاور روضہ حسینؑ ہو گئے اور زندگی مجاورت ضریح اقدس

میں گذار کر خاک شفا میں پیوند ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے سجدہ گاہِ عالیشان پاک طینت بن گئے"۔(۹)

ابواب المصائب میں مرزا دبیر نے جو ایجادات مرثیے کی صنف میں پیش کی تھی ان کا ذکر بھی ملتا ہے ان موضوعات کے نقوش مرزا دبیر سے پہلے ملتے ہیں مگر مرزا دبیر وہ پہلی شخصیت تھے جنہوں نے ترتیب اور باضابطہ طور پر ان موضوعات کو احاطہ تحریر میں لانا ضروری خیال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے مرثیے کے مجددوں میں مرزا دبیر کو قرار دیا ہے۔ ابواب المصائب کے زندگی نامہ میں مرزا دبیر کی زندگی کا خاکہ کھینچا ہے۔ صفحہ نمبر ۱۳ سے ۳۳ تک دبیر کی زندگی پر مختلف مضامین ملتے ہیں جس میں ان کی تاریخ ولادت، جائے پیدائش خاندانی رشتوں جن میں دادا، والد، شریک حیات، اولاد، بھائی بہن، تعلیم و تربیت، اساتذہ، مذہب، شغل، ان کے لباس، غذا، اخلاق و کردار ان کی سیرت، قناعت، مہمان نوازی جیسے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اسی طرح شاعری کا آغاز مشق سخن پہلا اور آخری مرثیہ کو بھی شامل کتاب کیا گیا ہے۔ اساتذہ پر بحث کرتے ہوئے تقی عابدی نے ضمیر و دبیر کی رنجش دونوں میں صلح صفائی، شاگردان پڑھنے کا طریقہ، تصنیف، اصلاح کا طریقہ، ایجادات وغیرہ کے علاوہ کئی غیر دلچسپ اور معلوماتی حکایات کو بھی پوری تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ابواب المصائب کے مقدمے میں مرزا دبیر کی سوانح پر لکھی گئی پہلی کتاب "شمس الضحیٰ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مرزا دبیر پر لکھی گئی کتابوں کا بھی مقدمے میں ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں افضل حسین ثابت کی حیات دبیر، شاعر اعظم مرزا دبیر اور باقیات دبیر ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری، مرزا سلامت علی دبیر کے مصنف ڈاکٹر محمد زمان آزردہ اور "پیام عمل" کے مرزا دبیر نمبر میں ذاکر ڈاکٹر محمد حسین فاروقی کا مضمون "اردو ادب کی توسیع میں دبیر کا حصہ" اور کئی اقتباسات شامل ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے مصائب ابواب میں نثر کا موازنہ فسانہ عجائب کربل کتھا اور واعظ حسین کاشفی کی روضۃ الشہدا سے کیا ہے۔ تقابلی جائزہ کرتے ہوئے مرزا دبیر کی تحریر کی خصوصیات، سادگی اور صفائی کو بہت باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ مرزا دبیر پر کتابوں کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے رثائی ادب اور تقی عابدی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو چکے ہیں۔ مثنویات دبیر بھی اس سلسلے کی کڑی ہے۔ کتاب کی ابتداء موضوع کی مناسبت سے مثنوی کے عنوان سے کی گئی ہے۔ مثنوی

کی فنی ومعنوی اہمیت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مثنوی کی ہئیت اوزان و بحور محاسن ولوازم اور میعار نقد پر مختلف نقادوں کی آراء پر بحث کی گئی ہے اس کتاب میں تقی عابدی نے ان ناقدین اور محققین پر اظہار تاسف کیا ہے۔ جنھوں نے مثنویات دبیر کو طاق نسیاں کے سپرد کر دیا ہے۔ مولانا امداد امام اثر نے ''بے خبری'' میں مرزا دبیر کو سرے سے مثنوی نگار ماننے سے ہی انکار کر دیا ہے۔ اسی طرح دبستان دبیر سے تعلق رکھنے والے بیشتر محققین نے مرزا دبیر سے غفلت برتی ہے جس میں سید نظر الحسن فوق کی کتاب المیز ان میں مثنوی کا ذکر تک نہیں کیا۔ ڈاکٹر گیان چند ڈاکٹر اکبر حیدری ڈاکٹر سید سلیمان ڈاکٹر سید محمد عقیل نے دبیر کی مثنویوں کا ذکر صرف ایک دو جملوں میں کر دیا ہے۔ تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق مرزا دبیر نے کل آٹھ مثنویاں لکھی ہیں۔ ڈاکٹر کاظم علی خان نے دبیر کی تیسری مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ تقی عابدی نے اس کا پورا نام ''استاد سورہ الحمد وفضائل چہاردہ معصوم علیہ السلام'' بتایا ہے مرزا دبیر کی آٹھ مثنویاں مندرجہ ذیل ہیں

> ''احسن القصص، معراج نامہ یا ممتاز نامہ، اسناد سورہ الحمد فضائل چہاردہ معصومؑ، ولادت و وفات حضرت چہاردہ معصومؑ غیر مطبوعہ مثنوی، مثنوی شہادت امیر المومنین، مثنوی واقعہ شہادت حضرت علی اکبر، مثنوی عزائے حیدر کرار بہ غرہ ماہہ شوال کہ روز عید ست۔'' (۱۰)

مصحف فارسی مرزا دبیر کے فارسی کلام پر مشتمل کتاب ہے جس میں مرزا دبیر کی ۳۹ رباعیات، ۷ قطعات ۲ سلام ۳ مخمسات ۳ مسدسات کے علاوہ مرزا دبیر کے دو غیر مطبوعہ نثری رسائل اور ۴ مکتوب شامل ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے علمی دلچسپی کے پیش نظر پورے عہد کی تہذیبی صورت حال کو نئے سرے سے زندہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے رباعیات دبیر میں علم بیان اور اردو ادب کی اصطلاحات کی مثالیں بھی تلاش کر لی ہیں۔ ان کے مطابق دبیر کی رباعیات میں آسان اور عام فہم تشبیہات مکمل استعاراتی نظام کنایات اور مجاز مرسل کی مکمل چاشنی موجود ہے۔ علم بدیع کی عمدہ کاریگری کا رنگ نمایاں ہے۔ صنعت سیاق الاعداد، صنعت تاریخ گوئی، صنعت اعداد ایہاس، صنعت مذہب کلامی کو بھی دبیر نے اپنی رباعیات میں خوب برتا ہے یہی وجہ ہے کہ تقی عابدی نے دبیر کو اردو ادب کا سب سے بڑا رباعی گو قرار دیا ہے۔ تقی عابدی نے رباعیات کو حمدیہ، نعتیہ، منقبتی،

ذاتی، اخلاقی، سماجی، اعتقادی اور رثائی ادب میں تقسیم کردیا ہے رباعیات کے جدول میں تحریر کرتے ہیں۔

''دبیر اُردو کا وہ تنہا عظیم شاعر ہے جس نے اپنی رباعیات میں اتنے مضامین برتے ہیں کہ راقم نے ان مضامین سے جن کی تعداد سو سے زیادہ ہے ایک شجرہ اور جدول بنایا ہے تاکہ آسانی کے ساتھ دبیر کے مضامین کی بوقلمونی کا احساس ہوسکے۔'' (۱۱)

رباعیات دبیر مرزا دبیر کی ۱۳۰۰ سے زائد رباعیات پر مشتمل کتاب ہے۔ تقی عابدی کا چونکہ مرثیے سے ایک قلبی تعلق رہا ہے۔ واقعہ کربلا ان کے نزدیک عالمی سانحہ ہے۔ جس پر دل و دماغ آنسو بہاتے ہوئے نظر آتے ہیں تقی عابدی مرثیہ کی صنف میں مرزا دبیر کے علاوہ میر انیس سے بھی متاثر تھے۔ مرثیہ سے ان کا قلبی تعلق بھی تھا اور اس صنف سے علمی دلچسپی بھی یہی وجہ ہے کہ تقی عابدی نے میر انیس کے مرثیے کا بھی علمی نقطہ نظر سے گہرا مطالعہ کیا ہے ''یادگارِ انیس'' میں انیسؔ ان کے معروف مرثیہ ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' پر تحقیقی اور تنقیدی نقطہ نگاہ سے بحث کی ہے یہ کتاب ۸۲۵ صفحات پر مشتمل ہے 112x9 انچ کے سائز فارن آرٹ پیپر پر زرد زمین کشمیری پیپر ماشی کی طرح آراستہ ہے۔ ۳ کلو سے وزن زائد ہے۔ ہر بند کے سامنے ۳۲ سے ۴۰ سطروں کا تجزیہ لکھا گیا ہے اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر ۱۹۷ بند کے علاوہ ۴۵ صفحات پر مشتمل ڈاکٹر ڈیوڈ متھیوز (The Battle of Karbala) کے نام سے انگریزی ترجمہ بھی موجود ہے۔ تقی عابدی کی اس تصنیف کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے رثائی ادب میں اس زمانے کے طالب علموں پر بہت بڑا احسان کیا ہے کہ انیس جیسے شاہکار کو نہایت عالمانہ انداز میں متعارف کروایا ہے۔ میر انیس سے ناواقفیت اصل میں ادب کو نامکمل اور کھوکھلا کرنے کے مترادف ہوگا۔ اس کتاب کے عنوانات حیات میر انیس' میر انیس مشاہیر شعر و ادب کی نظر میں یادگار مرثیے کے متعلقات مرثیے کے منتخب اشعار، نمونہ جات مطبوعہ مراثی۔ اشخاص مرثیہ مرثیے پر اعتراضات، مرثیے کے تجزیاتی نمونے، مرثیے کے تجزیے کا طریقہ، یادگار مرثیے کی معجز بیانی، محاسن مرثیہ، فہرست کامل جدول بہ ترتیب شعر و بند مرثیہ، تجزیہ کامل یادگار مرثیہ کتابیات اور مرثیے کے ترجمے وغیرہ شامل ہیں۔ میر انیس کے حوالے سے اگر تقی عابدی کو انسانی کمپیوٹر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ تقی عابدی انہی علمی دلچسپی کے پیشِ نظر

تہذیب کی حفاظت اور روایت کے فروغ کے لیے جس طرح کوشاں ہیں وہ قابل تعریف کے ساتھ ساتھ قابل تقلید بھی ہے۔ دبیر اور انیس سے علمی دلچسپی کے ساتھ ساتھ تقی عابدی اقبالیات کے بہت بڑے قدردان کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اس سلسلے کی سب سے اہم اور انوکھی تصنیف چوں مرگ آید ہے یہ تقی عابدی کی عرق ریزی اور حق شناسی کا ایک نادر تحفہ ہے ان اقبالیات کے تشنہ طالب علموں کے لیے جو اقبالیات پر تحقیقی نگاہ سے کام کر رہے ہیں۔ تقی عابدی نے چوں مرگ آید اقبال کے ہی مصرعے سے ماخوذ کر کے عنوان کی شکل میں پیش کی ہے۔ یہ اعلیٰ پائے کی منفرد کتاب ہے۔ جس میں تقی عابدی نے اقبال کی حیات و موت کے درمیان تمام علالت و امراض پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سے پہلے کسی نے بھی اس موضوع پر باریک بینی سے توجہ نہ کی تھی۔ تقی عابدی نے بہت ہی دلچسپ انداز میں معلومات افزاء اور بصیرت افروز انداز میں اقبال سے منسلک بیماریوں کی تشخص کی اور اس دوران کن کن معالجین نے اقبال کی دیکھ بھال کی اور کن کن ادویات کو اقبال نے استعمال کیا اور کن سے افاقہ ہوا سب کو مستند خطوط کے حوالوں سے بیان کیا ہے اس کتاب میں طبی معلومات بدنی کیفیات روحانی اعتقادات کو بہت ہی خاص طریقے سے برتا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کی طب سے واقفیت، اقبال کے نظام اوقات معمولات، بیماری کی نفسیات اور خود اقبال کی ذہنی کیفیت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اقبال نے تمام عوارض کا مقابلہ جس ہمت اور استقلال کے ساتھ کیا تقی عابدی نے اس کو بھی جا بجا پیش کیا ہے۔

نشاں مرد مومن با تو گویم

چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

تقی عابدی کی جزئیات رسی، ادیبانہ اسلوب نگارش اور ان کی پیشہ ورانہ طبی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کمزور بینائی، دردِ گردہ جوڑوں کے درد، قلبی امراض، دمہ، معدے کی تبخیر، گلے کی بیماری، دانتوں کے مرض، ملیریا اور کم خوابی جیسی بیماریوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ خاص کر بھوپال میں برقی علاج پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ تقی عابدی نے نہایت ایمانداری سے حقائق، خطوں، کتابوں اور تذکروں سے اکٹھے کیے اور ان کو ترتیب دینے کا فریضہ نہایت ہی عرق ریزی سے سرانجام دیا۔ یہ کتاب تقی عابدی کی شبانہ روز محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اقبال پر دوسری مفصل کتاب اقبال کے

عرفانی زاویے تقی عابدی کی علمی دلچسپی کا شاہکار ہے۔ اس کتاب میں تقی عابدی نے اپنی تمام تر ادبی ذہانت کا لوہا منوایا ہے۔ اقبال کے تمام تر موضوعات کو اس کتاب میں جگہ دینے کی کوشش کی گی ہے۔ اہلِ بیت سے اقبال کی عقیدت ہو یا اکبر الہ آبادی، مہاراجہ کشن پرشاد جیسے دوستوں سے تعلق، استادوں کا ذکر ہو یا ٹیپو سلطان جیسے شیر کا تذکرہ۔ سب کو اس کتاب کا لازمی جزو مانا گیا ہے۔ قصیدہ بردہ شریف کے خالق علامہ ابو بوصیری کا تعارف بھی جامعیت سے پیش کیا گیا۔ مثنوی کو سورہ اخلاص کے تناظر میں تقی عابدی نے قدرے وضاحت سے پیش کیا ہے۔ اقبال کو آپؐ سے کس قدر والہانہ عشق تھا الگ موضوع کی حیثیت سے شامل کیا گیا ہے۔

زندہ رود کے مستند حوالوں کے ذریعے آفتاب اقبال اور اقبال کی ازدواجی زندگی کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ تصور زمان ومکاں کو نہایت ہی فصیح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مولانا گرامی اور داغ دہلوی کے متعلق بھی مواد ہمیں اس کتاب میں مل جاتا ہے شمس العلما مولوی میر حسن جیسے اقبال کے استاد کا ذکر کیوں نہ اس کتاب میں کیا جاتا۔ علامہ کیسے اقبال سے سر ہوئے ایک مکمل کہانی کے ساتھ ''تقی عابدی نے عرفانی زاویے'' میں شامل کیا ہے۔ مسئلہ فلسطین سے اقبال کو بہت دلچسپی تھی اسی لیے تقی عابدی نے اقبال کے جذبات کا اظہار مسئلہ فلسطین اور اقبال میں بہت ہی مدلل انداز میں کیا ہے اقبال پر تہمت شراب نوشی کے تدارک کے لیے تقی عابدی نے مستند حوالوں کے ذریعے عرفانی زوایے میں ثبوت پیش کیا ہے کہ اقبال ہرگز شراب نوش نہ تھے۔ غرض تقی عابدی نے باقی کتابوں میں اقبال کے متعلق مضامین تو شامل کرر کھے تھے مگر عرفانی زاویے خالص اقبال کے موضوع پر منفرد کتاب ہے جو تقی عابدی کی اقبال سے خالص ادبی اور علمی لگاؤ کو ظاہر کرنے کا بین ثبوت ہے۔ تقی عابدی کا ایک اور کارنامہ ''کائنات نجم'' علامہ نجم آفندی پر لکھی کتاب ہے۔ یہ اہل بیت کے شاعر ہیں ان پر کام تقی عابدی کی علمی ادبی تحقیقی کارنامہ گردانا جاسکتا ہے کائنات نجم دو جلدوں پر مشتمل ہے جلد اول میں سات اور جلد دوم میں بھی سات ابواب ہیں۔ تقی عابدی نے چہاردہ معصومین کی نسبت سے ۱۴ ابواب دونوں جلدوں میں شامل کیے ہیں۔ تقی عابدی نے اس کتاب کو واقعی کائنات نجم بنانے کی کوشش کی ہے۔ اوران کی تمام غزلوں رباعیات وقطعات، نعتوں، قصائد اور سلاموں کو یکجا کر دیا ہے۔ پہلی جلد میں تقی عابدی نے نجم آفندی کی شخصیت حالات زندگی ان کی تصاویر، خطوط اوران کی ڈائری کے

اوراق کو پیش کیا ہے۔ ان کا شجرہ نسب بھی اس جلد میں پیش کیا گیا ہے۔ نجم آفندی بھی اقبال کی طرح انقلابی شاعر تھے۔ جنھوں نے سرمایہ داری نظام مزدور اور کسان کے حقوق سلبی کے خلاف آواز اٹھائی سرمایہ داری کے خلاف اقبال کے اشعار تو ۱۹۲۰ء کے بعد نظر آتے ہیں مگر نجم آفندی نے یہ نکات اس سے پہلے پیش کر دیئے تھے۔

تقی عابدی جیسے تخلیق کار کا بنیادی مقصد اردو زبان وادب کا فروغ ہے۔ وہ اپنی غیر معمولی علمی وادبی دلچسپی کی وجہ سے تصنیف وتالیف کا کام انجام دیئے جا رہے ہیں۔ رموزِ شاعری اور عروسِ سخن جیسی کتابیں لکھ کر وہ زبان دانی کے فریضے کی ادائیگی کی۔ تقی عابدی نے ''انشاء اللہ خاں انشا'' لکھی۔ اس کتاب کو انشا فہمی کا سنگ میل کہا جاسکتا ہے۔ طب سے تعلق رکھنے والے پیشہ ورانہ ڈاکٹر نے اردو کے تحقیقی سرمائے پر گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد تحقیقی نقطہ نظر سے بصیرت آمیز بحث کی ہے۔ وہ معروضی انداز میں انشاء کے فن ان کے عہد اور اس وقت کے ماحول پر ادبی نقطہ نظر سے نگاہ ڈالتے ہیں، اور تشبیہات انشاء کے سلسلے میں ایک نیا راستہ قاری کو دکھاتے ہیں۔ انشاء کے متعلق ایک ایک معلومات مکمل جزئیات کے ساتھ قاری کے ذہن میں اتارتے ہیں۔ تقی عابدی کے مطابق انشاء خان انشاء نے اُردو زبان وادب میں بہت اضافہ کیا ہے۔ مگر تذکرہ نگاروں تنقید نگاروں اور محققوں نے ان پر دو گھسے پٹے جملے لکھ کر اردو شاعری پر ظلم کیا ہے۔ تقی عابدی نے انشاء پر تحقیقی مقالہ لکھ کر اپنی ایمانداری کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں پیدائش سے لے کر وفات اور آغاز شعر سے جملہ تصنیفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں انشاء کی نزاکتوں کا معروضی تجزیہ ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب انشاء جیسے انوکھے اور البیلے شاعر کے ساتھ مکمل انصاف برتنے کے لیے کافی ہے کیونکہ تقی عابدی نے اس کتاب میں ان تمام شعراء کا ذکر بھی کیا ہے۔ جنھوں نے عصری عصبیت سے کام لیتے ہوئے انشاء کے مقام کو عروج پر نہ جانے دیا۔ انشاء کو عربی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا عربی ردیفیں اور قافیے انشاء نے جس طرح نبھائی اور سمجھائی ہیں وہ کوئی اور نہیں نبھا اور سمجھا سکتا تھا۔ غالب شناسی کے حوالے سے ادبی دنیا میں تقی عابدی نے کلیات غالب فارسی ترتیب دی۔ یہ کتاب غالبیات کے طالب علم کے لیے کسی انسائیکلو پیڈیا سے کم نہیں ہے۔ یہ ۱۳۹۹ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب دو جلدوں میں ہے۔ تصنیف وتدوین کے علاوہ تقی عابدی نے تنقید وترجمہ بھی خود کیا ہے۔ یہ دو جلدوں

پر مشتمل فارسی کتاب کا انتساب ڈاکٹر تقی عابدی نے بیسویں صدی کے سب سے بڑے غالب شناس محسن اردو ماہر لسانیات امام فن عروض شاعر نقاد مترجم معلم اور مصنف شرح دیوان غالب (اُردو) سید علی حیدر نظم طباطبائی کے نام کیا ہے۔اس کتاب میں تقی عابدی نے غالب کی وفات سے چند روز پہلے کی تصویر بھی دی ہے۔آج تک کسی نے بھی اتنا ضخیم مقدمہ کلیات فارسی غالب پر نہیں لکھا۔ یہ نثر کا عمدہ شاہکار ہے یہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے۔ جو تخلیقی نثر میں عمدہ علمی و ادبی کاوش ہے۔

تقی عابدی نے اردو ادب میں جہاں گراں قدر اضافے کیے ہیں وہاں اس کے رسم الخط کے اصل ڈھانچے کو بھی بچانے کی کوشش کی ہے کیونکہ رسم الخط کسی بھی علاقے کا ورثہ ہے جو مکمل ایمانداری کے ساتھ اگلی نسل تک منتقل کرنا بیحد ضروری ہے۔ اردو رسم الخط اردو کی شان کے ساتھ ساتھ پہچان بھی ہے۔دونوں کا جسم وجلد کا رشتہ ہے یہ ہمارا ادبی، علمی، تہذیبی، مذہبی اور ثقافتی رشتہ ہے۔ اگر اردو کا رسم الخط بدلا جائے تو زبان کی ہیئت بھی بدل جائے گی۔عربی اور فارسی سے رشتہ ختم ہو جائے گا۔خاص کر شاعروں اور ادیبوں نے اپنے فن پاروں میں جو لفظی صنعت گری کا جوہر دکھایا ہے وہ نظر نہ آسکے گا۔اسی لیے تقی عابدی اردو رسم الخط کے محافظ دکھائی دیتے ہیں۔

تقی عابدی اور ترویج زبان واَدب

اردو کی نئی بستیوں میں اردو کا فروغ جاری ہے۔اردو ادب صرف اردوئے معلیٰ تک محدود نہیں بلکہ اردو محلہ میں رونق بازار ہے۔ دبستان دہلی لکھنو آگرہ حیدر آباد، لاہور، کراچی وغیرہ میں اردو کی نشوونما کے لیے جدید لسانی تجربات کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے۔اردو عالمی شہرت یافتہ زبان ہے۔ اسی اردو کے متعلق داغ نے بہت پہلے کہہ دیا تھا۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اردو زبان نے بہت ہی کم وقت میں اتنی شہرت حاصل کی ہے جو کسی بھی بین الاقوامی زبان کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہے۔اتنی شہرت کی وجہ اس زبان کا دوسری زبانوں سے لین دین ہے۔یہ زبان صرف آنکھوں کی زبان نہیں بلکہ کانوں کی زبان بن چکی ہے۔لہٰذا اردو رسم الخط اور اس کی تہذیب

کی حفاظت ہم سب کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری تحریر کرتے ہیں:

''اردو اور فارسی ادب کے باب میں تقی عابدی کا مطالعہ قابل رشک حد تک وسیع ہے۔ وہ اردو فارسی دونوں زبانوں کے مزاج شناس ان کے تاریخ و ثقافتی پس منظر سے واقف اور ان کے نمائندہ شعراء کے محاسن و کمالات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ سخن گوئی کے ساتھ ساتھ وہ سخن شناسی کا بھی سچا ذوق رکھتے ہیں۔ عروض و علم بیان کے رموز و نکات سے بھی بے بہرہ نہیں ہیں۔'' (۱۲)

ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق کینڈا میں اردو بولنے والوں کی تعداد ڈھائی لاکھ ہے۔ اگرچہ برطانیہ، امریکہ، کینڈا، آسٹریلیا، فرانس، ڈنمارک میں بھی اردو کی آبادی موجود ہے۔ ایک زمانہ تھا جب برطانیہ میں سب سے زیادہ اردو کی سرگرمیاں ہوتی تھی۔ اور لندن عالمی اردو کدہ بنا ہوا تھا۔ مگر اب وہاں اردو کی حیثیت قدرے کم ہوگئی ہے۔ برطانیہ میں بھی اردو کی تدریسی سرگرمیاں کم ہونے کی بناء پر اردو کی مرکزی حیثیت گھٹ گئی ہے۔ تقی عابدی اردو رسم الخط کو اردو کی جان آن بان شان اور پہچان سمجھتے ہیں۔ اردو کے بدن پر رسم الخط کی مثال جلد کی طرح ہے اور اگر جلد کو نوچ لیا جائے تو بدن زندہ نہیں رہ سکتا۔ اردو کی بنیادی تعلیم اردو ٹیکنالوجی سے جوڑنا اور اردو کے رسم الخط کی حفاظت اردو کے بقاء کی ضامن ہے۔ اردو مختلف زبانوں کے درمیان محبت بڑھانے کا ذریعہ ہے۔ اس کا مقابلہ پنجابی یا ہندی سے نہیں۔ پنجابی اردو کی ماں ہے اور ماں بیٹی میں محبت ہوتی ہے۔ مقابلہ نہیں۔ اردو کو سمجھا تو جا سکتا ہے مگر چار سو ملین افراد اردو زبان کو نہیں لکھ سکتے۔ اس کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اردو رسم الخط کی تشہیر کی جائے۔

تقی عابدی کی انیس شناسی

تقی عابدی میر انیس کو اردو ادب میں اولوالعزم مجتہد سمجھتے ہیں۔ تقی عابدی کو مرثیہ کی صنف سے دلی وابستگی ہے۔ اور وہ میر انیس کے مرثیے سے بیحد متاثر تھے۔ اسی تاثیر کی بنا پر تقی عابدی نے میر انیس کا علمی نقطہ نظر سے نہایت باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ اور میر انیس کی فکری اور فنی خوبیوں کو اجاگر کرنے

کے لیے تجزیہ یادگار انیس لکھی۔ اس کتاب میں تقی عابدی نے میر انیس کے مرثیے ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' پر بحث کی ہے۔ تقی عابدی نے تجزیاتی نقطہ نظر سے اس مرثیہ پر تحقیقی و تنقیدی لحاظ سے نگاہ ڈالی ہے۔ تقی عابدی مرثیے کی صنف کی ایک ایک رمز سے بخوبی آگاہ ہیں۔ لہٰذا انہوں نے میر انیس کے معروف مرثیہ کے ایک ایک حرف نقطہ اور پہلو پر بحث کی ہے یہ کتاب چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ زبیر صدیقی اپنے مقالے میں اس کتاب کی ساخت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''تقی عابدی کی کتاب ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' ۸۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب 112x9 انچ کے سائز میں پوری کتاب فارن آرٹ پیپر پر پانچ خوبصورت رنگوں اور زردز مین کشمیری پیپر ماشی کی طرح آراستہ پیراستہ ہے وزن ۳ کلو سے زائد ہے۔ کتاب سری نگر میں مرتب کی گئی ۲۰۰۲ء میں اکبر حیدری کشمیری کی نگرانی میں دلی سے اشاعت پذیر ہوئی۔ کتاب کے ہر بند کے سامنے ہر صفحے میں ۳۲ سے ۴۰ سطروں میں اس بند کا تجزیہ بڑی مہارت سے شامل ہے۔'' (۱۳)

اس کتاب کی ابتداء میں تقی عابدی نے میر انیس کے چند نوٹس دیے ہیں اور ساتھ ان کے مقبرے کی تصاویر بھی ہیں۔ ڈاکٹر نیر مسعود کا گرامی نامہ تاریخ کامل انیس و تجزیہ یادگار انیس (سید باقر زیدی امریکہ) سید عاشور کاظمی (لندن) حسین انجم (مدیر طلوع افکار کراچی) سید اقبال حسین کاظمی (مرثیہ فاؤنڈیشن کراچی) کی منظوم تقریظیں اور خود تقی عابدی کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ میر انیس کی زندگی کا نقشہ اس کتاب کے پہلے باب میں کھینچا گیا ہے۔ انیس کی زندگی کے مختلف گوشوں کو ذیلی عنوانات کے تحت بیان کرنے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔ میر انیس کی ولادت سے وفات تک تمام کوائف ذیلی عنوانات کے تحت بیان گئے ہیں۔ میر انیس کے علاوہ ان کے خاندان کے کوائف بھی مستند حوالوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے میر انیس کے فنی محاسن کا بھی تجزیہ کیا ہے یہاں الفاظ و معنی کا بحر ذخار موجود ہے۔ محاورات کی تعداد ۲۹۶ ہے۔ علم بیان کے محاسن کی تعداد ۲۵۱ ہے۔ علم بدیع کی صنعتوں کی تعداد ۱۲۸۲ یعنی کل محاسن اور صنعتوں کی مجموعی تعداد ۲۱۲۹ ہے۔ علم معانی و بیان علوم مشرقیہ میں نہایت سنجیدہ اور مشکل فن ہے۔ انیس کو تشبیہات کا بادشاہ اسی وجہ سے کہا جاتا

ہے۔تشبیہ حسی بصریٰ تشبہہ حسی، تشبہہ حسی، تشبیہہ مذوقی، تشبیہہ حسی لمسی وغیرہ کا استعمال جا بجا انیس نے اپنی فکر سخن میں کیا ہے۔ دیوان رُباعیات انیس کی تحقیق، تدوین، اور تشریح بھی تقی عابدی نے کی ہے۔ کلیات کی ترتیب کو تقی عابدی نے حمدیہ، نعتیہ، منقبتی اور اخلاقی رباعیات میں تقسیم کیا ہے۔ تقی عابدی نے میر انیس کی والدہ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

''میر انیس کی ماں بنگا بیگم تعلیم یافتہ خاتون تھیں جنہیں عربی فارسی اور اسلامیات میں اتنی دستگاہ حاصل تھی کہ میر انیس کی ابتدائی تعلیم انہی کے ذریعہ ہوئی وہ خود دار خوش اخلاق، متقی و پرہیزگار خاتون تھیں۔ اور ان کی سراسر زندگی دوسری عورتوں کے لیے نمونہ تھی۔ یہ میر انیس کی والدہ کی تعلیم و تربیت کا ہی اثر تھا کہ میر انیس کو اسلامی اقدار اور اپنے مذہبی عقیدے سے بے پناہ محبت تھی۔ یہ اسی مومنہ کی آغوش کا بھی اثر تھا کہ ان کے تینوں بیٹے کئی پوتے اور نواسے عظیم اردو ادب کا شاعر بن کر ظاہر ہوئے۔ اور اس صنف سخن کو جو اعلیٰ اقدار انسانی اور کردار نورانی سے بھرپور تھی سرپرستی کرکے اُردو شعر و ادب کو مالا مال کر دیا۔'' (۱۴)

میر انیس عربی زبان بخوبی جانتے تھے۔ وہ اپنے کلام میں عربی لفظ فقرے محاورے اور ترکیبیں بے تکلف اور برمحل استعمال کرتے تھے، عربی صرف ونحو عربی امثال اور اقوال کا ترجمہ بھی ان کے کلام میں ملتا ہے ان کے کلام میں عروض، منطق، فلسفہ طب، رمل وغیرہ کی اصطلاحیں بھی بکثرت ملتی ہیں۔ تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق میر انیس نے شاعری کی ابتداء گیارہ برس میں کر دی تھی۔ قدرتی رجحان غزل کی طرف تھا۔ پہلے پہل اپنا کلام والد خلیق اور چچا میر خلق کو دکھاتے تھے مگر بعد میں شیخ ناسخ کو استاد بنالیا۔ شیخ ناسخ نے ہی میر ببر علی کا تخلص حزیں سے بدل کر انیس کر دیا۔ تقی عابدی میر انیس کے انتخاب بحر اور مرثیوں کے مطلع کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے مرثیوں کے لیے چار بحروں کے اوزان مقرر کر رکھے تھے۔ اور ۶۷ سے زیادہ مرثیوں میں لفظ ''جب'' سے شروعات کی ہیں۔ تقی عابدی ایک جگہ میر انیس کی ایک رباعی کی یوں داد دیتے نظر آتے ہیں۔

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں
یا معدن کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تیری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

''میر انیس لفظوں کا بادشاہ ہے گلشن کی رعایت سے صبا، بلبل ،رنگ، پھول اور بو کی خوشبو کچھ اس طرح مصرعوں میں لپٹی ہوئی ہے کہ پڑھنے یا سننے والا بغیر محظوظ ہوئے نہیں رہ سکتا۔ یہاں مراعات النظیر بطور صنعت گری نہیں بلکہ کمال فن کی معجز بیانی کا نتیجہ ہے۔ پہلے کے تین مصرعوں میں مضمون کو ارتقا دے کر شاعر نے چوتھے مصرعہ کو آسمان پر پہنچا دیا اور فلسفہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود یعنی ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کا دفتر کھول دیا۔'' (۱۵)

میر انیس نے واقعہ کربلا کو امام مظلوم کی سیرت اور ان کے کردار کو شعر برائے گفتن کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ ان کی شخصیت کو تمام عالم کے لئے ایک مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ میر انیس کی اخلاقی رباعیات کے محاسن تحریر کرتے ہوئے تقی عابدی لکھتے ہیں:

''میر انیس کی درجنوں اخلاقی رباعیات میں عارضی حیات اور مستقل ممات کی تاکید ہے کہ یہ زندگی آنی فانی ہے اور دنیا مسافر خانہ ہے جہاں سے سفر کرنا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی پر جتنی عمدہ اور پُر اثر میر انیس کی رباعیاں ہیں شاید ہی کسی اُردو شاعر کے دیوان میں ہوں۔'' (٦.)

واقعہ کربلا کو میر انیس نے جس طرح رباعی میں بیان کیا اور اس کے بعد تقی عابدی کی تشریح کچھ یوں ہے۔

کیا مرتبہ سلطان حجازی کا ہے
کیا عزو شرف امام غازی کا ہے

سجدہ کا نشاں دیکھ کے سب کہتے ہیں

نیزے پہ یہ سر کسی غازی کا ہے

اب ایک دوسرا مقام انیس کی رباعی میں ملاحظہ ہو۔

''کہنا یہ مقصود ہے کہ بعد شہادت جب سر مبارک کو نیزے پر بلند کیا گیا تو اس کا اثر کچھ اور ہی نمایاں ہوا افواج یزید کا مقصد تو یہ ہوگا کہ امام عالی مقام کا سر دنیا کو خوف زدہ کر دے گا کہ یزید کی طاقت بھی کتنی بڑی طاقت ہے اور لوگ جمہور اطاعت ہو جائیں گے۔ لیکن ہوا کچھ اور ہی دیکھنے والے چیخ اُٹھے کہ کس صاحب کرامت کا سر ہے جو شہید بھی ہے اور غازی بھی اور نمازی بھی'' (۱۷)

میر انیس کا بہت مشہور شعر ہے جو میر انیس کو استاد فن سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں

اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

انیسؔ اس فن میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ میر انیس کا کمالِ فن یہ تھا کہ وہ ہر رنگ کے مضمون اُسی رنگ ڈھنگ کے الفاظ سے باندھے جو اس کے لیے مخصوص تھا۔ اسی لیے میر انیس کو محاوروں کا بادشاہ اور لفظوں کا شہنشاہ کہا جاتا ہے۔ وہ مصرعوں میں لفظوں کو نگینہ کی طرح جڑ دیتے تھے۔ میر انیس کا سارا کلام مرثیوں، سلاموں اور رباعیوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ تینوں صنفِ ادب اخلاقیات کا عمدہ نمونہ ہیں۔ غرض اس کو حسنِ یوسف کہا جاسکتا ہے جس کو مصر کے بازار ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر بازار میں پیش کیا جانا چاہیے۔ تقی عابدی تحریر کرتے ہیں۔

''میر انیس کا موضوع فلسفہ شہادت کربلا، اولوالعزم خانوادۂ رسالتؐ کے اخلاق و کردار اور ایثار سے تازگی اور نمود حاصل کرتا ہے۔ جہاں حق پرستی، سچائی رحم، عدل، تواضع، استغنا توکل، عزت نفس، حریت کے ساتھ ندامت تکبر، غرور خود پرستی سے کنارہ کشی کی تعلیم بالواسطہ یا بلاواسطہ دی جاتی ہے۔ میر انیس کے اخلاق سازی کا ہنر مرثیوں سے زیادہ رباعیوں میں ظاہر

ہوتا ہے۔ اس لیے میر صاحب کی بہت سی اخلاقی رباعیات زبان زد عام ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی حرص، ریاکاری دوروزہ زندگی پھر پیری اور موت ایسے مضامین ہیں جن پر انیس کی رباعیات اُردو شاعری کی گراں قدر میراث سمجھی جاتی ہے۔''

نادر اور جدید تراکیب اور اضافات الفاظ کا ذکر کرتے ہوئے تقی عابدی تحریر کرتے ہیں

''بندِ اجل، حفظ جوانی، بابِ خیبر، فرط بکا، چاہ دنیا، نخل خاکساری، رفیق تربت، لطف سینہ صافی، سیر التاثیر راہِ رضا، چراغ دودماں، کربلائی تسبیح حلال مہمات، عزہ جاہ ذاکر مخزن علوم دنیوی، خالق ذو لفضل وکرم، فکرنان داندوہ لباس۔ سدِ رمق ساغر استغناء دست مژدہ، مشک ختن نظم ''فاقہ کشائے سخن، مردم آبی، قفلِ ابجد، سرمہ سلیمانی، فرورِ خاکساری، مجیب الدعوات میوۂ نخل قد انساں'' (۱۹)

شبلی نعمانی کے موازنہ انیس و دبیر پر تبصرہ کرتے ہوئے تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

''اس کی طرح کاوشیں شبلی نعمانی نے بھی دبیر کے حق میں کیں جس کو سخن فہم سخن شناس اور سخن داں حضرات بھی بھلا نہیں سکتے۔ یہ غلط نمونہ برادری، غلط انتساب اور غلط نتیجہ گیری جس کا مقصد کسی تخلیق کار کی عمر بھر کی کمائی کو لوٹنا اور اس کی شخصیت اور فن کی ملکیت کا برباد کرنا نہیں؟ کیا یہی ادبی دہشت گردی نہیں؟ ہم میں کم از کم اتنی تو عادلانہ ہمت ہونی چاہیے کہ اگر ہم مصلحتاً مظلوم اور حقدار کی حق بیانی نہ کر سکیں تو ظالم کی بھی طرف داری نہ کریں انیس نے کہا تھا:

؎ سب کچھ ہے اس دنیا میں پر انصاف نہیں ہے (۲۰)

تقی عابدی نے میر انیس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے مشاہیر شعر و ادب کے بیانات کو بھی رباعیات انیس میں جگہ دی ہے۔ یہ میر انیس کے قدردان اس عظیم شاعر کی قدردانی کرتے دکھائی دیتے ہیں مولانا الطاف حسین حالی کا بیان ملاحظہ ہو:

''الفاظ کو خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال کرنے کو اگر معیار کمال قرار دیا جائے تو بھی میر انیس کو اردو شعراء میں سب سے برتر ماننا پڑے گا۔ میر انیس کے ہر لفظ اور ہر محاورہ کے آگے اہل زبان کو سر جھکانا پڑتا ہے۔'' (۲۱)

اگر انیس چوتھی صدی ہجری میں ایران میں پیدا ہوتے اور اسی سوسائٹی میں پروان چڑھتے جس میں فردوسی پلا بڑھا تھا وہ ہرگز فردوسی سے پیچھے نہ رہتے۔

شبلی نعمانی نے میر انیس کا تجزیہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

''میر انیس کے کمال شاعری کا بڑا جوہر یہ ہے کہ باوجود اس کے انہوں نے اردو شعرا میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیے اور سیکڑوں مختلف واقعات بیان کرنے کی وجہ سے ہر قسم ہر درجہ کے الفاظ ان کو استعمال کرنے پڑے۔ تاہم ان کے کلام میں غیر فصیح الفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان کے کلام میں انسانی جذبات یا احساسات ایسے ہیں جہاں آ کر انیس کا اصلی جوہر کھلتا ہے اور یہیں ان کی شاعری کی حد ان کے ہم عصروں سے جدا ہوتی ہے میر انیس کا کلام شاعری کی تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے۔ ان کے کلام میں شاعری کی جس قدر اصناف پائی جاتی ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائی جائیں''۔ (۲۲)

تجزیہ یادگار مرثیہ جب ''قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' میں میر انیس کا تعارف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''اردو شعروادب کے بعض تذکروں میں خدائے سخن کا عنوان دو عظیم شاعروں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ میر تقی میر اور میر انیس۔ میر تقی میر نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے غزل کو منتخب کیا اور میر انیس نے مرثیہ کا انتخاب کیا۔ جرمن کے مشہور شاعر ''گوئٹے نے کہا تھا'' ادب میں کوئی صنف اس وقت تک عظیم نہیں بن سکتی جب تک کہ اس کا موضوع عظیم نہ ہو۔ میر انیس نے جس صنف شاعری کے مرثیہ کا انتخاب کیا اس کا موضوع عظیم

ترین موضوع یعنی شہادت امام حسینؓ تھا''(۲۳)

دیوان رباعیات انیس میں تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

''میر انیس نے تصوف اور واقعہ کربلا کو برائے شعر گفتن کے طور پر نہیں برتا بلکہ امام مظلوم کی سیرت ان کے کردار انسانی اقدار کو اپنی شخصیت کا جزو بنالیا اور یہ وہی جوہر تھا جس کی وجہ سے انیس کے اشعار سے صداقت کی روشنی پھیلتی نظر آتی ہے اور ایسی سعادت بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے۔ میر انیس عرفان کے اعلیٰ درجوں پر فائز تھے۔ وہ درویش وقلندر صفت انسان تھے۔'' (۲۴)

اردو شعروادب کے عظیم مشاہیر نے میر انیس کی قدردانی میں الفاظ کا نذرانہ بھی پیش کیا ہے۔ تقی عابدی نے دیوان رباعیات انیس میں مشاہیر کی قدردانی کا آغاز مرزا غالب کے الفاظ سے کیا ہے۔

''اردو زبان نے انیس اور دبیر سے بہتر مرثیہ گو نہیں پیدا کیے۔ ایسے مرثیہ گو پیدا ہوئے ہیں نہ آئندہ ہوں گے۔ انیس کا مرثیہ نہایت بلند ہے۔'' (۲۵)

تقی عابدی کی فیض فہمی/فیض شناسی

ڈاکٹر تقی عابدی ہمارے عہد کے ایک ایسے مصنف ومولف ہیں جن کے مطالعہ فیض نے اہل علم کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ فیض کے حوالے سے فیض شناسی ان کا اہم کارنامہ ہے۔ ان کا مقصد فیض کی شخصی اور ادبی زندگی کے نئے گوشے روشن کرنا ہے۔ یوں تو اردو ادب کی تاریخ میں کئی فیض نمبر مختلف رسائل نے پیش کئے۔ ساتھ ہی آج تک کئی گراں مایہ کتب بھی منظر عام پر آئی ہیں۔ جن کے ذریعہ فیض کی شخصیت اور فکروفن کا محاسبہ کیا گیا ہے۔ اور ڈاکٹر عابدی نے بھی مطالعہ فیض کو اہمیت واولیت بخشی۔ فیض پر دستیاب تمام کتب اور مضامین کا باریکی سے مسلسل اور انتھک مطالعہ کیا۔ فیض سے دلی تعلق ورغبت نے ان کو عزم وحوصلہ فراہم کیا۔ دنیائے ادب میں اکثر ایسے افراد پیدا ہوتے رہے ہیں جن کی جرأت مندانہ کاوشیں اچھوتے پہلوؤں کو پیش کرنے میں کامیاب ہوئی

ہیں اسی حوالے سے ڈاکٹر عابدی کا نام ''فیضیات'' میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ تقی عابدی نے فیض پر تحقیق اور تنقید میں نئے نئے اور اچھوتے پہلو دریافت کیے ہیں تقی عابدی نے ۱۲۰ اہل علم کے مقالوں ساتھ اپنے (۵۲) مقالوں کو ضخیم کتاب کی صورت میں پیش کیا جو دنیائے ادب میں فیض فہمی کے نام سے منظر عام پر آچکی ہے۔ یہ کتاب مستند دستاویز ہے۔ جس میں فیض فہمی کی تمام صورتیں موجود ہیں۔ یہ بھاری بھرکم کتاب متعدد اہل قلم کی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ جو فیض کے محبین اور محققین کے لیے بے حد سود مند ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی ذہانت علمیت اور باریک بینی نے فیض سے متعلق کئی نئے تحقیقی پہلو پیش کیے ہیں۔ جو دنیائے ادب میں فیض شناسی کے نام سے آج ہمارے سامنے ہیں۔ اس میں فیض کی شخصیت سے متعلق کچھ اہم مضامین ہیں جیسے ''فیض کا عقیدہ'' فیض اور بادہ و ساغر فیض کی صحت اور بیماریاں اور فیض نے کن کتابوں کا مطالعہ کیا وغیرہ۔ فکر و فن پر روشنی ڈالنے کے لیے اس کتاب میں فیض کی شاعری فیض کی غزل کا مقام کلام فیض عربی و فارسی الفاظ کا گلدستہ، فیض کی نظم کی وسعتیں فیض تنقید و تحقیق میں اچھی مثالیں ہیں۔ تقی عابدی نے پوری عالمی سعی کے ساتھ فیض کی شخصیت و فن کا احاطہ کیا ہے اور اپنے مطالعہ کی روشنی میں کئی اچھوت اور تشنہ پہلوؤں کو فیض کی ذات میں جوڑا ہے۔ فیض شناسی کے دوسرے مضامین مثلاً فیض بنام افتخار عارف، فیض اور مصطفیٰ زیدی قصہ سازش اغیار کہوں نہ کہوں، فیض کی تقریظیں، فیض کا ادبی مناظرہ بعنوان پریم چند، فیض کا مرثیہ امام اے بسا آرزو کہ خاک شد، فیض اور ایرانی انقلاب جو تمہارا میرا رشتہ ہے۔ فیض سے متعلق کچھ نئے گوشے روشن کرتے ہیں، متذکرہ مضامین کے علاوہ کئی اور چھوٹے بڑے مضامین ہیں جن کا الگ الگ ذکر کرنا محال ہے فیض کے تنقیدی نظریات کو اختصار کا جامہ پہنانے کے لیے تقی عابدی نے ''فیض کے ۲۷ نشتر'' لکھتے ہیں۔ یہ فیض کے پیش بہا تنقیدی نظریات ''میزان'' سے اخذ ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض سے متعلقہ تمام کتابوں، تقریظوں، تحریروں، تقریروں اور انٹرویوز سے فیض شناسی کی راہ ہموار کی ہے۔ فیض کے ریزہ ریزہ معلومات کو ذہن میں رکھ کر مواد جمع کیا۔ تحقیق و تنقید کی راہ تقی عابدی نے مکمل عرق ریزی سے طے کی ہے۔ فیض شناسی ڈاکٹر تقی عابدی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جو ان کے مصمم ارادے اور پرلگن حوصلے کی زندہ مثال ہے۔ یہ کتاب فیض شناسی ہے جو ان کے گہرے مطالعے کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ یہ کتاب بھی فیض فہمی کی طرح ڈاکٹر تقی عابدی کے

ذوق مطالعہ کی ترجمان ہے۔تقی عابدی نے اس کتاب میں اپنے مختصر وطویل مضامین شامل کیے ہیں۔۔یہ مضامین تنقید، تحقیق، تبصرہ اور تجزیہ کی شکل میں ہیں جو مفید ارشادات ونظریات کے حامل ہیں۔اور فیض کے سفرِحیات اور فکروفن کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔انہوں نے فیض کے مختلف شخصی اور ادبی پہلوؤں کے بکھرے ہوئے سرمایہ ادب کو بڑی جانفشانی اور خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔یقیناً یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔تقی عابدی کے مضامین میں اہم انٹرویوز بھی شامل ہیں جس میں ۲۸ اشخاص نے فیض سے ۴۵۰ سوالات کیے تھے۔ان انٹرویوز کے نتیجے میں فیض کی پوری زندگی شخصیت اور فن یوں شفاف دکھائی دیتے ہیں کہ انہیں نہ صرف نقوشِ فیض کہا جاسکتا ہے بلکہ اس کے ہر نقش پر سیر حاصل مضامین لکھے جاسکتے ہیں۔فیض شناسی میں تقی عابدی نے فیض کا نام فیض احمد خان لکھا ہے اور پیدائش ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء لکھی ہے۔وہ فیض شناسی میں فیض کی تاریخ پیدائش کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

> ''پیدائش ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء ہے۔۔فیض ایک نامہ مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۶۵ء میں اپنی تاریخ پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں''تاریخ پیدائش سکول کے کاغذات میں ۷ جنوری ۱۹۱۱ء اور کہیں ۷ جنوری ۱۹۱۲ء درج ہے۔ میں نے حال ہی میں ایک دوست سے فرمائش کی تھی کہ وہ سیالکوٹ کے دفتر بلدیہ سے پیدائش کے اندراجات ریکارڈ دیکھ کر صحیح تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کریں ان کی تحقیق کے مطابق بلدیہ کے کاغذات میں ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء تاریخ پیدائش درج ہے۔''(۲۶)

فیض کی قیدِ تنہائی کا ذکر کرتے ہوئے تقی عابدی فیض شناسی میں تحریر کرتے ہیں

> ''فیض نے ۹ مارچ ۱۹۵۱ء سے ۱۶ اپریل ۱۹۵۵ء تک لیاقت علی خان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں چار سال ایک ماہ اور گیارہ دِن کی قید کاٹی یہ سازش راولپنڈی سازش مقدمہ کے نام سے مشہور ہوئی پہلے تین مہینے قید تنہائی کی سزا ہوئی جس میں حتیٰ انہیں اپنے بیوی بچوں سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔انہیں قلم اور کاغذ بھی استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔فیض کی بہت سی

نظمیں جو" زندان نامہ" میں ہیں اسی قید کے زمانے میں اُنہوں نے منٹگمری سنٹرل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کے دوران لکھیں۔" (۲۷)

مشاہیر شعر و ادب کا ذکر کرتے ہوئے تقی عابدی نے آغا ناصر سے آغاز کیا اور آل احمد سرور، ابرہیم جلیس، ابواللیث صدیقی احتشام حسین، احمد ندیم قاسمی، افتخار عارف، انتظار حسین، جمیل جالبی، جوش ملیح آبادی، خلیق انجم، سجاد ظہیر سجاد، باقر رضوی، شان الحق حقی، شورش کاشمیری، عابد علی عابد، ظہیر صدیقی، عبادت بریلوی، عزیز احمد، فراق گورکھ پوری، فتح محمد ملک، قدرت اللہ شہاب، قراۃ العین حیدر گیان چند، گوپی چند نارنگ، مجنوں گورکھ پوری، ن۔م۔راشد، مرزا ادیب، یوسف حسین خاں اور بہت سے مشاہیر کی آراہ درج کی ہیں۔ فیض شناسی میں تقی عابدی نے فیض کی جدول تصانیف دی ہے اس کے علاوہ صادقین کے ہاتھ سے بنی ہوئی فیض کی تصاویر بھی دی گئی ہیں تقی عابدی فیض کے متعلق فیض شناسی میں لکھتے ہیں:

"فیض کا ایک مخصوص لب ولہجہ ہے۔ اس میں ایک بزم آور کیفیت ہے سیاسی اعتبار سے وہ مارکسی نظریات وخیالات کے ہم نوا ہیں۔ اور ان کی شاعری پر اس کی گہری چھاپ ہے۔ لیکن انقلابی گھن گرج یا نعرے بازی اُن کے کلام میں سنائی نہیں دیتی اُن کے نزدیک سرمایہ ومحنت کے درمیان ایک مستقل کشمکش جاری ہے اس میں عوام کی جانب سے حصہ لینا ہر انسان کا فرض ہے۔" (۲۸)

فیض کی ڈکشن پر بات کرتے ہوئے تقی عابدی تحریر کرتے ہیں۔

"جہاں تک فیض کے ڈکشن کا تعلق ہے۔ وہ غالب اور اقبال کے ڈکشن کی توسیع ہے۔ فیض کی لفظیات کلاسیک لفظیات ہے انہوں نے اپنے اظہار کے لیے نئے الفاظ کا اضافہ نہیں کیا بلکہ نئے اظہار پیرائے وضع کیے۔ سیکڑوں ہزاروں نئی ترکیبوں سے ابلاغ کے راستے روشن کیے ہم نے ایک علیٰحدہ مضمون میں جدید نادر ترکیبوں پر گفتگو کی ہے۔" (۲۹)

فیض نے اپنے شعری مجموعوں میں فارسی اور اُردو کے اساتذہ نظامی، حافظ، عُرفی، میر، سودا

اور ذوق وغیرہ کے ایک دو منقولہ اشعار بھی لکھے ہیں لیکن سب سے زیادہ غالب کے اشعار تضمین کیے ہیں۔ غالب اور فیض میں مماثلت درد کے رشتے کی ہے۔ یعنی غالب اور فیض دونوں غم جاناں اور غم دوراں کے شہید ہیں۔

تقی عابدی تحریر کرتے ہیں

''فیض کی نظموں میں بھی قادرالکلامی ہر مصرع سے روشن ہے۔ وہ ن۔م۔ راشد کی طرح بے دریغ عربی اور فارسی الفاظ اور قدیم و جدید ترکیبات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انہیں نرم و سلیس روزمرّہ کے الفاظ ڈھونڈنے کی عادت نہیں ان کو صرف خیال کو خنجر بنا کر دل و جگر میں اتارنے کی ہوس ہے وہ ایک نصب العین، ایک رجائی فکر، ایک آدرش رکھتے ہیں جس میں اُن کا شعری امتیاز اور فکری اعتماد شامل ہے۔'' (۳۰)

فیض کے فن کا کمال ان کا اختصار ہے۔ وہ غالب اور اقبال کی طرح فارسی لفظوں سے جہاں چاہیں استفادہ کرتے ہیں انہوں نے کم لفظوں میں کثیر معنی پیش کیے ہیں فیض اور اقبال کے رشتے پر بحث کرتے ہوئے تقی عابدی تحریر کرتے ہیں

''فیض اقبال کی بڑی قدر کرتے ہیں ایک انٹرویو میں کہتے ہیں'' جہاں تک شاعری میں سنسی بیلٹی زبان اور اس کی موسیقیت کا تعلق ہے ہم تو اُن کی خاکِ پا بھی نہیں علامہ بہت بڑے شاعر ہیں۔ اگر وہ اشتراکیت کے معاملے میں ذرا سنجیدہ ہو جاتے تو ہمارا کہیں ٹھکانہ نہ ہوتا۔'' (۳۱)

تقی عابدی اور مطالعات غالب

غالب ایک عظیم شاعر تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے مطابق غالب شناسی غالب کے فارسی کلام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس سے پہلے غالب کی شہرت و شناخت کا محور ان کا دیوان غالب اردو تھا ڈاکٹر تقی عابدی نے غالب اکیڈمی دہلی کی خواہش پر ''کلیات غالب فارسی'' مرتب کی ہے۔ یہ ۱۳۹۴ مقالہ ۱۱۳۳۷ اشعار پر مشتمل ضخیم کتاب ہے۔ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ڈاکٹر عابدی کا تحریر کردہ مقدمہ اس

کتاب کا حصہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب اور اقبال کا فارسی کلام ان کے اردو کلام سے زیادہ بلند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے خود اپنے اردو کلام کے کئی اشعار مسترد کر دیئے تھے۔ غالب کی فارسی شاعری ایک نادر شاہکار ہے غالب کو خود بھی فارسی شاعری پر فخر حاصل تھا۔ زبان دانی کے معاملے میں ایرانی شعراء سے متاثر تھے۔ مگر فکری جہت ان کی اپنی تھی۔ نعتیہ شاعری میں مثنوی ابر گہر بار میں شامل معراج نامہ ۱۲۸۱ اشعار پر مشتمل ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ بلاشبہ کلیات غالب فارسی غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے غالب پر یہ کتاب ایشائی ممالک کے درمیان جن میں فارسی پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔ ادبی ثقافتی اور تہذیبی روابط کو مزید تقویت دے سکتی ہے۔ کلیات غالب فارسی دو جلدوں پر مشتمل ہے اس کتاب کا انتساب تقی عابدی بیسویں صدی کے سب سے بڑی غالب شناس محسن اردو، ماہر لسانیات امام فن عروض شاعر، نقاد، مترجم، معلم اور مصنف شرح دیوان غالب (اردو) سید علی حیدر نظم طباطبائی کے نام کیا ہے۔ تقی عابدی کلیات غالب فارسی میں غالب کی فارسی شاعری کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

> ''غالب نے اپنی غزلوں میں قصیدوں رقطعوں اور مثنویوں میں فارسی شعراء کا ذکر بڑے آب وتاب سے کیا ہے چنانچہ ایک اندازے کے مطابق غالب نے قصیدوں میں (۱۳۳) سے زیادہ باران شعروں کا ذکر کیا جن میں ۲۹ سے زیادہ بار صرف قصیدوں میں یہ ذکر ملتا ہے۔ قصیدوں میں عرفی (۷) خاقانی اور نظامی ۵، ۵ بار انوری، سعدی، سلمان طالب نظیری ۲، ۲ بار اور خسرو حافظ، کلیم زلالی، درد، سودا اور میر وغیرہ بھی نظر آتے ہیں۔ غالب کی فارسی غزلوں جن کی تعداد ۲۳۴ ہے۔ (۵۳) سے زیادہ فارسی شاعروں کا تذکرہ ہے جن میں ظہوری ۱۲ بار، نظیری ۹ بار، عرفی اور حزیں ۵، ۵ بار حسرتی ۴ بار، حافظ ۳ بار، صائب ۲ بار اور باقی شعراء اور صہبائی کے نام بھی نظر آتے ہیں۔'' (۳۲)

تقی عابدی نے کلیات غالب فارسی کو حمد، مرثیہ، نعت، سلام، مناجات، رباعیات، نوحہ قصیدہ، فاتحہ اور مثنویات کے ابواب میں تقسیم کر دیا ہے تا کہ غالب کی فکر کو قاری اچھی طرح سمجھ سکے۔ تقی

عابدی نے کئی مقامات پر فارسی کلام کا ترجمہ خود کیا مگر جہاں جہاں مشاہیر اور متقدمین کے معیاری تراجم میسر آئے ہیں ان سے بھی مدد لے کر کلام کو مزید خوبصورت بنا دیا ہے۔ مقالہ نگار زبیر صدیقی تحریر کرتے ہیں۔

> ''غالب کی شخصیت اور ان کے کلام سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کو ہر لحاظ سے باقی رکھتے تھے۔ انہیں عام تقلید سے نفرت تھی عدم تقلید اور اجتہاد کی طرف جھکاؤ نے انہیں اردو اور فارسی شاعری میں روش سے کنارہ کشی پر مجبور کیا اور یہی نہیں بلکہ اپنا تخلص اسد سے غالب کرلیا۔'' (۲۳)

تقی عابدی نے کلیات غالب فارسی میں دو فارسی حمدیں شامل کی ہیں۔ ایک حمد جو فارسی حمد باری کے عنوان پر نظر آتی ہے۔ اس حمد میں باون اشعار ہیں۔ غالب نے تخلیق عالم کی خوبصورت منظر نگاری اور مشاہدہ آفاق پر گفتگو کی ہے۔ دوسری فارسی حمد (۱۱۴) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں بادہ وساغر کے بغیر مشاہدہ حق کی گفتگو مدلل انداز میں پیش کی گئی ہے۔ مشاہدہ عالم اور مشاہدہ آدم کا تجربہ اور تجزیہ اس حمد کا موضوع ہے۔ فارسی کلام میں دو فاتحین بھی شامل ہیں زبیر صدیقی تحریر کرتے ہیں۔

> ''دونوں فاتحہ میں غالب نے چودہ معصومین کی مدح سرائی کرنے کے بعد شہیدان کربلا بالخصوص حضرت عباس کی مداحی بڑے اہتمام اور التزام سے کی ہے۔ غالب عاشق حضرت عباس ہیں اس لیے ان کا ایک پورا قصیدہ حضرت عباس کی شان میں موجود ہے۔'' (۲۴)

فارسی دیوان میں نو اشعار پر مشتمل ایک نعتیہ غزل بھی ہے۔ منقبتی اشعار میں غضب کا جوش نظر آتا ہے۔ نوحوں کی تعداد ۵ ہے غالب نے ان نوحوں میں شہدائے کربلا بالخصوص امام حسین حضرت عباس اور اولاد حضرت علی کو مرکزیت دی ہے۔ ۱۳۱ سے زیادہ قطعات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ قطعات میں اشعار کی تعداد کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ ۳۲ ہے۔ ان قطعات کا موضوع غم دوراں، غم جاناں، تصوف، عروض اور لسانیات ہیں۔ قصائد کی تعداد ۱۷ اور اشعار کی تعداد ۳۹۱ ہے۔

حواشی

۱۔ چہارسو، جلد۱۸، شمارہ مئی۔ جون ۲۰۰۹ء، راولپنڈی فیض اسلام پرنٹنگ پریس، ص ۱۶
۲۔ ایضاً ، ص ۱۷
۳۔ ایضاً ، ص ۱۷
۴۔ ایضاً ، ص ۱۷
۵۔ ایضاً ، ص ۲۲
۶۔ ایضاً ، ص ۲۲
۷۔ ایضاً ، ص ۲۵
۸۔ ایضاً ، ص ۱۹
۹۔ ایضاً ، ص ۲۶
۱۰ ایضاً ، ص ۲۳
۱۱ ایضاً ، ص ۴۶
۱۲ ایضاً ، ص ۲۳
۱۳۔ زبیر صدیقی، مقالہ، ڈاکٹر سید تقی عابدی (کراچی جامعہ ۲۰۰۹ء) ، ص ۱۲۳
۱۴۔ تقی عابدی، ڈاکٹر، دیوان رباعیات انیس (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز ۲۰۱۴ء)، ص ۴۲
۱۵۔ ایضاً ، ص ۱۲
۱۶۔ ایضاً ، ص ۱۱۳
۱۷۔ ایضاً ، ص ۱۱۵
۱۸۔ ایضاً ، ص ۱۲۸
۱۹۔ ایضاً ، ص ۱۵۷
۲۰۔ ایضاً ، ص ۱۷۷
۲۱۔ ایضاً ، ص ۱۸۱
۲۲۔ ایضاً ، ص ۱۸۴
۲۳۔ تقی عابدی ، سید ، ڈاکٹر ، یادگار مرثیہ (دہلی: دریا گنج ۲۰۰۲ء) ، ص ۱۸

۲۴۔ تقی عابدی، ڈاکٹر، دیوان رباعیات انیس (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز ۲۰۱۴ء)، ص ۱۱۱

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۷۹

۲۶۔ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، فیض شناسی (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز ۲۰۱۴ء)، ص ۱۵

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۹

۲۸۔ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، فیض فہمی (لاہور: ملی میڈیا افیئرز ۲۰۱۱ء)، ص ۴۵۶

۲۹۔ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، فیض شناسی (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز ۲۰۱۴ء)، ص ۸۰

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۳۲۔ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، کلیات غالب فارسی (۲ جلدیں) (نئی دہلی غالب انسی ٹیوٹ ۲۰۰۸ء)، ص ۱۰۵

۳۳۔ زبیر صدیقی، مقالہ، ڈاکٹر تقی عابدی شعبہ اردو (کراچی جامعہ ۲۰۰۹ء)، ص ۱۶۶

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۱۷

باب دوم

چوں مرگ آید

مقدمہ کا توضیحی مطالعہ

چوں مرگ آید ڈاکٹر تقی عابدی کی اپنی نوعیت کے لحاظ سے وہ پہلی کتاب ہے۔ جس میں شاعر مشرق کے جملہ بدنی عوارض اور علاج کے متعلق ہر طرح کی معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خود تقی عابدی نے اس کتاب کے مقدمہ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے۔

"یہ کتاب اس لحاظ سے بھی انفرادیت رکھتی ہے کہ اس میں طبی معلومات، بدنی کیفیات اور روحانی اعتقادات کو خاص طریقہ سے برتا ہے۔ گفتگو لفظ بہ لفظ خطوں کے آئینے میں مستند حوالوں کی روشنی میں کر کے نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ جس کے مطالعہ سے عوام ہی نہیں بلکہ اقبالیات کے خاص طالب علموں کو بھی معلومات فراہم ہو سکتی ہیں"۔(۱)

تقی عابدی نے خود ہی یہ نکتہ بیان کر دیا ہے کہ اس کتاب کا ہر لفظ مستند حوالے یعنی خطوط کے آئینے میں بیان کیا گیا ہے۔ ہمارے پاس اقبال کے خطوط ہی بنیادی ذریعہ ہیں جن کے ذریعے ہم اقبال کی زندگی کے ہر گوشے کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر تقی عابدی نے شاعر مشرق کی جملہ بدنی عوراض اور ان کے علاج کی تفصیل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ اور ان جملہ امور کو ایک ماہر طبیب کی نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس حقیقت کے ساتھ ساتھ کہ علامہ محمد اقبال اس زمانے کے خوش نصیبوں میں سے تھے جن کو ہر طرح کے معالجین کی طبی خدمات حاصل کرنے کا موقع ملا ڈاکٹر تقی عابدی بیان کرتے ہیں:

"اقبال ان چند خوش نصیبوں میں شامل ہیں جنہیں اس زمان و مکاں

کے لحاظ سے بہترین طبی امداد حاصل رہی۔ اقبال کے تیس سے زیادہ معالجوں میں حکیم نابینا ڈاکٹر اور دلسوز پرستار بھی شامل تھے مسیح الملک اجمل خان ہوں کہ افسر الاطبا حکیم نابینا عالمی شہرت یافتہ ڈاکٹر میتھر اداس ہوں کہ چیف ریڈیالوجسٹ بھوپال ڈاکٹر عبدالباسط اور ان کے معاونین دِن رات اسی کوشش میں لگے رہے کہ علامہ کا علاج بہترین طریقہ پر کیا جاسکے''۔(۲)

ڈاکٹر تقی عابدی نے یہاں جن چند معالجین کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ہندوستانی انگلیسی جرمنی فرانسوی اطبا کے زمرہ میں مسلمان ٗہندو، سکھ اور عیسائی سب شامل تھے مقدمہ میں حکیم نابینا کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن کا پورا نام عبدالوہاب انصاری تھا اور یہ حکیم نابینا کے نام سے مشہور تھے۔ یہ ۱۸۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۱ء کو فوت ہوئے۔ اقبال کے خاص معالجین میں شامل تھے۔ ۱۹۱۷ء سے لیکر اقبال کی علالت کے آخری ایام تک ہر ممکن کوشش کرتے رہے تاکہ شاعر مشرق کی صحت مندانہ تشفی کرسکیں۔ اقبال نے اپنے خطوط میں بھی حکیم نابینا کا ذکر کیا ہے۔ وہ ۸ دسمبر ۱۹۲۷ء کو ڈاکٹر مظفر الدین قریشی کو لکھتے ہیں:

''حکیم صاحب کی خدمت میں میری طرف سے بہت بہت آداب عرض کریں۔ باقی رہا ان کا اعتراف کمال تو اس وقت ہندوستان کیا بلکہ تمام ایشیاء میں اسلامی طب انہیں کے نام سے زندہ ہے۔ میری طرف سے ان کی خدمت میں یہ دو شعر عرض کردیجئے جو ایک علیحدہ کاغذ پر لکھتا ہوں۔ والسلام''۔ (۳)

محمد اقبال

ہے دونوں روحوں کا نشیمن قالب خاکی مرا
اک سراپا شور و مستی ایک سراپا تاب و تب
ایک جو کہ اس نے بخشی مجھے روزِ ازل
دوسری ہے آپ کی بخشی ہوئی روح الذہب
اس سے زیادہ اور کیا لکھوں میں اے لقمان ملک

رکھتا ہے بے تاب دونوں کو مرا حسن طلب

اگر ان اشعار پر غور کیا جائے تو علامہ اقبال نے حکیم نابینا کو لقمان ملک کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ مقدمہ میں حکیم اجمل خان کا ذکر بھی علامہ اقبال کے خاص معالجین میں کیا گیا ہے۔ حکیم اجمل خاں دہلی کے رہنے والے تھے۔ اور طبیہ کالج دہلی کے بانی تھے۔ علامہ اقبال کو جب نقرس کی بیماری لاحق ہوئی تو انہوں نے دوائیں روانہ کی تھیں۔ ڈاکٹر عبدالباسط انصاری کا ذکر بھی بطور خاص کیا گیا ہے۔ یہ بھوپال میں چیف ریڈیالوجسٹ تھے جنھوں نے اقبال کا بجلی سے علاج کیا۔ اقبال کا بجلی یا برقی علاج ان کے گلو کے درد اور خصوصاً آواز کے بیٹھ جانے کے لیے ہوا۔ ان تمام باتوں سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اقبال واقعی خوش قسمت لوگوں میں شامل تھے جن کے علاج کے لیے ہر کوئی ان کی خدمت کا شرف حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وگرنہ تاریخ ایسی بہت سی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ جن میں شاعر طبقہ ہمیشہ لاچارگی اور بے بسی کا شکار رہا۔ ڈاکٹر تقی عابدی کچھ عظیم ہستیوں کا ذکر کتاب کے مقدمے میں کرتے ہیں:

> ''تاریخ کے سیاہ اوراق پر جہاں فارسی کا عظیم شاعر فردوسی لاچارگی کی موت مرتا ہے۔ عطار جیسا عظیم فارسی کا شاعر ایک معمولی سپاہی کی تلوار سے قتل ہوتا ہے۔ حافظ جیسا شاعر اپنی منکسر المزاجی کی وجہ سے بخش دیا جاتا ہے۔ جعفر زٹلی حق گفتنی پر ہاتھی سے کچل دیا جاتا ہے۔ اور انشاء خاں انشاء جیسا عمدہ شاعر شاہی عتاب کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔'' (۴)

ان تمام شاعروں کے حالات زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُسی گنبد بے در میں علامہ اقبال کا علاج اور ان کے آرام کا خیال رکھنے کی بھرپور سعی کی جا رہی تھی۔ یہاں پر ڈاکٹر تقی عابدی نے بہت ہی خوبصورت جملہ استعمال کیا ہے۔ جو قابل ستائش بھی ہے اور قابل توجہ بھی۔

> ''اقبال کا علاج اور ان کے آرام کا خیال اس طرح سے کیا جا رہا تھا کہ بادشاہوں کے دلوں میں بھی اس کی حسرت رہ جائے۔ یہاں حکیم الامت کے قدموں میں حکمت اور حکیم ان کی طبیعت کے موافق طب اور طبیب دِن رات یوں مصروف تھے جیسے عبادت کر رہے ہیں۔'' (۵)

یعنی ان کی خدمت پر مامور تمام معالجین حتی الامکاں کوشش میں تھے کہ علامہ اقبال کی بیماری بھی جاتی رہے اور کوئی دوائی ایسی استعمال نہ کی جائے جو علامہ اقبال کی طبیعت کو ناگزیر گزرے۔ کیونکہ علامہ اقبال کو کڑوی دوا پسند نہ تھی۔ یوں تمام ڈاکٹر اور حکماء ان کا علاج بہت ہی محتاط ہو کر عبادت کی طرح کر رہے تھے۔ عبادت کا حال بھی ڈاکٹر سید تقی عابدی یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''حکیم قریشی ہاتھ سہلا رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد یوسف بازو داب رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقیوم علامہ کے غصہ کو شہد کی طرح پیئے جا رہے ہیں۔ جرمن کے ڈاکٹر زیلشر یا لاہور کے فیملی ڈاکٹر جمعیت سنگھ یا آنکھ کے سرجن متھرا داس کوٹھی پر بروقت حاضر ہیں اور حضور اقبال میں رہنا اپنا فرض سمجھ رہے ہیں۔ یہ امکانات ہر شخص کی قسمت میں نہیں۔'' (۶)

حکیم قریشی کو یہ شرف حاصل تھا کہ اقبال کے دار فانی سے کوچ کرنے کی آخری رات بھی یہ اقبال کے پاس معالج کے طور پر موجود تھے ان کا تعلق لاہور سے تھا ڈاکٹر محمد یوسف کا تعلق بھی لاہور سے تھا۔ یہ بہت مشہور معروف معالج تھے ماہر امراض قلب تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ایک جرمن ڈاکٹر کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن کا نام زیلشر تھا۔ انہوں نے علامہ کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا تھا کہ انہیں قلبی بیماری ہے۔ کیونکہ ان کو دوسرے اطباء کے علاج میں شک تھا۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ لاہور کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ یہ بھی علامہ اقبال کی آخری رات ان کے پاس ہی موجود تھے۔ ڈاکٹر متھرا داس لاہور میں اقبال کی آنکھ کے معالج تھے۔ جو اقبال کی آنکھ میں موتیا (Cataract) کا آپریشن کرنے والے تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس عظیم شاعر کی بدنی عوارض اور ان کے علاج کے متعلق ٹھوس معلومات کے لیے تقریباً (۲۵۱) خطوط کو بطور حوالہ پیش کیا ہے۔ تاکہ اقبال کے حقیقی خدمت گزاروں کے نام اور کام سے آشنائی ہو سکے۔ کتاب کے مقدمہ میں طبی اور انگریزی ادویات کا تقابلی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے ڈاکٹر تقی عابدی لکھتے ہیں۔

> ''اقبال کی علالت اور ان کے علاج کے دوران طبی اور انگریزی علاج کا مقابلہ بھی ایک عمدہ تقابلی اسٹیڈی کے طور پر کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اقبال علاج کے خواہاں تھے لیکن انہوں نے ایلوپیتھک علاج سے بھی حسب

ضرورت فائدہ اٹھایا۔'' (۷)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس کتاب کے مقدمے میں اقبال کے نظام اوقات کا مفصل ذکر کیا ہے۔ کہ یہ کتاب اقبال کی زندگی کے اس پہلو کو بھی واضح کرے گی۔ جس میں مسواک سے لے کر علامہ اقبال کی خوراک اور اجابت تک کے مسائل کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ اقبال کی نجی زندگی میں ان تمام باتوں کا بہت عمل دخل تھا۔ مگر ان تمام عوارض کے باوجود چونکہ اقبال کی طبیعت قلندرانہ تھی اس لئے بیماری کی حالت میں اقبال کی قوت احساس بڑھ گئی تھی ڈاکٹر تقی عابدی چوں مرگ آید کے مقدمے میں بیان کرتے ہیں۔

''جان انسان کی سب سے پیاری چیز ہے۔ چنانچہ جب جان خطرے میں پڑ جاتی ہے تو جذبات کی گہرائیوں سے ایسے افکار اُبلتے ہیں جو آب زلال سے بھی خالص اور بغیر کسی ملاوٹ اور بناوٹ کے ہوتے ہیں۔ عمر اور بیماری کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انسان کی قوت احساس بھی بڑھ جاتی ہے جب کہ قوت بدنی کم ہو جاتی ہے اس سے کشمکش زیادہ اور کم ہونے سے جو جذبات میں جو تلاطم پیدا ہوتا ہے اس کا سرچشمہ جو اقبال کی کئی آخری عمر کی نظموں میں نظر آتا ہے۔ قابلِ تفکر و تائید ہے۔'' (۸)

ڈاکٹر تقی عابدی چونکہ خود طب کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ اس لیے ان سے بہتر کسی مریض کی ذہنی و جسمانی حالت کو کوئی اور بہتر طریقے سے نہیں سمجھ سکتا کہ جب کسی مریض کو اس کی بیماری کے متعلق بتایا جائے تو وہ گھبراہٹ کا شکار ہو سکتا ہے۔ بلند حوصلہ شخص بھی حوصلہ چھوڑ دیتا ہے۔ اور صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے مگر ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کی بلند حوصلگی کے متعلق کچھ یوں رقم کیا ہے۔

''لیکن جب لاہور کے ریڈ لولا جسٹ ڈاکٹر ڈک سینے کے ایکس ریز کے معائنہ کے بعد علامہ کے سینے میں مہلک ٹیومر کی تشخیص دیتے ہیں اُسی دن چند گھنٹوں بعد جو خط علامہ نے سید نذیر نیازی کو حکیم نابینا سے مشورہ کرنے کے لیے لکھا۔ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اقبال تمام آزارِ قلب اور بغیر تشویش کے زندگی اور موت کے مباحثہ میں مشغول ہیں۔ یہی نہیں موت

سے کچھ گھنٹے قبل درد کم کرنے کے لیے افیونی دواؤں کے استعمال کو یہ کہہ کر منع کر دیا کہ میں نیم بیہوشی یا بے ہوشی میں مرنا نہیں چاہتا'' (۹)

اقبال کے استقلالی مزاج، حیات کے مسائل کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس دہائی (بیسوی صدی کی دوسری اور تیسری) کی تمام ان جدید سہولتوں کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ جو اس زمانے میں رائج تھی کیونکہ علامہ اقبال کو ان تمام سہولیات کی فراہمی کو یقینی بنایا گیا تھا جو ان کے جملہ عوارض کی تشخیص اور علاج کے لیے استعمال ہو سکتی تھیں۔

ان تمام عوارض کے باوجود اقبال کا حوصلہ تو جوان تھا مگر اب ہاتھ جواب دے چکے تھے۔ اور بہت سی شاہکار تصانیف جو اس عظیم مفکر کے ہاتھوں پایہ تکمیل کو پہنچ سکتی تھیں۔ وہ مکمل ہونے سے محروم رہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

''حکیم الامت کی طویل علالت اور مرض الموت کی وجہ سے امت جن شاہکار تصانیف سے محروم رہی جس میں قابل ذکر مقدمتہ القرآن گمشدہ پیغمبر کا صحیفہ اور Construction of Islamic Jurispudence وغیرہ شامل ہیں''۔ (۱۰)

مقدمے میں مرض کی تشخیص کے سلسلے میں جو غلطیاں کی گئیں ہیں ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے علامہ کی آواز کے بیٹھ جانے کی وجوہات مکمل تفصیل سے بیان کی ہیں۔ اور اس کے علاج کے لیے حکیموں اور ڈاکٹروں کی تگ و دو کو جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ دمہ قلبی رسولی اور مرض قلب وغیرہ کی صحیح علت اور تشخیص جدید طبی اصولوں کی روشنی میں اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ کتاب کو آسان اور عام فہم بنایا جا سکے خود بیان کرتے ہیں:

''مطالب عام فہم جملوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ بہر حال میڈیکل اصطلاحات کا حتی المقدور ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ تا کہ عوام اور خواص جن میں طبیب اور غیر طبیب ہیں سب استفادہ کر سکیں۔'' (۱۱)

ہر بیماری کو مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی وجوہات اور اس کے علاج میں

استعمال ہونے والی ادویات اوقات کار کے ساتھ آلات جراحی سمیت ڈاکٹر تقی عابدی نے حرف بہ حرف بیان کیا ہے۔ حکیم الامت کی بیماری ایک طرف مگر ان کا مقصد حیات ان کے لیے صحت سے زیادہ اہم نظر آتا ہے۔ جب انسان موت کو قریب پاتا ہے تو وہ اپنے تمام شغل، شاعری، رفاہی کام، سب چھوڑ کر خود کو موت کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ برعکس نظر آتا ہے علامہ اقبال آخری لمحوں تک اپنا فرض منصبی نبھانے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں ڈاکٹر تقی عابدی مقدمے میں بیان کرتے ہیں۔

> ''جب کہ علامہ یہ بخوبی جانتے تھے کہ وہ چراغ سحری ہیں اور صرف کچھ دنوں یا گھنٹوں کے مہمان ہیں۔ لیکن انتقال کی آخری شب تک اگر ان کے نظام اوقات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی انہماک اور کوشش سے امت کے کاموں میں مصروف ہیں۔ جیسے انہیں کچھ ہوا ہی نہیں۔'' (۱۲)

ڈاکٹر تقی عابدی نے مقدمے کا اختتام بہت ہی خوبصورت جملے کے ساتھ کیا ہے۔

> ''فکر ہر کس بہ ہمت اوست ہے لیکن پھر بھی ان واقعات سے سیکھنے والے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔''

بطور طبیب ڈاکٹر تقی عابدی اقبال سے اپنی محبت، فکر اقبال سے اپنی توجہ، مقاصد اقبال سے اپنی ہم آہنگی کا ابلاغ ایک دیگر اسلوب سے کر رہے ہیں۔ انہوں نے اقبال کے بدنی عوارض اور ان کے علاج کو ایک ماہر طبیب کی نظر سے دیکھنے اور بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کاوش کا اسی مقدمہ اقبال میں اپنی محبت کا اعلان اور برملا اظہار ہے۔

چوں مرگ آید کا توضیحی اور تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب چوں مرگ آید علامہ اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص خطوط مستند حوالوں اور جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔ اقبال اکادمی پاکستان نے اس کتاب کو پہلی دفعہ ۲۰۰۷ء میں شائع کیا۔ دو سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کا ایک ایک لفظ ڈاکٹر تقی عابدی کی اقبال سے والہانہ محبت کا اظہار ہے۔ فہرست مضامین کے بعد کتاب کا آغاز انتساب سے

کیا گیا ہے جس میں تقی عابدی نے اقبال کے خط کو حوالے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اسی خط کے حوالے سے تقی عابدی نے بھی کتاب اسی گمنام حکیم کے نام کردی ہے جس کی دوا سے اقبال کی قلبی اور روحانی تشفی ہوئی۔ ڈاکٹر تقی عابدی انتساب میں رقم کرتے ہیں۔

''پرخلوص گمنام حکیم کے نام جنھوں نے علامہ کی بیماری کی دوا تیار کر کے گورداس پور سے لاہور آکر علامہ کو پیش کی۔''

انتساب میں ڈاکٹر تقی عابدی نے علامہ کے جس خط کو شامل کیا ہے وہ مولانا گرامی کو ۱۳/ اپریل ۱۹۳۲ء کو لکھا گیا

''کل گورداس پور سے ایک حکیم صاحب خود بخود تشریف لے آئے تھے۔ انہیں کسی سے میری علالت کا حال معلوم ہوا تھا۔ دوا دے گئے تھے۔ جس سے فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس دوا سے فائدہ ہو جائے گا کیونکہ جن اجزاء سے یہ مرکب بنا ہے ان میں سے ایک اخلاص بھی ہے جو ان حکیم صاحب کو خود بخود میرے مکاں تک لے آیا۔'' (۱۳)

کتاب کے مقدمہ میں پوری کتاب کا خلاصہ نہایت جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر تقی عابدی اپنی کتاب کا آغاز علامہ کے عوارض سے کرتے ہیں۔ ان عوارض کو دس قسموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جس میں عوارض چشم کو سرفہرست رکھا گیا ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق اقبال کو یہ بیماری دو سال کی عمر سے ہی تھی جو کئی مواقع پر ان کی زندگی میں رکاوٹ بنی۔ عوارض چشم میں داہنی آنکھ کی ضعفِ بصارت ، دونوں آنکھوں میں موتیا اترنا، اور کمزور بینائی وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے بعد عوارض گردہ، نقرس، عوارض قلب عوارض ریاحی یعنی پھیپھڑوں کے عوارض، عوارض گوارشی ، دردگلو امراض دہان، ملیریا اور کم خوابی وغیرہ شامل ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی ریسرچ کے مطابق اقبال کی داہنی آنکھ بچپن سے کمزور تھی جب ان کی عمر دو سال کے قریب تھی ۱۹۰۱ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے مقابلے میں طبی معائنہ میں ناکام قرار دیئے گئے۔ اس بات کا تذکرہ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی کیا ہے۔

"اقبال کی دائیں آنکھ کی بینائی بچپن ہی سے بہت کمزور تھی۔ غالباً
اسی سبب کالج میں طالب علمی ہی کے زمانے میں وہ عینک لگانے لگے تھے۔
اقبال کے اپنے بیان کے مطابق ان کی یہ آنکھ دو سال کی عمر میں ضائع ہو گئی
تھی۔ اس لیے انہیں اپنی ہوش میں مطلق یاد نہ تھا کہ یہ آنکھ کبھی ٹھیک بھی تھی
یا نہیں۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ داہنی آنکھ سے خون لیا گیا ہے جس کی وجہ
سے بینائی ضائع ہو گئی تھی۔ اقبال کو ان کی والدہ نے بتایا تھا کہ دو سال کی عمر
میں انہیں جونکیں لگوائی گئی تھیں۔" (۱۴)

اقبال کی بیماریاں

ڈاکٹر تقی عابدی اپنی کتاب کا آغاز اقبال کے عوارض سے کرتے ہیں۔ اقبال کی بیماریوں کا ذکر فقیر سید وحید الدین روزگار فقیر میں ان الفاظ سے کرتے ہیں:

"ڈاکٹر صاحب کو یکے بعد دیگرے اتنی بیماریاں لاحق ہوئیں کہ
زندگی اجیرن ہو گئی مگر ان بیماریوں کے باوجود ان کی زندگی کے معمولات
میں سرِ مو فرق نہیں آیا، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مسلسل علالتوں نے
ان کے مزاج کی سنجیدگی کو متغیر نہیں کیا ورنہ عام طور پر مریضوں کو دیکھا گیا
ہے کہ بیماری ان کو چڑچڑا بنا دیتی ہے۔" (۱۵)

چونکہ اقبال پر اب مختلف بیماریوں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا تبخیر معدہ اور بدہضمی تو ان کو کافی عرصے سے تھی۔ اسی وجہ سے سوڈے کی بوتلیں ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔ فقیر سید وحید الدین اقبال کی بیماریوں کی اقسام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"پھر نقرس کا حملہ ہوا درد گردہ کی شکایت ہوئی ضیق النفس کے سبب
آواز بیٹھ گئی تھی بے چینی اور کرب نے مستقل رفاقت اختیار کر لی۔ آخرِ عمر
میں بصارت بھی بڑی حد تک جواب دے گئی مگر بیماریوں کے حملوں نے ان
کی حوصلہ مندی ثابت قدمی اور خوش ذوقی میں فرق نہ آنے دیا۔" (۱۶)

اقبال کا حوصلہ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے بیماریوں سے پریشان ہونا سیکھا ہی نہ تھا۔ ادھر بیماری سے کچھ افاقہ محسوس کیا تو اپنے مقصد میں مصروف نظر آنے لگے۔ وہی احباب کی محفلیں اور ان میں علمی مباحثے اقبال کا وطیرہ بن جاتا تھا۔

''ذرا طبیعت سنبھلتی تو وہی احباب کی محفلیں، علمی مباحثے، سیاست، مذہب، فلسفہ ،منطق، تاریخ اور تصوف ان میں سے ہر موضوع پر نئے اور پرانے ملاقاتی ان کی خدمت میں حاضر ہو کر تبادلہ خیال کرتے اور علمی تشنگی بجھاتے۔'' (۱۷)

ان بیماریوں کے علاوہ اقبال کو چند چھوٹی چھوٹی بیماریاں بھی لاحق تھیں عام صحت تو اقبال کو بہتر محسوس ہو رہی تھی لہٰذا اقبال نے ان چھوٹی چھوٹی بیماریوں کی طرف دھیان نہ دیا۔ یہاں تک کہ سیاحت افغانستان کے متعلق اپنے تاثرات کو ''مسافر'' کے عنوان سے مرتب کر دیا۔ اور بال جبریل کے نامکمل عنوانات کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی۔ عبدالحمید سالک اقبال کے عوارض کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''ان دنوں علامہ نے ایک دو نئی شکایتیں محسوس کیں۔ وسط اگست میں ان کا سر دفعتاً چکرایا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ یہ غالباً ابتدائی علامت موتیا بند کی تھی۔ دونوں شانوں کے درمیان کبھی کبھی ہلکا سا درد رہنے لگا جو روغن اوجاع کی مالش سے دور ہو جاتا لیکن سال چھ مہینے کے بعد یہ درد ضرور ہوتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی دن میں ایک آدھ ہچکی آجاتی جس نے رفتہ رفتہ ایک ہلکی سی چیخ کی صورت اختیار کر لی۔'' (۱۸)

اقبال کا تعلق چونکہ کشمیری گھرانے سے تھا اور رنگت سرخ و سفید تھی۔ ان تمام عوارض کے باوجود ان کا چہرہ تندرست دکھائی دیتا تھا۔ آخری وقت تک حوصلہ جوان رہا۔ اگرچہ آخری عمر میں بالکل نڈھال ہو گئے تھے۔ اقبال کی بیماریوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں۔

> ''مزاج بلغمی تھا تبخیرہ معدہ کی تکلیف رہتی۔ پھر مدت تک درد گردہ کی شکایت رہی۔ یہ مرض انہیں اپنی والدہ سے ورثے میں ملا تھا۔ احباب کے مشورے سے حکیم نابینا سے علاج کرایا جس سے بہت فائدہ ہوا اس کے

بعد دردنقرس کا عارضہ لاحق ہو گیا۔اس کے دورے پڑتے تو لگا تار کئی راتیں کرب اور بے چینی کے عالم میں تڑپتے گزر جاتیں۔" (۱۹)

اقبال کو کھانے میں چونکہ ترش چیزیں پسند تھیں اس لیے اس کا اثر گلے پر پڑا تھا گلہ خراب رہنے لگا تھا۔اور یوں آخری عمر میں گلا بالکل بیٹھ گیا تھا جس کا اقبال کو بے حد افسوس تھا۔اقبال کی باقی بیماریوں کا ذکر کرتے ہوئے جاوید اقبال رقم کرتے ہیں:

"تمباکو نوشی سے کھانسی کی شکایت بھی تھی جس نے رفتہ رفتہ قلبی صورت اختیار کر لی۔کھانستے کھانستے بے ہوش ہو جایا کرتے تھے۔ایک آنکھ بچپن سے ہی تقریباً بے کار تھی۔لیکن اب ان کی دوسری آنکھ میں بھی موتیا اترنے لگا۔آخر کار بحیثیت مجموعی کمزوری اور ضعف کے باعث دل کمزور ہو گیا۔" (۲۰)

ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق برصغیر میں چالیس پچاس سال تک یہ رواج رہا کہ اگر آنکھ میں کوئی نقص ہو تو جونکیں لگائی جاتی تھیں جن کو کئی دنوں تک بھوکا رکھا جاتا تھا اور پھر آنکھوں کے قریب لگایا جاتا تھا جو خون چوس لیتی تھیں تقی عابدی نے حوالے کے طور پر سید نذیر نیازی کی کتاب دانائے راز سے ایک اقتباس نقل کیا ہے۔

"اقبال دو سال کے ہوئے تو ایک بیماری کے علاج کے لیے ان کی بے جی (والدہ) نے ان کی دہنی آنکھ کے قریب جونکیں لگوائیں جونکوں نے فاسد خون چوس لیا۔بیماری جاتی رہی لیکن آنکھ کی بینائی متاثر ہوئی یہاں تک کہ عمر کے ساتھ ساتھ یہ بینائی بالکل جاتی رہی۔" (۲۱)

ڈاکٹر تقی عابدی کی طبی تحقیق کے مطابق اتنے چھوٹے بچے کو کمسنی کی عمر میں جونکیں لگوانا کسی خطرے سے کم نہ تھا۔چونکہ جونکوں نے ریٹینا پر اثر ڈالا۔ظاہر ہے جب جونکوں نے خون کو چوس لیا تو Retina کو خشک کر دیا۔یا پھر آنکھ میں انفیکشن کی وجوہ بھی ہو سکتی ہے۔ڈاکٹر تقی عابدی ریٹینا کے فعل کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"آنکھ کو خون Internal Opthalmic Artery کے ذریعہ

کی شاخ سے پہنچتا ہے۔ اور یہی شاخ آنکھ کے Carotide Artery
اندرونی پردہ (Retina) کو بھی خون پہنچاتی ہے اگرچہ Opthalmic
Artery آنکھ کے حلقے کے اندر محفوظ رہتی ہے لیکن اس کی آخری دوشاخیں
Supra Orbital اور Supertsochlear Artery کنپٹی اور پیشانی
اور آنکھ کے اطراف کی جلد اور عضلات کو خون پہنچاتی ہے۔'' (۲۲)

ڈاکٹر جاوید اقبال کا بیان اگر زندہ رود میں پڑھا جائے تو ان کا خیال ہے کہ اقبال کی ایک آنکھ بچپن سے ہی کمزور تھی

''ایک تقریباً بیکار تھی لیکن اب دوسری آنکھ میں بھی موتیا اترنے لگا

تھا۔''

اس بات کی تصدیق کسی بھی وثوق ذرائع سے نہیں ہوسکی کہ اقبال کی آنکھ بچپن سے ہی کمزور تھی یا جونکیں لگوانے کے بعد زیادہ متاثر ہوئی کیونکہ اقبال کے کسی خط یا خطبے میں اس بات کا ذکر نہیں ملتا کہ ان کی آنکھ کمزور تھی۔ آخری عمر میں نظر کی کمزوری کی شہادتیں کافی جگہوں پر ملتی ہیں۔ کیونکہ آخری سالوں میں موتیا اترنا شروع ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے آخری عمر میں موتیا اترنے کی تصدیق کے لیے ایک مستند حوالہ استعمال کیا ہے۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال بیان کرتے ہیں۔

''زندگی کے آخری سالوں میں ان کی دوسری آنکھ میں موتیا اترنے لگا۔ آخری ایام میں اقبال کی نظر بیحد کمزور ہوگئی تھی۔ اس لیے راقم انہیں کبھی کبھار صبح اخبار پڑھ کر سناتا تھا اگر کسی لفظ کا تلفظ غلط ادا ہو جاتا تو بہت خفا ہوتے''۔ (۲۳)

حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال آخری عمر میں نظر کی کمزوری سے بے حد پریشان تھے کیونکہ بہت سے اہم کام ضعف بصیرت کی بدولت رُکے ہوئے تھے۔ ابھی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا فریضہ بھی سرانجام دینا تھا۔ روزگار فقیر میں فقیر وحیدالدین اقبال کے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''زندگی کے آخری سالوں میں آنکھ میں پانی اُترنا شروع ہو گیا

تھا۔ ۱۹۳۷ء کے آغاز میں موتیابند کی اس قدر شدت ہوگئی کہ معالجوں نے لکھنے پڑھنے کی بھی ممانعت کر دی۔ ڈاکٹر متھر اداس موگا والے آنکھوں کے علاج میں غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔۔۔ ڈاکٹر متھر اداس نے رائے ظاہر کی کہ موتیا بڑی تیزی سے اتر رہا ہے ممکن ہے کہ مارچ میں آپریشن کے لائق ہو جائے۔'' (۲۴)

ڈاکٹر متھر اداس نے یقین دہانی کرائی کہ جب آنکھ آپریشن کے لائق ہو جائے گی تو عمدگی سے آپریشن کیا جائے گا۔ ڈاکٹر متھر اداس کو یقین تھا کہ اس طرح مکمل بصارت بھی واپس آسکتی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی بیان کرتے ہیں:

''علامہ ضعف بصارت سے خاصے پریشان تھے کیونکہ کئی کام جو ضروری تھے انہیں انجام دینے سے قاصر تھے۔ اپنے دوست احباب اور رشتہ داروں کو اس بابت لکھتے اور اس کے علاج کی تلاش میں رہتے لیکن مایوس نہ تھے۔'' (۲۵)

مایوس نہ ہونے کا لفظ ڈاکٹر تقی عابدی کی اقبال سے محبت کا بے پایاں اظہار ہے۔ یعنی قومی ہیرو ضعف بصارت سے پریشان ضرور تھے مگر مایوس نہ تھے۔ یہاں تقی عابدی نے اقبال کے مختلف خطوط کو شامل کیا ہے۔ جس میں اقبال اپنے دوستوں کو ضعف بصارت کے متعلق بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی یہ کاوش قابل تحسین ہے کہ انہوں نے اقبال کے آنکھوں کے مرض کے لیے خطوط کا استعمال جا بجا کیا ہے۔ ذیل میں ڈاکٹر تقی عابدی نے چند خطوں کا ذکر کیا ہے۔ ۱۱۶کتوبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر مظفر الدین قریشی کو لکھتے ہیں:

''میری بصارت کمزور ہوئی ہے اس واسطے میری خط و کتابت یا تو جاوید کرتا ہے۔ یا دیگر احباب آپ کالی سیاہی سے سفید کاغذ پر لکھیں تو آپ کا خط خود بھی پڑھ سکوں گا۔'' (۲۶)

اقبال نے ڈاکٹر مظفر الدین کو جو خطوط لکھے ہیں وہ تمام ظاہر کرتے ہیں کہ اقبال طب یونانی پر زیادہ انحصار کر رہے تھے۔ کیونکہ انہوں نے ڈاکٹر مظفر الدین سے سرمہ کا ذکر بار بار کیا ہے۔ کبھی تو

اس سرمہ سے افاقہ ہو جاتا مگر موتیا کی صورت میں افاقہ ممکن نہ تھا۔ ۸ دسمبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر مظفر الدین کو لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میری آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے اور آپریشن ماہ مارچ میں ہوگا حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیجئے کہ وہ سرمہ جو آپ نے مجھے عنایت فرمایا تھا مفید ثابت نہ ہوا۔ کیا اسلامی طب میں موتیا کا علاج نہیں۔'' (۲۷)

یہاں اقبال نے طب اسلامی کا ذکر کیا ہے۔ یعنی اقبال طب اسلامی پر مکمل بھروسہ کیے ہوئے تھے۔ طب یونانی اور طب اسلامی کے علاج کو پسند کرتے تھے۔

اقبال کی آنکھیں دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ اب اقبال کو اپنے خاندان کی فکر لاحق ہوئی۔ کیونکہ ڈاکٹر متھرا داس نے بھی آپریشن کا اسی وقت یقین دلایا تھا جب آنکھیں اس قابل ہو جائیں کہ ان کا آپریشن کیا جا سکے۔ مگر اب بیماری زیادہ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ آپریشن مارچ سے ستمبر تک ملتوی کر دیا گیا۔ اقبال سر راس مسعود کو بچوں کی کفالت سپرد کرنا چاہتے تھے کیونکہ سر راس مسعود پر حد درجہ اعتماد کرتے تھے۔ مگر وہ کسی وجہ سے راضی بھی نہ تھے اور خدا کا کرنا یوں ہوا کہ وہ اقبال کی وفات سے نو مہینے قبل وفات پا گئے۔ علامہ ۳ جون ۱۹۳۷ء میں سر راس مسعود کو لکھتے ہیں:

''مجھے فکر ہے کہ میرے صغیر بچوں کی سرپرستی میرے بعد آپ جیسے افراد کے ہاتھوں میں ہو۔ میں خاندانی افراد سے زیادہ آپ پر اعتماد کرتا ہوں خدا آپ کو حضرت نوح کی عمر عطا فرمائے اور یہ بچے اقبال سے زیادہ آپ کو دیکھیں۔'' (۲۸)

مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ راس مسعود خود اقبال سے پہلے دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اقبال کو جاوید اور منیرہ کی بہت فکر تھی۔ یوں تو شیخ اعجاز احمد موجود تھے مگر وہ قادیانی مسلک کے ہیرو تھے۔ ایسے میں جاوید اور منیرہ کو ایسے مسلک کے حوالے نہیں کر سکتے تھے۔ جس کی مخالفت میں اقبال نے کڑی جنگ لڑی ہو۔ ۱۶ اپریل ۱۹۳۸ء کو شعیب قریشی جو نواب بھوپال کے سیکرٹری تھے ان کو لکھتے ہیں:

"ایک مدت سے تم کو خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا مگر آنکھوں میں موتیا اُتر آیا۔ اس کی وجہ سے لکھنا پڑھنا محال ہو گیا۔ یہ خط اپنے دوست سید نذیر نیازی کے ہاتھوں لکھوا رہا ہوں۔ معاف کیجئے آنکھ کا آپریشن ستمبر میں ہوگا۔ لیکن چونکہ ڈاکٹروں کے بیان کے مطابق میری بیماری زیادہ اندوہناک صورت اختیار کر رہی ہے اس واسطے امید نہیں کہ یہ آپریشن عمل میں آئے۔ ممکن ہے کہ میرا یہ خط تمہاری طرف آخری خط ہو اور اس کا مطلب جو کچھ ہے وہ تم اچھی طرح سے خود ہی معلوم کر سکتے ہو جاوید اور منیرہ دنوں نابالغ ہیں۔ ایک کی عمر چودہ سال ہے لڑکی کی سات یا ساڑھے سات سال ہے۔ میری خواہش ہے کہ تمہاری وساطت سے اعلیٰ حضرت میرے بعد ان بچوں کی طرف توجہ فرمائیں۔ زیادہ کیا لکھوں صرف تم کو اور مسعود کو میرے حالات معلوم تھے وہ بیچارہ تو چل بسا۔ اب میں تم پر بھروسہ کر سکتا ہوں۔ والسلام" (۲۹)

ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق علامہ کی ایک آنکھ شروع دن سے کمزور تھی مگر دوسری آنکھ میں وقت کے ساتھ موتیا اترنا شروع ہوا اور عمر کے آخری حصہ میں سفید پردے نے اقبال کو بینائی سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا۔ اسی سفید پردے کی وجہ سے بعض لوگوں نے قیاس کیا ہے کہ غالباً علامہ کی آنکھ مصنوعی تھی خالد نظیر صوفی اقبال کی مصنوعی آنکھ کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دوران گفتگو سعید صاحب نے یہ انکشاف کر کے مجھے چونکا دیا کہ انہیں باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ شاعر مشرق کی ایک آنکھ مصنوعی تھی۔ میں نے اس کی تردید کی کیونکہ میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔ مگر گوہر نوشاہی صاحب نے بتایا کہ انہوں نے بیشتر افراد سے یہ سنا ہے کہ چونکہ حکیم الامت کی ایک آنکھ ضائع ہوئی تھی اس لیے انہوں نے ایک آنکھ پتھر کی لگوا رکھی تھی۔" (۳۰)

خالد نظیر صوفی کے لیے یہ بات کسی پریشانی سے کم نہ تھی۔ ان کے پاس ان کی والدہ ماجدہ کے

علاوہ کوئی اور باوثوق ذرائع نہ تھا جو اس بات کی تصدیق یا تردید کر سکے۔ یوں خاندان کے بزرگوں اور میری والدہ ماجدہ نے اس بات کی تردید کرتے ہوئے کہا

"چچا جان کی ہمیشہ سے عادت تھی کہ دور کی چیزیں دیکھتے ہوئے اپنی کمزور آنکھ بند کر لیا کرتے تھے ہو سکتا ہے کسی نے انہیں اس طرح دیکھ کر یہ فرض کر لیا ہو کہ ان کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی ہے یا موتیے کی وجہ سے پتھر کی مصنوعی آنکھ تصور کر لیا ہو۔" (۳۱)

ڈاکٹر تقی عابدی کی بلند پایہ تحقیق کے بعد وہ بیان کرتے ہیں کہ اقبال نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ ان کا حوصلہ بلند تھا۔ ضعف بصارت کے باوجود دل شکستہ نہ تھے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے ضعف بصارت کے مسئلہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہاں دو حکایات بیان کی ہیں جو اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ بے شک اقبال نے ضعف بصارت کو اپنی فکر میں رکاوٹ نہیں بننے دیا تھا مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح یہ کمزوری ان کے لیے ایک بہت بڑا اندیشہ زندگی تھا۔ ایک تو اقبال کو روضہ رسولؐ پر حاضری کی بے حد خواہش تھی مگر وہ اپنے نفس کا تزکیہ مزید کرنا چاہتے تھے۔ جب وہ اپنے نفس سے مطمئین ہوئے تب تک ان کی آنکھیں اور گھریلو حالات ایسے ہو چکے تھے کہ وہ اپنی اس دیرینہ خواہش کو پورا کرنے سے قاصر تھے۔

اقبال کو حضور اکرمؐ سے بے حد عقیدت تھی۔ آخری عمر کی وہ رباعی جو صوفی محمد رمضان کو بخش دی ان کے قلب کی صدائے برگزشت ہے۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
در حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

ڈاکٹر تقی عابدی اس شعر میں اقبال کی فکر اور حضورؐ سے ان کی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں اے خُدا تو دو عالم کا غنی ہے اور میں محتاج حشر کے دن میرے گناہوں کو معاف کر دے اگر میرے صفحہ اعمال دیکھنا لازمی ہو تو اسے حضور کی نظر سے بچا کر دیکھ

لے۔ اقبال کی آرزو شدت اختیار کرتی گئی مگر ساتھ ہی ان کی بصارت بھی کمی کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ اقبال لسان العصر اکبر الہ آبادی کو ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء کے خط میں لکھتے ہیں

"خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارت روضہ رسول نصیب کرے مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھئے کب جوان ہوتی ہے۔" (۳۴)

ڈاکٹر تقی عابدی اپنی کتاب اقبال کے عرفانی زاویے میں بیان کرتے ہیں کہ اقبال نے کافی دفعہ عالم خیال میں آستانہ نبوی کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ اقبال خاک مدینہ کو دنیا اور عقبی پر اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ وہاں ان کے دلبر محمدؐ کا مزار مبارک ہے کہتے ہیں کہ عالم خیال میں علامہ نے کئی بار آستانہ محمدیؐ پر حاضری دی لیکن ہر وقت کا انداز اور رنگ جدا رہا۔ علامہ کا یہ شعر ان کو عالم خیال میں آستانہ نبویؐ پر حاضری کی نشاندہی کرتا ہے۔

فرشتے بزم رسالت میں لے گئے مجھ کو
حضور آیہ رحمت میں لے گئے مجھ کو

عالم خیال سے نکل کر روضۂ اقدس پر حاضری کی آرزو ضعف بصارت کی وجہ سے پایہ تکمیل تک پہنچتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ آخری عمر میں روضۂ اقدس کا شوق موجزن رہتا تھا۔ اور عالم خیال میں بار بار روضہ اطہر کی زیارت کا اشارہ اور بھی شدت پیدا کر دیتا تھا۔ اور کبھی دل کو تسلی یوں دیتے تھے۔

بایں پیری رہ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرور عاشقانہ
چوں آں مرغی کہ در صحرا سر شام
کشادے پر بہ فکر آشیانہ

رانا غلام یٰسین اقبال کی ضعف بصارت پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ اقبال اور طب میں بیان کرتے ہیں:

"ضعف بصارت کی وجہ سے آپ لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گئے" (۳۵)

چونکہ ضعف بصارت کی وجہ سے خط و کتابت طبیعت کے موافق نہ تھی اس لیے سب سے تکلیف

دہ عمل یہ تھا کہ خط و کتابت کے لیے کسی نہ کسی کو کہنا پڑتا تھا۔ کبھی تو جاوید اقبال کی مدد لیتے اور کبھی دوست احباب کی۔ اب مسئلہ درپیش تھا اقبال کی آنکھوں کے علاج کا جس کو حل کرنا قدرے آساں نہ تھا کیونکہ اقبال کو انگریزی علاج سے نفرت تھی اور وہ دیسی علاج کو اہمیت دیتے تھے۔ آنکھوں کے علاج پر ڈاکٹر تقی عابدی بحث کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ:

اقبال کی بینائی بچپن سے کمزور تھی اور چشمہ کا استعمال کرتے تھے انتقال سے ۲ سال قبل موتیا اُترنے لگا۔ خط و کتابت سے معذور ہو گئے حکیم صاحب سے سرمہ استعمال کرتے رہے لیکن فائدہ نہ ہوا۔ ڈاکٹر مھتراداس جو ایلو پیتھک ڈاکٹر تھے علامہ کا موتیا کا آپریشن کرنے والے تھے لیکن زندگی نے اجازت نہ دی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے چوں مرگ آید میں اقبال کی طبی دواؤں کا ذکر کرتے ہوئے آنکھوں کے لیے سرمہ کا استعمال بتایا ہے یعنی آنکھوں کے علاج کے لیے اقبال نے سرمہ کے علاوہ کوئی یونانی دوائی استعمال نہیں کی۔ اور وہ اس سلسلے میں صرف حکیم نابینا پر اعتماد کرتے تھے۔ چاہے ان ادویات سے افاقہ ہو یا نہ ہو مگر اقبال دیسی ٹوٹکوں سے مطمئن تھے۔ اور یوں علاج سے گریز کا نتیجہ آخری عمر میں موتیا اترنے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ سرمہ کے متعلق معلومات دیتے ہوئے رانا غلام یٰسین تحریر کرتے ہیں

> ”مشہر عام چمکدار دھات ہے جو کہ طبعی طور پر کانوں سے نکلتی ہے۔
> رنگ سیاہ چمکدار، ذائقہ پھیکا بدمزہ، مزاج سرد خشک، حابس خون اور مقوی و محافظ بصارت ہے۔ نکسیر بند کرنے کے لیے پیشانی پر ضماد کرتے ہیں زخموں کے لیے مفید ہے“۔ (۳۶)

درد نقرس

اقبال کو درد گردہ تو تھا ہی مگر ساتھ ہی درد نقرس بھی شروع ہو چکا تھا۔ درد گردہ تو والدہ سے ورثہ میں ملا تھا۔ اور حکیم نابینا اس کا علاج کر رہے تھے۔ درد گردہ کے بعد اقبال کو پاؤں کے جوڑوں میں درد کی شدت محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال زندہ رود میں تحریر کرتے ہیں۔

> ”اس کے بعد درد نقرس کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ اس کے دورے پڑتے

تو لگاتار کئی راتیں کرب اور بے چینی کے عالم میں تڑپتے گزر جاتیں۔" (۳۷)

ڈاکٹر تقی عابدی نے درد نقرس کے متعلق بھی تحقیق کی ہے کہ یہ عارضہ کیا ہے۔ یہ کس طرح اقبال کو متاثر کرتا رہا۔

"نقرس یا (Gout) ایک طبی عارضہ ہے۔ جس میں یورک ایسڈ میں خون زیادہ ہونے پر بدن کے بعض جوڑوں میں ورم اور شدید درد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یورک ایسڈ کے Crystals عام طور سے پاؤں کے انگوٹھے کے جوڑ میں ورم اور شدید درد پیدا کرتے ہیں بعض اوقات یہ درد انگوٹھے کے علاوہ گھٹنے یا کمر کے جوڑوں میں بھی ہوتا ہے۔" (۳۸)

تقی عابدی نے یہ بھی اقبال کے گردے میں پتھری کے متعلق قیاس کیا ہے کہ یورک ایسڈ کی زیادتی کی وجہ سے گردے میں پتھری بن گئی ہوگی۔ ان کی تحقیق کے مطابق دس فیصد لوگ جن کو نقرس کی بیماری ہوتی ہے ان کو گردہ کی پتھری بھی ہوتی ہے۔ رانا غلام یاسین اقبال اور طب میں نقرس کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

"نقرس کی بیماری بھی آپ کو گاہے بگاہے ہوتی رہی اور آخر تک اس بیماری نے پیچھا نہ چھوڑا۔" (۳۹)

روزگار فقیر میں سیّد وحید الدین اقبال کی علالتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"ڈاکٹر صاحب تبخیرہ معدہ اور بدہضمی کے پرانے مریض تھے۔ سوڈے کی بوتلیں ان کے یہاں ہمیشہ رہتیں۔ یہاں تک کہ سیالکوٹ تشریف لے جاتے تو وہاں بھی سوڈے کی بوتلوں کا اہتمام ہوتا۔ پھر نقرس کا حملہ ہوا درد گردہ کی شکایت ہوئی۔" (۴۰)

عبدالمجید سالک نے بھی نقرس کے درد کے متعلق اپنی کتاب ذکر اقبال میں لکھا ہے۔

"دو ایک دن نقرس کی تکلیف بھی رہی ضیق النفس کے لیے حکیم قریشی صاحب نے ایک ہلکا سا جوشاندہ تجویز کر رکھا تھا۔ جس کے استعمال سے سکون ہو جاتا تھا۔" (۴۱)

عبدالمجید سالک ذکر اقبال میں ہی مزید لکھتے ہیں۔

''مرض الموت کی کیفیت یہ تھی کہ آخر میں استقاء ہوا چہرے اور پاؤں پر ورم ہو گیا۔ درد پشت اور درد شانہ کے عوارض شروع ہو گئے۔'' (۴۲)

اقبال کو یہ درد پاؤں کے انگوٹھے، زانو اور پیٹھ کے درد کی شکل میں ہوتا تھا۔ یہ درد اقبال کے لیے کسی اذیت سے کم نہ تھا۔ اقبال اس درد کو کم کرنے کے لیے پینے کی دوا بھی استعمال کرتے تھے اس کے علاوہ لنٹ کی پٹی کو ایک خاص لوشن میں بھگو کر درد کی جگہ پر رکھ لیتے تھے۔ اس درد کی وجہ سے اقبال کا بیٹھ کر کام کرنا قدرے مشکل ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی تو پوری رات کرب و بے چینی کی حالت میں گزر جاتی تھی۔ پٹی کو لوشن میں بھگو کر درد کی جگہ پر رکھنے سے کچھ راحت محسوس ہوتی تھی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس عارضہ کے متعلق مختلف خطوط کو شامل کیا ہے۔ یہاں ڈاکٹر تقی عابدی نے اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ درد نقرس کا علاج حکیم نابینا نے کیا تھا۔ صبا لکھنوی کا اقبال اور بھوپال میں یہ کہنا ہے کہ درد نقرس کا علاج دلی کے مشہور طبیب حکیم عبدالوہاب انصاری نے کیا غلط ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں۔

''صبا لکھنوی کا اقبال اور بھوپال میں یہ لکھنا صحیح نہیں کہ ۱۹۳۴ء میں نقرس کی شکایت نے شدت اختیار کر لی تو عرصے تک آپ نے دلی کے مشہور طبیب حکیم نابینا عبدالوہاب انصاری کا علاج کیا اور اس علاج کے سلسلے میں نذیر نیازی اقبال کی ہر ممکن خدمت کرتے رہے۔'' (۴۳)

نقرس کے درد کے متعلق ۱۸ دسمبر کو ڈاکٹر مظفر الدین کو اقبال خط میں لکھتے ہیں:

''معلوم ہوتا ہے کہ میرے جسم میں یورک ایسڈ کا مواد ہے جو کبھی نقرس کی شکل میں نمودار ہوتا ہے کبھی پیٹھ یا زانو کی تکلیف کی صورت میں۔ حملہ اگرچہ شدید نہیں ہوتا۔ تاہم کوئی مہینہ خالی نہیں جاتا جب یہ تکلیف نہ ہو۔'' (۴۴)

اسی طرح کا ایک اور خط بھی ڈاکٹر تقی عابدی نے درد نقرس کو واضح کرنے کے لیے شامل کیا ہے۔

''دوسری بات جو حکیم صاحب کی توجہ کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ

میرے انگوٹھے زانو یا جسم کے اور حصوں میں کبھی کبھی درد ہوتا ہے۔ یہ درد اگرچہ شدید نہیں ہوتا تاہم دو چار دن تکلیف ضرور دیتا ہے۔ ہر مہینہ میں ایک آدھ دفعہ ضرور ہوتا ہے۔"

۱۷ جنوری ۱۹۳۵ء کو سید نذیر نیازی کو لکھتے ہیں:

"مجھ کو چند روز سے نقرس کی شکایت ہے کل سے افاقہ ہوا ہے ابھی خفیف سا ورم پاؤں پر موجود ہے امید ہے دو چار روز تک دور ہو جائے گا۔" (۴۵)

ڈاکٹر تقی عابدی اقبال کے درد گردہ کے علاج پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اقبال نے درد نقرس کے علاج کے لیے بکری گائے کا گوشت کھانا یا تو کم کر دیا یا پھر بالکل بند کر دیا تھا۔ زیادہ تر مرغ اور مچھلی استعمال کرتے تھے۔ مولا گرامی کا نسخہ اور حکیم اجمل خان دہلوی کا علاج بھی رہا۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے مطابق اقبال نے درد نقرس کے لیے ایلو پیتھک دوائیں بھی استعمال کیں۔ مگر کسی سے افاقہ نہ ہوا۔ یہاں ڈاکٹر تقی عابدی نے حکیم اجمل خان کا ذکر کیا ہے کہ ان کی دوائی سے نقرس میں کچھ افاقہ ہوا ہے۔ اقبال مولانا گرامی کو ۲۳ مارچ ۱۹۲۲ کو لکھتے ہیں:

"میری حالت ابھی تک بدستور وہی ہے چلنے پھرنے سے قاصر ہوں۔ انگریزی دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آج حکیم اجمل خاں صاحب کی دوا شروع کی ہے جو کل دہلی سے آئی تھی۔ آج پندرہ روز ہو گئے کہ مکاں سے نیچے نہیں اُتر سکا اور ابھی خدا جانے یہ قید کتنے روز باقی رہے۔" (۴۶)

اب یہاں ڈاکٹر تقی عابدی نے اس خط کو شامل کیا ہے جو انہوں نے اس کتاب کے انتساب میں شامل کیا تھا۔ ۱۲ اپریل ۱۹۲۲ء کو مولانا گرامی کو خط میں لکھتے ہیں۔

"میں ابھی تک علیل ہوں مگر پہلے کی نسبت بہت افاقہ ہے۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مکمل صحت عطا فرمائے حکیم اجمل خان نے دہلی سے دوا بھیجی تھی مگر اس سے بھی کم فائدہ ہوا۔ کل گورداس پور سے حکیم صاحب خود بخود تشریف لے آئے تھے دوا دے گئے ہیں جس سے فائدہ معلوم ہوتا ہے میں تو

اپنے آپ کو اس درد کی وجہ سے رفتنی سمجھتا تھا مگر محض اس خیال سے تسکین بھی
کہ پاؤں کا درد ہے حرکت محال ہے رفتنی نہیں آمدنی ہوں۔" (۴۷)

ڈاکٹر تقی عابدی اور رانا غلام یٰسین نے ۳۰ جنوری ۱۹۳۲ء کو ایک خط شامل کیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ کو گرگابی پہننے سے بھی پاؤں کے جوڑوں میں درد ہوتا تھا۔

"خیال تھا کہ گوٹ کی تکلیف جو مجھے گزشتہ رات ہو گئی تھی۔ آج شام تک رفع ہو جائیگی میں نے اس کا علاج بھی کیا مگر اب گرگابی پہنی تو تکلیف بڑھ گئی۔ اس واسطے دہلی نہ جاسکوں گا میری طرف سے ورکنگ کمیٹی کی خدمت میں معذرت کر دیجئے" (۴۸)

صہبا لکھنوی اپنی کتاب اقبال اور بھوپال میں لکھتے ہیں کہ اقبال کا نقرس کا علاج بھوپال میں ہوا تھا۔ اور ڈاکٹر عبدالباسط نے خود برقی علاج کے ذریعے نقرس کو رفع کرنے کی کوشش کی تھی۔

"لیکن ۱۹۳۴ میں نقرس کی شکایت نے شدت اختیار کر لی تو عرصہ تک آپ نے دلی کے مشہور طبیب حکیم نابینا عبدالوہاب انصاری نے علاج کیا" (۴۹)

صہبا لکھنوی کے اس خیال کی بھی ڈاکٹر تقی عابدی نے تردید کر دی ہے کہ سید نذیر نیازی ان اوقات میں اقبال کے ساتھ رہے اور حکیم نابینا ان کو ڈاک کے ذریعے ادویات بھیجتے تھے۔ اور اقبال تین دفعہ بھوپال آئے اور ڈاکٹر عبدالباسط نے ان کا علاج کیا تھا۔

"بھوپال، کے قیام کے اور نقرس کے علاج کے سلسلے میں اقبال کے خصوصی معالج کی حیثیت سے ڈاکٹر عبدالباسط کا نام سرفہرست ہے۔" (۵۰)

ڈاکٹر تقی عابدی کا خیال ہے کہ صہبا لکھنوی کو کوئی مغالطہ ہوا ہے کہ درد گلو اور نقرس ایک ہی چیز ہے شاید اسی لیے انہوں نے بجلی کے علاج کا ذکر نقرس کے علاج کے طور پر بھی کر دیا ہے۔ اور ڈاکٹر عبدالباسط کا ذکر بھی غلطی سے کیا ہے۔ جب کہ درد گلو اور نقرس دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔

عارضہ درد گردہ

اقبال کو گردہ کا درد جوانی سے ہی تھا۔ وہ پہلی دفعہ ۱۹۱۷ء میں اس مرض میں مبتلا ہوئے تھے عبدالمجید سالک اقبال کے درد گردہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس سے قبل ایک دفعہ ۱۹۱۷ء میں بھی وہ اس مرض میں مبتلا ہوئے تھے۔ اب کے تکلیف کسی قدر زیادہ ہوئی۔ لالہ لاجپت رائے علامہ سے ملنے آئے تو ان کو مشورہ دیا کہ آپ حکیم نابینا صاحب دہلوی سے علاج کرائیے'' (۵۱)

ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی زندہ رود میں اقبال کے گردہ کے درد کی تائید کرتے ہوئے ایک ہی بات کا انکشاف کیا ہے۔

''پھر مدت تک درد گردہ کی شکایت رہی یہ مرض انہیں اپنی والدہ سے ورثے میں ملا تھا'' (۵۲)

جاوید اقبال نے زندہ رود میں ہی گردہ کے درد کے علاج کے متعلق بھی لکھا ہے کہ وہ حکیم نابینا کی دیسی۔ دوائی سے رفع ہوا تھا۔ اس لیے اس معاملے میں بھی کیوں نہ ان سے رجوع کیا جائے۔' یعنی آواز کے سلسلے میں بھی اقبال حکیم نابینا کی دوائی پر انحصار کرنے والے تھے۔ اسی طرح فقیر سید وحید الدین سے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ اقبال کو دیگر عوارض کے ساتھ ساتھ درد گردہ بھی ہوتا تھا۔

''پھر نقرس کا حملہ ہوا اور درد گردہ کی شکایت ہوئی''۔ (۵۳)

رانا غلام یٰسین اقبال کے درد گردہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب اقبال اور طب میں لکھتے ہیں۔

''علامہ اقبال کی علالت کا آغاز ۱۹۱۷ میں ہوا مارچ ۱۹۱۷ء میں گردے میں درد ہوا جو علاج کرانے سے ٹھیک ہو گیا۔'' (۵۴)

ڈاکٹر تقی عابدی نے ان تمام بنیادی کتابوں کو ماخذ بنا کر اقبال کے درد گردہ کا ذکر جا بجا اور مکمل جامعیت کے ساتھ کیا ہے۔ اور بہت سے ایسے خطوط کو حوالے کے طور پر پیش کیا ہے جو اقبال نے اپنے دوست احباب کو درد گردہ کی شکایت کے لیے لکھے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تقی عابدی نے درد

گردہ کا آغاز اقبال کے اس پہلے خط سے کیا ہے جس میں درد گردہ کا ذکر ہے۔ یہ خط ڈاکٹر تقی عابدی کے مطابق ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھا۔

''میں بوجہ عارضہ درد گردہ ایک ہفتہ تک صاحب فراش رہا۔ دو تین روز سے افاقہ ہوا۔ خدا نے فضل کیا مرض جاتا رہا میں باقی رہا۔'' (۵۵)

درد گردہ کی مدت کا تعین کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھے گئے ایک خط کا ذکر کرتے ہیں جو ۱۸ جولائی ۱۹۱۵ء کو لکھا گیا تھا۔

''مجھے درد گردہ کوئی دو سال سے ہوتا ہے پانچ چھ ماہ بعد وہی دورہ ہو جاتا ہے۔ اب کے خلاف توقع زیادہ عرصے کے بعد ہوا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ دورہ رخصت ہو گیا۔''

ڈاکٹر تقی عابدی نے خان محمد نیاز الدین خاں کے اس خط کو چوں مرگ آید میں شامل کیا ہے۔ جس میں اقبال نے درد گردہ کی بوجہ خود کو معذور محسوس کیا ہے۔ ۲۰ مارچ ۱۹۱۷ء کو خاں محمد نیاز الدین کو لکھتے ہیں:

''میں کئی دنوں سے بوجہ درِ گردہ مضمحل ہوں اس واسطے معذور ہوں۔'' (۵۶)

اقبال صوفی منش انسان تھے اور رمضان کا مہینہ ان کے لیے انتہائی عزت و احترام والا مہینہ ہوتا تھا۔ مگر درد گردہ کی بدولت ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو نیاز الدین نیاز کو لکھتے ہیں۔

''تین روزے رکھے تھے کہ درد گردہ کے دورے کی ابتداء محسوس ہوئی۔ دو روز سے روزے سے محروم ہوں'' (۵۷)

اقبال درد گردہ کے سلسلے میں حکیم نابینا سے رجوع کرنا چاہتے تھے لہٰذا ۲۲ جولائی ۱۹۳۷ء کو شیخ اعجاز احمد کو لکھتے ہیں۔

''حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کرنا ضروری ہے کہ کچھ دنوں سے میرے دونوں گردوں کی طرف ایک بوجھ سا رہتا ہے اور گزشتہ رات بائیں جانب کے گردے میں خفیف سا درد بھی محسوس ہوتا رہا جو اس وقت نہیں ہے۔ اسی بائیں جانب گردے میں دس سال ہوئے جب مجھے درد ہوا

تھا جب حکیم صاحب نے اس کا علاج کیا۔ دس سال تک ذرا سی کسک بھی محسوس نہیں ہوئی سوائے گزشتہ رات کے۔'' (۵۸)

اس خط سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں ایک تو اقبال کو درد گردہ دس سال کی طویل مدت کے بعد محسوس ہوا۔ کیونکہ حکیم نابینا کے علاج سے ان کو اتنا عرصہ تکلیف محسوس نہیں ہوئی تھی۔ دوسری بات یہ کہ اقبال اپنی تکلیف کی علامات بہت ہی تفصیل سے اپنے معالج کو بتاتے تھے یا لکھ کر بھیجتے تھے۔ اگر مریض اپنے ڈاکٹر کو پوری طرح اپنی بیماری کی وضاحت کر دے تو ڈاکٹر کی تشخیص کا کام قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ اور اقبال کے بہت سے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیماری کی علامات بہت ہی کھلے انداز میں بیان کر دیتے تھے۔ جس طرح ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے اک اک عوارض کے متعلق اپنی اس کتاب میں تفصیل کو سمویا ہے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں ایک اور خط ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر مظفر الدین کو لکھتے ہیں۔

''حکیم صاحب کی خدمت میں مندرجہ ذیل باتیں فوراً عرض کر دیجیے
۔ اوّل دس بارہ سال ہوئے جب مجھ کو درد گردہ ہوا تھا اور حکیم صاحب قبلہ نے اس کا علاج کیا تھا۔ اس طویل عرصے کے بعد گزشتہ رات بھی ۱۵ اور ۱۶ اکتوبر کی درمیانی رات کو پھر اس درد کا دورہ ہوا۔ دورہ شدید نہ تھا لیکن تمام رات اور دن کا کچھ حصہ بے چین رکھنے کے لیے کافی تھا۔ اس وقت کہ قریباً چار بجے ہیں مجھے افاقہ ہے۔ یہ دوا حکیم صاحب میرے لیے تیار فرمائیں اس میں اس امر کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔'' (۵۹)

ڈاکٹر تقی عابدی نے ایک ایسے خط کو بھی شامل کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے مجبوراً جدید طبی آلات کا استعمال بھی کیا جب درد گردہ سے افاقہ محسوس نہ ہوا۔ اقبال کو جدید طریقہ علاج سے چڑ تھی مگر اب بیماری کی تشخیص اور علاج کے لیے طب یونانی کام نہ کر سکتی تھی۔ ۱۵ جون ۱۹۲۸ء کو خاں محمد نیاز الدین خاں کو لکھتے ہیں:

''مجھے درد گردہ کی شکایت رہی جس کا سلسلہ ایک ماہ سے اوپر جاری رہا۔ جدید طبی آلات کے ذریعہ گردہ کا معائنہ کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ گردہ میں

پتھر ہے اور یہ کہ یہ عمل جراحی کے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ مگر تمام اعزاء اور دوست عمل جراحی کے خلاف ہیں۔ دورہ فی الحال رک گیا ہے۔ اور میں حکیم نابینا صاحب سے علاج کرانے کی خاطر آج شام دہلی جا رہا ہوں۔" (۶۰)

یعنی اقبال کو درد گردہ کے ساتھ ساتھ اب پتھری کی بھی شکایت ہو گئی تھی۔ اور پتھری کی اکسیر یونانی ادویات کے بجائے اب انگریزی طریقہ علاج سے ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ نومبر ۱۹۳۷ء کو مظفر الدین کو لکھتے ہیں:

"اس خط میں ایک پڑیہ ملفوف ہے جس میں وہ پتھر کا ریزہ ہے جو کل میرے پیشاب کے ساتھ خارج ہوا۔ حکیم صاحب نے جو دوا تقویت صلب کی ارسال فرمائی تھی اس پتھر کا اتنا جلدی خارج ہونا اسی دوا کا اعجاز معلوم ہوتا ہے۔ یہ پتھر کا ریزہ ان کو دکھا دیجئے۔ اور میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کیجئے۔" (۶۱)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس خط کی تاریخ کا ذکر نہیں کیا تھا جو میرے لیے کافی مشکلات کا باعث بنا میں نے بطور سکالر کلیات مکاتیب اقبال کی جلد چہارم میں اس خط کے متن کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی تاریخ ۲۷ نومبر ڈھونڈ نکالی۔ اقبال کو حکیم نابینا کے علاج کے طریقے پر اس قدر اعتماد تھا کہ ان کے خیال میں پشت کا درد ان کی دوائی کی بدولت پہلے کی نسبت کم ہو گیا تھا۔ اگر ہوتا بھی تھا تو بہت ہی قلیل مقدار میں صرف رات کو ہوتا تھا۔ دِن کو قطعاً نہیں ہوتا تھا۔ علامہ کا جسم چونکہ گردے کے درد اور پتھری کی وجہ سے نقاہت اور کمزوری کا شکار ہو چکا تھا۔ اس لیے اب جاڑے کی سردی برداشت کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ لہٰذا سردی لگتی اور ساتھ ہی بخار ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی لکھتے ہیں:

"علامہ کے مختلف خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں جاڑے کے ساتھ بخار ہو جاتا تھا یا بعض اوقات صرف جاڑا ہی محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ علامہ اس کو ملیریا سمجھ کر ایک دو گولیاں کونین کی کھا لیتے۔ اور تکلیف رفع ہو جاتی۔" (۶۲)

ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق گردے میں درد بھی پتھری کی وجہ سے رہنے لگا تھا۔ حکیم کی دوائی سے پتھر کے ٹکڑے مزید ٹکڑوں میں منقسم ہو جاتے اور پھر یورن کے راستے باہر خارج ہوتے

تھے تو علامہ اقبال کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اور یوں پتھری کی خراش سے خون پیشاب میں داخل ہو جاتا تھا۔ اس بیان کو واضح کرنے کے لیے اقبال نے سید نذیر نیازی کو ۱۵ اگست ۱۹۳۴ء کو خط لکھا اور ملیریا کی علامات بتائیں۔

''اس وقت چار بجے شام بدن ٹوٹ رہا ہے۔ بخار کی آمد آمد ہے چونکہ سردی محسوس ہوتی ہے اس واسطے معلوم ہوتا ہے ملیریا ہے۔ حکیم صاحب قبلہ کو مطلع کریں۔ نیز یہ بھی دریافت کریں کہ کونین کھالوں۔ آج صبح مجھے پیشاب بہت سرخ آیا تھا معلوم ہوتا ہے حکیم صاحب کی دوائیں بھی گرم مزاج ہیں۔'' (۶۳)

پھر ایک اور خط میں بھی اقبال ۱۶ اگست ۱۹۳۴ء کو سید نذیر نیازی کو یہ ہی لکھتے ہیں:

''کونین کھائی تھی بخار مجھے نہیں ہوا۔ الحمد اللہ'' (۶۴)

ڈاکٹر تقی عابدی کی پیشہ ورانہ تحقیقات کے مطابق اگر ان دو خطوط کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گردہ میں پتھری کی وجہ سے خون پیشاب میں شامل ہو گیا اور یوں پیشاب میں گرمی کا احساس اور سردی کا احساس، بدن درد اور سرخ رنگ کا پیشاب تھا۔ اس کا علاج صرف اور صرف آلات جدید کے ذریعے ممکن تھا۔ اور عمل جراحی سرجری کے بغیر ناممکن تھا۔ معالجین کا بھی کہنا تھا کہ گردے کی پتھری کا سائز بہت بڑا ہے۔ پتھری عام طور پر ٹکڑوں کی صورت میں مثانہ کے راہ خارج ہو سکتی تھی۔ مگر عام علاج سے اتنی بڑی پتھری کا گردے کی نالی اور مثانہ کی نالی سے خارج ہونا ممکن نہ تھا۔ اقبال کو بائیں طرف کے گردہ میں پتھری تھی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے گردہ میں پتھری کی ایک اور وجہ بھی بیان کی ہے۔

''اقبال کو نقرس (Gout) کی شکایت تھی جو یورک ایسڈ میں خون میں زیادتی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ میڈیکل اطلاعات کے مطابق تقریباً دس پندرہ فی صد افراد جنہیں نقرس ہوتا ہے ان کو گردہ کی پتھری کا عارضہ بھی ہوتا ہے۔ یعنی یورک ایسڈ خون میں زیادہ ہونے کی وجہ سے گردہ میں جمع ہو جاتا ہے اور اس طرح پتھری بن جاتی ہے۔'' (۶۵)

اقبال کو جن دنوں گردہ کا درد تھا انہیں دنوں میں وہ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے وائسرائے نے اقبال کو سر فضل حسین کے ایماء پر نامزد کیا تھا۔ اقبال جب انگلستان کے لیے روانہ ہوئے تو اس سے پہلے ۲۲ اگست ۱۹۳۱ء کو ایک خط والدہ جاوید سردار بیگم کے نام تحریر کیا یہ خط آج بھی یوسف صلاح الدین (میاں امیر الدین کے پوتے) کی تحویل میں ہے کیونکہ اقبال کو دردِ گردہ کی وجہ سے زندگی کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے وہ اپنے بچوں کو نصیحت اور وصیت کا فریضہ سرانجام دینا چاہتے تھے۔

"عرصہ دو تین سال کا ہوا جب میں دردِ گردہ کی وجہ سے بیمار ہو گیا اور زندگی کی امید منقطع ہو گئی تھی۔ لیکن خدا تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے صحت عطا کی۔ اس بیماری کے بعد میرے خیالات میں بڑا تغیر ہوا اور چند روزہ زندگی کی حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی۔" (٦٦)

یعنی اقبال کو زندگی کی امید ختم ہو گئی تھی اسی لیے انہوں نے اپنے بچوں کے نام ہزاروں روپے پورے انصاف کے ساتھ نیشنل بنک لاہور میں جمع کروا دیئے۔ اور اپنی موت کے بعد سردار بیگم کو ان کا گارڈین مقرر کر دیا۔ اگر اس خط کو تفصیل سے پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال زندگی سے کس قدر نا اُمید ہو چکے تھے اور یوں تفصیل سے وصیت لکھ رہے تھے جیسے ان کی زندگی کے آخری دِن چل رہے ہوں

"جاوید نامہ میں نے چھپنے کے لیے دے دیا ہے اور اس کے متعلق ضروری ہدایات منشی طاہر الدین اور چوہدری محمد حسین صاحب کو دے دی ہیں چونکہ یہ کتاب جاوید کے نام پر لکھی گئی ہے اس واسطے وہی اس کا مالک ہے۔ اس کی تمام آمدنی اخراجات اشاعت و طباعت نکال کر اسی کی ملکیت ہے۔" (٦٧)

اقبال کو آم بہت پسند تھے اور پھر گردہ کے مریضوں کے لیے آم ایک موثر پھل ہے۔ ایک خط میں اقبال محمد نیاز الدین کو باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ آم گردے کے مریضوں کے لیے ایک مقوی غذا ہے۔

''واقعی آم درد گردہ کے مریض کے لیے اچھا ہے اور مجھ کو اس سے بہت محبت ہے۔ کھانے کی چیزوں میں صرف یہی ایک چیز ہے جس کے لیے میرے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔'' (۶۸)

درد گردہ سے پہلے بھی اقبال آم کو بیحد پسند کرتے تھے ڈاکٹر جاوید اقبال نے خود اقبال کے ساتھ آموں کے باغات کی سیر کی وہ زندہ رود میں تحریر کرتے ہیں۔

''ابھی کل ہی کی بات معلوم ہوتی ہے جب وہ گرمیوں کے موسم میں دریائے راوی کے کنارے میاں نظام الدین کے آموں کے باغات میں راقم کو ساتھ لے کر جاتے ایک بڑے حوض کے قریب محفل جمتی۔ نل کے ٹھنڈے پانی سے بھرے ہوئے حوض میں صبح ہی سے ڈھیروں چوسنے والے آم ڈال دیئے جاتے اقبال کی پسندیدہ قسم ٹیپو تھا جس کا نام انہوں نے خود ہی رکھا تھا۔'' (۶۹)

آم کی پسندیدگی کے متعلق خالد نذیر صوفی اقبال درون خانہ میں بیان کرتے ہیں:

''آم ان کی سب سے بڑی کمزوری تھے۔ خواہ بیمار ہوں آم سے پرہیز ممکن نہ تھا۔ گرمیوں میں تقریباً روزانہ ہی اعلیٰ سے اعلیٰ اقسام کے آم منگوائے جاتے اور کام و دہن کو لطف اندوز کیا جاتا۔'' (۷۰)

اقبال آم کی تعریف بھی بہت خوبصورت انداز میں کرتے تھے:

''قدرت نے میووں کو ترقی دے کر انگور بنائے اور انگوروں میں جو کمی رہ گئی تھی وہ آموں کی تخلیق میں پوری کر دی۔'' (۷۱)

درد گردہ کے لیے بھی حکیم الامت کو حکیم نابینا سے مدد درکار تھی ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق اقبال کو ۱۹۲۸ء میں گردے کا شدید دورہ پڑا تو حکیم نابینا کی دوا روح الذہب سے علامہ کو آرام ہوا۔ یوں اقبال کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں۔

''افتخار قوم وملت علامہ اقبال مرحوم کے بائیں گردے میں اس قدر بڑی پتھری تھی کہ ایکس ریز دیکھ کر ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ گردہ اس کی

ضخامت کی تاب نہ لا کر پھٹ جائے گا۔ آپریشن اس کے لیے محال بتایا گیا تھا۔'' (۷۲)

جب آپریشن محال تھا تو کونسا طریقہ اختیار کیا جاتا جس سے گردہ بھی محفوظ رہتا اور پتھری بھی جسم سے باہر خارج ہو جاتی یوں حکیم نابینا کی روح الذہب کا استعمال کیا اور صرف ۲۴ گھنٹے میں پتھری بلا تکلیف ریزہ ریزہ ہو کر پیشاب سے خارج ہوگئی۔ خالد نذیر صوفی اقبال درون خانہ میں تحریر کرتے ہیں۔

''جب انہیں درد گردہ کی شکایت ہوئی تو معالجین نے تشخیص کی کہ رات کے فاقے کی بنا پر گردوں سے چربی بالکل ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے رات کا کھانا فوراً شروع کر دیا جائے۔ معالجین نے رات کے کھانے میں مرغ مسلم تجویز کیا۔ چند روز تو آپ نے اس پر عمل کیا لیکن چونکہ عادت نہ تھی اس لیے ہاضمہ خراب رہنے لگا۔'' (۷۳)

اتنی تکلیف میں بھی اقبال نے کبھی اللہ سے شکوہ نہیں کیا۔ غلام رسول مہر اقبال درون خانہ کے دیباچہ میں بہت خوبصورت واقعہ بیان کرتے ہیں۔ کہ گرمیوں میں اقبال کو ایک دفعہ گردے کی تکلیف ہوئی اور کئی روز تک بیمار رہے۔ اقبال میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کے پچھلے کمرے میں فرش پر ٹھنڈا پانی ڈلوا کر لیٹے ہوئے تھے۔ راقم پاس جا کر بیٹھا تو مجھ سے پوچھنے لگے۔

''مہر صاحب! تکلیف انسان پر اس کے نفس کی طرف سے آتی ہے یا اللہ کی طرف سے۔ میں جواب میں حدیث جبریل سے وہ الفاظ دہرا دینا چاہتا تھا جو رسول اکرمؐ نے قیامت کے سوال پر فرمائے تھے۔'' (۷۴)

یعنی میں خود کو اقبال سے بہت کم تر خیال کرتا تھا اور میرے پاس اتنا علم نہ تھا جتنا علامہ اقبال کے پاس تھا۔ لیکن میں ابھی سوچ میں ہی تھا کہ کسی نے جواب دے دیا کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔

''یہ سنتے ہی ان پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی پہلے چیخ نکلی پھر روتے روتے کہتے جاتے کہ ''اگر یہ تکلیف اللہ کی طرف سے ہے تو میری توبہ میری

توبہ۔ میری توبہ میں نے کیوں شکوہ کیا!'' (۷۵)

اقبال نے حکیم نابینا کے شکرانے کے طور پر چند اشعار بھی تحریر کیے تھے جب حکیم کی وجہ سے ان کو درد گردہ سے نجات حاصل ہوئی۔

ہے دو روحوں کا نشیمن قالب خاکی میرا
اک سراپا شورو مستی اک سراپا تاب و تب
ایک جو اللہ نے بخشی مجھے روز ازل
دوسری ہے آپ کی بخشی ہوئی روح الذہب
اس سے زیادہ اور کیا لکھوں میں اے لقماں ملک
رکھتا ہے بے تاب دونوں کو مرا حسن طلب

آواز کا بیٹھ جانا

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کی اس بیماری پر پوری طبی تحقیق کے ذریعے روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک ایسا معمہ ہے جو کسی سے حل نہ ہو سکا کیونکہ اس کے متعلق کوئی میڈیکل رپورٹ کوئی ایکس ریز (Biopsy) بایوپسی آف ٹشوز موجود نہیں ہے۔ پھر بھی ڈاکٹر تقی عابدی نے کچھ تحریری مواد کے ذریعے اس مرض کی تشخیص اور علاج کے مطابق تحقیق کی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

''علامہ کی آواز جنوری ۱۹۳۴ء میں انفلوئنزا ہونے کے بعد بیٹھ گئی اور پھر کبھی کبھار اس میں کچھ بہتری ہوتی لیکن انتقال تک آواز پوری طرح سے ٹھیک نہ ہو سکی۔ ہم پہلے آلہ صوت یا (Vocal card) کی اناٹومی اور اس کی کارکردگی پر روشنی ڈالیں گے۔'' (۷۶)

زندہ رور میں جاوید اقبال اس بیماری کی شروعات کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔ جب اقبال چوہدری محمد حسین، علی بخش اور جاوید اقبال کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر بادشاہی مسجد عید کی نماز ادا کرنے کے لیے گئے۔ اس دن کافی سردی تھی ہوا خوب ٹھنڈی چل رہی تھی مزید لکھتے ہیں

''اس روز خوب سردی تھی اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی سر پر ٹوپی تھی لیکن

پاؤں میں موزے شاید باریک تھے مسجد کے یخ بستہ فرش پر جوتوں کے بغیر
چلنے سے انہیں سردی محسوس ہوئی۔ گھر واپس پہنچ کر سویوں پر دہی ڈال کر کھایا
اگلے روز انفلوائنزا ہو گیا جو مختلف دوائیں کھانے کے باوجود تین ہفتوں تک
جاری رہا۔ جب تین چار گھنٹے کھانسی کا دورہ پڑا علاج کیا گیا چند دنوں بعد
انفلوئزا اور کھانسی کی شکایت تو دور ہو گئی لیکن گلا بیٹھ گیا اور ایسا بیٹھا کہ
ایلوپیتھک اور ریڈیائی علاج ہونے کے باوجود تکلیف رفع نہ ہوئی۔" (۷۸)

اقبال کو باقی تمام عوارض بھی وقتاً فوقتاً تنگ کرتے رہے اور کچھ علالت کی آخری رات تک ساتھ رہے۔ ان عوارض میں ایک آواز کا بیٹھ جانا بھی شامل تھا۔ تمام عوارض میں سے اقبال کو اس مرض سے کافی تشویش تھی کیونکہ اس کی وجہ سے اقبال کو سیاسی جلسوں اور تقریروں کا سلسلہ بند کرنا پڑا۔ وہ کبھی کھل کر یا بلند آواز سے بول نہ سکتے تھے۔ قرآن پاک کی تلاوت خوش الحانی سے نہ کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے گلے کی بیماری کی وجہ (Vocal card) میں خرابی بتائی ہے۔

"ووکل کارڈ (Larynx) کے اندر تنے ہوئے پردے ہوتے ہیں۔
اور ان کے تنگ اور ڈھیلے ہونے سے آواز پیدا ہوتی ہے انہیں حقیقی ووکل
کارڈ کہتے ہیں جن کے اعصاب یا نروکو Recurrent Laryngeal
Nerve کہتے ہیں۔ یہی نروکی وجہ سے ووکل کارڈ میں حرکت اور اسی
حرکت سے ہوا کی نالی سے خارج ہونے والی ہوا کی مدد سے آواز پیدا ہوتی
ہے۔" (۷۸)

یعنی ان کی تحقیق کے مطابق ووکل کارڈ اور نرو دونوں کا ہونا ضروری ہے اگر کسی خرابی کی وجہ سے یا نرو پر دباؤ کی وجہ سے نرو کام کرنا چھوڑ دے تو آواز بیٹھ جاتی ہے یا پھر مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ اور یوں علاج کے باوجود بھی اس میں بہتری کے امکاں نہیں ہوتے۔ دوسری طرف اگر ووکل کارڈ میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو بھی آواز پر اثر پڑتا ہے۔ اس ووکل کارڈ پر گروتھ یا ورم کینسر کا حملہ بھی ہو سکتا ہے۔ ٹیومر حلق کی نالی کو بھی تباہ کر سکتا ہے اور یوں یہ بیماری موت کا سبب بھی بن سکتی ہے زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''نذیر نیازی کو بتایا گیا کہ سینے وغیرہ کے ایکس ریز فوٹو کی بنیاد پر ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ دل کے اوپر کی طرف ایک نئی گروتھ (رسولی) ہو رہی ہے جس کے دباؤ سے ووکل کارڈ (آلہ صوت) متاثر ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک اس بیماری کا علاج یا تو ریڈیم سے ہوگا یا ایکس ریز سے اور یہ دونوں علاج یورپ میں ہو سکتے تھے۔''

اس رسولی کو ایکس ریز یا ریڈیم سے تحلیل کیا جا سکتا تھا۔ یہ گروتھ بڑھ کر پھیپھڑوں پر بھی دباؤ ڈال سکتی تھی۔ اور اگر اس کا علاج نہ کیا گیا تو اس سے زندگی کو خطرہ بھی لاحق ہو سکتا تھا۔ یہ ڈاکٹر ڈک ریڈیالوجسٹ نے سینے کا ایکس رے لینے کے بعد تشخیص دی تھی مگر بعد میں ڈاکٹر ڈک کی یہ تھیوری غلط ثابت کر دی گئی اور یہ کہا گیا کہ گروتھ نہیں بلکہ شاہ رگ کا ایک حصہ پھیل گیا ہے جس کو انورزم کہتے ہیں۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''چھ سات ماہ گزرنے کے بعد بالآخر ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچے کہ گروتھ ٹیومر یا رسولی کی تھیوری غلط ہے۔ کیونکہ اگر ایسی صورت حال ہوتی تو ان کی عام صحت اس قدر جلد ترقی نہیں کر سکتی تھی۔ بلکہ روز بروز بدتر ہوتی چلی گئی۔ سو اب ان کے خیال میں اقبال کا مرض شاہ رگ کا پھیلاؤ یا ورم تھا۔ جو خون کے بعض مادوں یا نفس کے زیادہ استعمال کے سبب پیدا ہو سکتا تھا۔'' (۸۰)

ٹیومر یا رسولی کے متعلق اقبال خود شبہ میں تھے دوسری طرف اس مرض کا علاج صرف ایلوپیتھک دواؤں کے ذریعے ممکن تھا۔ اقبال کا رجحان طب یونانی کی طرف تھا۔ اس لیے ان کو نذیر نیازی کی یہ تجویز پسند آئی کہ ایلوپیتھک علاج کے بجائے حکیم نابینا سے علاج کروایا جائے جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں۔

''حکیم نابینا نے اقبال کو دہلی آنے کے لیے کہا نتیجتاً وہ ۱۱ جون ۱۹۳۴ء کو دہلی پہنچے حکیم نابینا نے بڑی توجہ اور ہمدردی سے ان کا حال سنا پھر نبض دیکھی، نسخہ تحریر کیا دوائیں منگوائیں اور ضروری ہدایات دیں۔ ۱۲ جون ۱۹۳۴ء کو اقبال واپس لاہور آ گئے۔'' (۸۱)

مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آخری چار سالوں میں علامہ کی آواز میں بہتری بھی آئی۔ مگر سردی اور زکام کی وجہ سے صحت پھر خراب ہو جاتی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ نرو میں کوئی خرابی نہ تھی۔ نرو میں خرابی ہوتی تو کبھی ٹھیک نہ ہوتی۔ ڈاکٹر تقی عابدی کو انورزم کی تھیوری بھی ٹھیک معلوم نہیں ہوتی ہے۔

> ''جہاں تک انوزم کی تھیوری کا تعلق ہے وہ اس نرو پر دباؤ نہیں ڈال سکتا اس کے علاوہ خود انوزم کی تھیوری صحیح معلوم نہیں ہوتی ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ علامہ کی آواز بیٹھ جانے کی اصلی وجہ ووکل کارڈ کی خرابی تھی جیسا کہ ڈاکٹر زیلشر نے بھی اسے مقامی خرابی ہی کہا تھا۔'' (۸۲)

اقبال کی طبیعت میں بلغمیت بھی موجود تھی لیکن ذکر اقبال میں عبدالمجید سالک نے گلے کے متعلق ایک بات لکھی ہے۔

> ''طبیعت میں بلغمیت پہلے ہی سے تھی۔ گلا ہمشہ سے خراب تھا'' (۸۳)

کئی ایک دفعہ اقبال کو کھانسی کے دورے پڑتے کھانسی تو علاج کے ساتھ رفع ہو جاتی مگر گلا بیٹھ جاتا چنانچہ اقبال نے نذیر نیازی سے بات کی انہوں نے حکیم نابینا کا مشورہ دیا ڈاکٹروں نے معائنہ کے بعد متعدد نظریے قائم کیے لیکن حکیم صاحب اسی رائے پر جمے رہے کہ یہ ہلکا سا دمہ ہے۔ ذکر اقبال میں عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں۔

> ''لیکن حکیم صاحب اسی رائے پر جمے رہے کہ اعصاب میں نقاہت ہے۔ قلب میں ضعف ہے جگر میں حدت پیدا ہو گئی ہے ہلکا سا دمہ ہے بلغم کے انجماد کو ڈاکٹروں نے غلطی سے رسولی سمجھ لیا ہے۔'' (۸۴)

عبدالمجید سالک کے مطابق اقبال نے اس زمانے میں اپنے احباب کو کافی خطوط لکھے تھے کہ ان کو لندن یا ویانا جانے کے لیے کہا جا رہا ہے مگر وہ ہر مرض میں حکیم نابینا کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ وہ ان ممالک میں علاج کروانے کے لیے کافی پیسے کی ضرورت ہے۔ عبدالمجید سالک نے بھی اس بات کی تائید کی ہے کہ اقبال حکیم نابینا سے علاج کروانے کے لیے دہلی تشریف لے گئے تھے۔ اور آواز میں بہتری بھی نظر آ رہی تھی اور گویا طب یونانی کا معجزہ تصور کر رہے تھے۔ اور

علاج کے طور پر حکیم نابینا نے اقبال کو چڑے کا مغز یا خرگوش کا مغز کھانے کو کہا تو اقبال پر بہت ناگوار گزرا کہ انہوں نے تو کبھی پرندوں اور خرگوش کا مغز استعمال نہیں کیا۔ وہ اس کی جگہ دوائی تجویز کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ بلکہ ساتھ ہی حکیم نابینا کو مشورہ دیتے بھی دکھائی دیتے ہیں کہ خرگوش نر کی جگہ اگر کیمیاوی طریقے سے عرق تیار کر دیا جائے تو کیا دوا اثر انداز ہو سکتی ہے۔ نذیر نیازی کے حوالے کے ساتھ جاوید زندہ رود میں تحریر کرتے ہیں۔

''آواز کے لیے اکسیر کی طب یونانی تھی اور اصرار یہ تھا کہ حکیم صاحب اسے اپنے طبی ذوق کی گہرائیوں سے پیدا کریں یہ اس لیے کہ حضرت علامہ کے نزدیک وہ سرتاپا ایجاد ہیں۔ اس میں خلاقی ہے طباعی ہے۔ یہ اس کا اپنا ذوق ہے جو اس کی رہنمائی کرتا اور اس کو منزل مقصود تک لے جاتا ہے۔'' (۸۵)

اقبال یہ چاہتے تھے کہ حکیم نابینا ایسی دوا تیار کریں جو یونانی نسخے پر مبنی ہو۔ اور ایسے اجزاء پر مشتمل ہو جو اقبال کو پسند ہیں کبھی کسی کا مجرد یا آزمودہ نسخہ آزماتے اور کبھی کوئی ٹوٹکا استعمال کرتے نذیر نیازی کو اقبال ۱۴ جولائی ۱۹۳۴ء میں لکھتے ہیں۔

''مجھ کو بعض تجربہ کار لوگوں نے ہدایت دی ہے کہ گلے کے دونوں طرف جونک لگوائی جائے جراحوں کا ایک پرانا خاندان لاہور میں ہے وہ کہتے ہیں کہ ان کے پاس ایک لیپ ہے جو اس مرض کے مریضوں کے گلے پر لگایا جاتا ہے میں نے ان سے لیپ کے اجزاء دریافت کیے تو معلوم ہوا کہ چار قسم کے گوندوں سے بنا ہے جس کے اثر سے بلغم جل کر کافور ہو جاتی ہے۔ جراح کا یہی خیال ہے کہ آواز کی خرابی نزلے کی وجہ سے ہے وہ دعویٰ کرتا ہے کہ پانچ روز تک متواتر لگانے سے آواز میں بے حد ترقی ہوگی۔ بلکہ ممکن ہے کہ بالکل اچھی ہو جائے اور پھر کسی دوا لگانے یا کھانے کی ضرورت نہ رہے غرضیکہ اس کو بہت دعویٰ اس پر ہے۔ شہر کے لوگ جو ہمارے ہمدرد ہیں مجبور کر رہے ہیں میں نے سب کو یہی جواب دیا ہے کہ

حکیم صاحب کے مشورے کے بغیر کچھ نہ ہوگا۔" (۸۶)

اقبال کو لیپ اور جونکیں لگوانے کا مشورہ بہت پسند آیا تھا۔ مگر حکیم نابینا کو جونکیں لگوانے پر سخت اعتراض تھا مگر لیپ کے استعمال کی اجازت دے دی تھی اقبال نے اس لیپ کا استعمال کیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اسی طرح کا ایک اور خط جو ۱۸ ستمبر ۱۹۲۴ء کو اقبال نے نذیر نیازی کو لکھا جو ظاہر کرتا ہے کہ اقبال مقامی ٹوٹکوں کو بہت اہمیت دے رہے تھے۔

"ایک شخص جو خود اس بیماری کا مریض رہ چکا ہے عراق میں اسے ایک ترک طبیب نے تمباکو میں چرس رکھ کر پلائی تھی اور اس کے ساتھ پلٹن چائے جس میں شکر کی جگہ گڑ ڈالا جائے۔ اس نسخے سے اسے فائدہ ہوا اور تین چار روز کے عرصے میں اس کی آواز صاف ہوگئی۔ کہتا ہے شرطیہ علاج کرتا ہوں آپ حکیم صاحب سے اس کا ذکر کریں کہ آیا چرس کا استعمال آواز کے لیے مفید ہے۔" (۸۷)

حکیم نابینا نے اقبال کو اس ٹوٹکے کی بھی اجازت نہ دی مگر اقبال ہر طرح کے ٹوٹکے پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر لیتے تھے۔ پھر اقبال کو دہی اور لسی پینے کی عادت تھی۔ فالودہ بھی کھا لیتے تھے۔ اور یہ دونوں چیزیں آواز پر اثر ڈالتی ہیں۔ فالودہ ان کو بہت پسند تھا اقبال درون خانہ میں خالد نظیر صوفی تحریر کرتے ہیں

"فالودہ کو ہمیشہ "پھلودہ" بولتے۔ اگر والدہ جاوید فالودہ کہنے کے لیے کہتیں تو فرماتے "میری ماں نے تو مجھے یہی سکھایا ہے۔ میں اپنی ماں کی تعلیم فراموش نہیں کر سکتا۔" (۸۸)

اقبال کو جس رات انفلوئنزا کا دورہ پڑا اس دن اقبال نے عید سے واپسی پر سویوں پر دہی ڈال کر کھایا تھا۔ اور گلا بیٹھ گیا اور اس کے بعد کبھی ٹھیک نہ ہوا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے آواز کے بیٹھ جانے کی چار وجوہات بیان کی ہیں۔

(۱) "آواز کا شدید اور پر زور مصرف جو گویوں وغیرہ میں ہوتا ہے جس سے ووکل کارڈ پر دانے بن جاتے ہیں جس کو Singers Nodules کہتے ہیں۔

(۲) ووکل کارڈ ہی پر Warts and Polyps جو انہیں بے حرکت یا کم حرکت کر دیتے ہیں۔

(۳) ووکل کارڈ اور حلق کی نالی کا کینسر جو ووکل کارڈ کو تباہ کر دیتا ہے۔

(۴) (Hypothyrodism) تھائی رائیڈ غدود کی کم کارکردگی وغیرہ۔ڈاکٹر تقی عابدی نے ضعف قلب کے معاملے میں تمبا کونوشی کو اقبال کی صحت کے لیے مضر قرار دیا تھا۔یہاں بھی ان کا خیال یہ ہی ہے کہ ووکل کارڈ پر تمبا کو نوشی ہی اثر انداز ہوئی ہوگی۔تمبا کو نوشی کی وجہ سے (Polyps) کو نشو ونما ہوتی ہے۔(۸۹)

اسی طرح کا ایک اور خط اقبال ۳ فروری ۱۹۳۸ء کو ڈاکٹر مظفر الدین کو دوبارہ لکھتے ہیں:

"کیونکہ کہ بلغم کے اخراج نہ ہونے سے میری آواز پر نمایاں اثر پڑا ہے یعنی گلا بیٹھ گیا ہے۔ پہلے یہ تھا کہ بلغم کے ہر صبح اخراج ہو جانے سے آواز صاف رہتی تھی لیکن اس دوائی کے استعمال سے اخراج تو کم ہوتا ہے مگر آواز بیٹھ جاتی ہے۔" (۹۰)

ڈاکٹر تقی عابدی بیان کرتے ہیں:

"ہمارے خیال میں اقبال کے ووکل کارڈ پر تمبا کو نوشی کی کثرت سے (Polyps) کی نشو ونما ہوئی جن کے وزن اور مقامی خرابی کی وجہ سے تار ڈھیلے ہو گئے اور ان کی حرکت کم ہوگئی جن سے Hoarseness پیدا ہوئی چنانچہ جب کبھی حلق میں ورم زیادہ ہو یا باریک بلغم جو برونکائٹس کی وجہ سے ووکل کارڈ پر جم جاتی ہے تو اور بھی آواز کا نکلنا مشکل کر دیتی ہے۔" (۹۱)

اقبال کو برقی علاج سے کچھ بہتری محسوس ہوئی مگر پھر بد پرہیزی کی بنا پر اقبال کو سردی زکام اور کھانسی ہوتی تو طبیعت اور بھی خراب ہو جاتی تھی۔ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق اقبال کو جدید علاج میسر نہ تھا جو آج کل گلے کی بیماری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔آج کل ڈاکٹر اپنے کلینک میں مریض کی ناک کے سوراخ سے ایک باریک تار کا اسکوپ ڈال کر ایک منٹ کے اندر ووکل کارڈ کا معائنہ کر لیتے ہیں۔یوں آسانی سے ووکل کارڈ سے (Polyps) کو کھرچا جا سکتا ہے۔اور آواز

صاف ہو جاتی ہے۔ روزگار فقیر میں سید حیدر الدین بیان کرتے ہیں:

"ڈاکٹر صاحب کی علالت نے جب طول کھنچا تو سر راس مسعود نے ان کے علاج معالجہ کا بھوپال ہی میں معقول انتظام کیا ان دنوں ڈاکٹر صاحب کے گلے کی تکلیف بڑھ چکی تھی اور ان کی آواز اتنی نحیف اور مدھم ہو چکی تھی کہ دوسروں کی سماعت تک بڑی مشکل اور دشواری سے پہنچتی تھی۔" (۹۲)

صہبا لکھنوی کے مطابق اقبال بھوپال تشریف لے گئے تا کہ ان کا علاج جدید طریقے سے کیا جا سکے۔ بھوپال میں سر راس مسعود نے ان کو آنے کا مشورہ دیا تھا۔ ان کا قیام بھی ریاض منزل میں تھا۔ وہاں سر راس مسعود اور ان کی بیگم اقبال کے ہمدرد اور رفیق تھے۔ جو ہر وقت اقبال کی خبر گیری اور دیکھ بھال کے لیے مصروف رہتے تھے۔ بھوپال پہنچنے کے بعد راس مسعود نے ان کی طبیعت پر خصوصی توجہ دی اور حمیدیہ ہسپتال میں ان کا خصوصی طبی معائنہ کیا گیا۔ حمیدیہ ہسپتال کے متعلق صہبا لکھنوی لکھتے ہیں:

"حمیدیہ ہسپتال بھوپال کا بہترین ہسپتال تھا۔ جہاں ہر قسم کی سہولتیں فراہم تھیں ڈاکٹر سید عبد الرحمٰن جو بھوپال کے چیف میڈیکل آفیسر اور ہسپتال کے نگران تھے۔ اپنے فنی تجربہ اعلیٰ قابلیت اور ماہرانہ تشخیص کے لیے دور دور تک مشہور تھے۔ ڈاکٹر رحمٰن کے علاوہ حمیدیہ ہسپتال میں خان بہادر، ڈاکٹر احمد بخش، ڈاکٹر سلطان، ڈاکٹر یوس اور ڈاکٹر عبد الباسط وغیرہ بھی تھے۔ جو اپنی اپنی جگہ پر بہترین صلاحیت کے مالک تھے۔ ان کے علاوہ بھوپال میں افسر الاطباء حکیم سید ضیا الحسن اور حکیم سلطان محمود ایسے طبیب حاذق بھی تھے۔ چنانچہ ان سب حضرات نے مشاورت کے بعد تین دن تک مسلسل اقبال کا طبی معائنہ کیا تا کہ مرض اور علاج کی تشخیص سے قبل صحیح صورت حال کا اندازہ لگایا جا سکے۔" (۹۳)

صہبا لکھنوی نے اقبال کے بھوپال میں قیام و علاج کے سلسلے میں پیش رفت کو چند خطوط کے ذریعے ثابت کیا ہے۔ جو نذیر نیازی کو اپنی صحت کی تشفی کے متعلق لکھے گئے۔

ڈیئر نیازی صاحب۔ اسلام علیکم!

آپ کا خط ملا۔ الحمدللہ خیریت ہے۔ کھانسی کی شکایت اب باقی نہیں رہی۔ بھوپال کا موسم نہایت عمدہ ہے۔ اُمید ہے اس کا اثر صحت پر بہت اچھا پڑے گا۔ طبی معائنۂ کل ختم ہوا یہاں کے ڈاکٹر نہایت ہوشیار ہیں اور ہسپتال بھی نہایت عمدہ ہے طبی معائنہ سے جو نہایت مکمل تھا حکیم صاحب کی بہت سی باتوں کی تائید ہوئی۔ بہر حال آج گیارہ بجے سے Ultrs Violet Rays کا غسل شروع ہو گا جو ابتدا میں صرف ۷ منٹ روزانہ ہو گا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے والسلام۔ (۹۴)

یہ خط ۵ فروری ۱۹۳۵ء کو ع نذیر نیازی کو لکھا گیا۔

اقبال کا بھوپال میں علاج تو جاری تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ بھوپال کی خوشگوار فضا نے ان کی صحت پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ پھر ڈاکٹروں کی خصوصی توجہ سے اقبال بہت مطمئین تھے۔ گلے کے علاج کے لیے تین ماہ کا عرصہ درکار تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق اور صہبا لکھنوی میں ایک چیز کا فرق ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے مطابق اقبال کا برقی علاج چار دفعہ ہوا تھا۔ اور آواز میں قدرے فرق بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ صہبا لکھنوی لکھتے ہیں۔

> ''ابھی ان کا صرف چار مرتبہ بجلی سے علاج ہوا تھا۔ جس سے آواز میں نسبتاً فرق محسوس ہونے لگا تھا ڈاکٹروں نے مشورہ دیا تھا کہ کم سے کم ۸۔۱۰ مرتبہ بجلی کا علاج ہو جانے کے بعد اس کے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔'' (۹۵)

اقبال کے بھوپال میں قیام اور علاج کے متعلق روزگار فقیر میں سید وحید الدین بھی پہلے لکھ چکے تھے۔ برقی علاج کے متعلق ڈاکٹر تقی عابدی لکھتے ہیں:

> ''آواز کے بیٹھ جانے کے مسئلہ سے قبل کی بیماری اور خصوصاً ان کی آخری علالت کا سب سے اہم موضوع بنا رہا۔ اور مرض الموت کے جاں لیوا حملوں میں بھی اس کا احساس شدید رہا۔ اور اس کی وجہ سے حلق اور گلے کے ایکس ریز لیے گئے۔ آواز کے بیٹھ جانے کی وجہ سے بھوپال میں تین مرتبہ بجلی کا علاج ہوا۔'' (۹۶)

ڈاکٹر تقی عابدی کے نزدیک اقبال کا گلا اکثر خراب رہتا۔ کیونکہ اقبال کے گلے میں بلغم تھی۔ اور

جب تک بلغم کا اخراج نہ ہوتا۔ اقبال کو راحت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اور اس وقت تک آواز بھی صاف نہ ہوتی تھی۔ اور یہ عارضہ اقبال کو انتقال کے وقت تک رہا۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں۔

"خطوط اور اقبال کی میڈیکل ہسٹری کے بیانات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اقبال کا گلا صبح میں خراب رہتا اور جب تک باریک سفید بلغم خارج نہ ہوتی آواز صاف نہ ہوتی چنانچہ جب بھی نزلہ زکام کھانسی بخار اور انفلوئنزا یا گلو درد ہوتا تو آواز پر اثر انداز رہتا۔ لیکن کچھ دنوں یا ہفتوں میں آواز عود کر نارمل ہو جاتی مگر جنوری ۱۹۳۵ء میں جب آواز بیٹھ گئی تو پھر علاج کرنے کے بعد بھی آواز نارمل نہ ہو سکی۔" (۹۷)

اور یوں اقبال کی تمام سرگرمیاں رک گئی تھیں۔ وکالت تک چھوڑنی پڑی۔ انگریزی اور یونانی دوائیاں موثر ثابت نہیں ہو رہی تھیں۔ اور گلا بیٹھ جانے کے سبب اقبال جلسوں اور میٹنگوں میں نہیں جا سکتے تھے اور نہ ہی بلند آواز تقریر کر سکتے تھے۔ اسی عارضہ کے سبب اقبال نے وکالت ترک کر دی۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں۔

"اقبال کے دفتر آمدنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ گلے کی خرابی کے عارضے کے بعد کے سالوں میں ان کی آمدنی بحیثیت مجموعی کم ہو گئی۔ وکالت سے آمدنی بہت تھوڑی رہ گئی۔ ان کی انکم ٹیکس فائل کے مطابق ۱۹۳۵ء سے وکالت تو بالکل بند ہو چکی تھی اور اس شعبے سے آمدنی صفر تھی۔" (۹۸)

اقبال کا گھرانہ چونکہ مذہبی تھا۔ اور اقبال شروع سے قرآن خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے۔ اقبال دورن خانہ میں خالد نذیر صوفی تحریر کرتے ہیں۔

"آپ کی آواز بڑی صاف بلند پر سوز اور پُر وقار تھی علی الصبح قرآن حکیم کی تلاوت ان کا روز کا معمول تھا۔ وہ اس قدر خوش الحان تھے کہ سننے والے مسحور ہو جاتے۔ دل چاہتا تھا کہ یونہی تلاوت کیے جائیں اور آدمی سنتا رہے۔ قرآن مجید کی تلاوت کے دوران میں ان پر اس قدر رقت طاری ہو جاتی کہ وہ زار و قطار رونے لگتے۔ اور بعض اوقات اس قدر روتے کہ قرآن

پاک کے صفحات تر ہو جاتے۔" (۹۹)

لیکن گلے کی بیماری کے باعث اقبال قرآن پاک کی تلاوت بلند آواز اور خوش آہنگی سے نہیں کر سکتے تھے۔ جس کا اقبال کو بے حد غم تھا۔ اقبال ۲۳ جون ۱۹۳۴ء کو سید نذیر نیازی کو لکھتے ہیں:

"پچھلے ہفتے جو کسی قدر ترقی آواز میں ہوئی تھی دوسرے ہفتے میں اس پر کوئی اضافہ معلوم نہیں ہوا حالت وہی ہے جو پچھلے ہفتے کے آخر میں تھی۔ حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں مزید کہ بالعموم دن اور رات میں آواز بہتر ہوتی ہے طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت حالت کچھ بہتر نہیں ہوتی معلوم نہیں اس کا کیا سبب ہے۔" (۱۰۰)

کلیات مکاتیب اقبال میں اس خط کی صحیح تاریخ ۲۸ جون ہے۔

اسی طرح اقبال ۲۲ مئی ۱۹۳۴ء کو سید نذیر نیازی کو ایک خط تحریر کرتے ہیں:

"گلے کی شکایت تو ابھی باقی ہے مگر اب رفتہ رفتہ صحت کی طرف ترقی ہے اور یہ ترقی نمایاں طور پر کل ہی سے شروع ہے۔ علاج ڈاکٹر یار محمد صاحب کا ہے میں نے سنا ہے کہ ہندوستانی دواخانہ دہلی میں کوئی شربت ہے جو گلے کی بیماریوں کے لیے مفید ہے۔ اگر یہ بات درست ہو تو آپ وہاں سے ایک بوتل شربت بذریعہ وی پی میرے لیے بھجوائیں۔" (۱۰۱)

یہاں ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کا ایک ایسا خط شامل کیا ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ نقرس بھی گلے پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

۲۹ مئی ۱۹۳۴ء کو سید نذیر نیازی کو لکھتے ہیں:

"آپ حکیم نابینا صاحب کی خدمت میں پھر میری طرف سے حاضر ہوں اور بیماری کے حالات عرض کریں ڈاکٹر کہتے ہیں کہ گلے کے نیچے جو آلہ صوت ہے اس کا تار ڈھیلا ہو گیا ہے اس وجہ سے آواز بیٹھ گئی ہے چار ماہ تک علاج ہوا مگر کچھ خاص فائدہ اس سے نہیں ہوا۔ دردِ گردہ کا پھر دورہ نہیں ہوا۔ جب سے ان کا علاج کیا ہے آج چھ سال ہو گئے ہیں اس درد نے پھر

تکلیف نہ دی۔ البتہ نقرس کی شکایت کبھی کبھی ہو جاتی ہے بعض ڈاکٹر یہ کہتے ہیں کہ نقرس کا اثر گلے پر پڑ سکتا ہے۔" (۱۰۲)

اقبال کے خطوط کی روشنی میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اقبال کی آواز تقریباً (۵۲) باون مہینوں تک بیٹھ گئی تھی کبھی آواز میں تھوڑی سی بہتری محسوس ہوتی مگر آواز پھر سے بیٹھ جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اقبال علالت کے دوران مکمل طور پر مایوس ہو چکے تھے۔ اقبال درون خانہ میں وسیمہ بیگم بیان کرتی ہیں۔

"اقبال کی آواز بیٹھ چکی تھی وہ بڑے زور اور گلے پر دباؤ ڈال کر مشکل سے بات کر سکتے تھے۔ اس وقت ان کا چہرہ سرخ اور گردن کی رگیں پھول جاتی تھیں۔" (۱۰۳)

اقبال ۲ جنوری ۱۹۳۵ء کو سید نذیر نیازی کو تحریر کرتے ہیں:

"میری آواز کی حالت یہی ہے کہ کسی وقت تو بہت اچھی ہوتی ہے اور کسی وقت اچھی نہیں رہتی۔ بالعموم میں نے یہ نوٹس کیا ہے کہ دس بجے جو دوا پان میں کھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد آواز کسی قدر بیٹھ جاتی ہے۔ اس دوا کا اثر اچھا نہیں پڑتا۔ اس سے پہلے جو دوا پان میں کھائی جاتی تھی۔ اس کا اثر بھی اچھا نہ تھا۔" (۱۰۴)

وسیمہ بیگم اقبال درون خانہ کے توسط سے بیان کرتی ہیں۔ کہ شادی کے بعد جب میں چچا جان اور چچی جان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور دونوں ہی شدید بیمار تھے، چچا جان کو شدید گلے کا عارضہ لاحق تھا۔ اور آواز بھی تقریباً بند ہو چکی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ چچا اور چچی جان میری شادی میں شریک نہ ہو سکے۔ چچی جان مجھ سے مل کر شدید رونے لگ گئی اور چچا جان میرے پاس بیٹھ گئے۔ اور وہ بہت مشکل سے مجھ سے بات کر رہے تھے۔ کیونکہ جب بھی وہ بولنے کی کوشش کرتے تو ان کے گلے کی رگیں پھول جاتیں۔ اور چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ ان کو بولنے میں بہت تکلیف کا سامنا تھا اور بہت کوشش کرنے کے بعد چچا جان چند الفاظ بول سکے جو میری شادی میں شرکت نہ کرنے کی وجہ بیان کرنے کے متعلق تھے۔ اقبال سید نذیر نیازی کو ۲۲ جولائی ۱۹۳۴ء کو لکھتے ہیں:

''اگر میری آواز اپنی اصلی حالت پر عود کر آئی تو میں اپنی اس بیماری کو خدا کی رحمت تصور کروں گا کیونکہ اس بیماری نے حکیم صاحب سے وہ دوا استعمال کرنے کا موقع پیدا کیا جنہوں نے میری صحت پر ایسا نمایاں اثر کیا ہے۔ تمام عمر میں میری صحت ایسی اچھی نہ تھی جیسی اب ہے۔ مجھ کو اب صرف آواز کی وجہ سے بے اطمینانی ہے اور بس۔'' (۱۰۵)

درد گلو اور آواز کے علاج کے متعلق ڈاکٹر تقی عابدی مستند خطوط کا سہارا لیتے ہیں۔ ہر شخص کے نسخے کو آزمایا اور ٹوٹکے استعمال کیے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شود (۱۰۶)

ڈاکٹر تقی عابدی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تف بر تو اے چرخ اتنا اس برصغیر کی اذان صبح گاہی کی آواز کو دھیما کر دیا جو ملت کو خواب گراں سے جگا رہی تھی۔'' (۱۰۷)

اقبال ۶ جولائی ۱۹۳۴ء کو سید نذیر نیازی کو لکھتے ہیں:

''شملہ میں میرے ایک مہربان خواجہ حبیب اللہ ہیں وہ لکھتے ہیں کشمیر کی گل قند بشرطیکہ بہت پرانی ہو وکل کارڈ کی تقویت کے لیے اکسیر ہے پچاس سال پرانی گل قند خواجہ صاحب کے پاس موجود ہے مہربانی کر کے حکیم صاحب سے ذکر کریں اور ان سے پوچھیے کہ گل قند کے استعمال کے متعلق کیا مشورہ دیتے ہیں شہد کے استعمال کے متعلق بھی ہدایات معلوم کیجیے۔'' (۱۰۸)

چونکہ اقبال کے زیر استعمال بہت کی ادویات رہی ان میں ایک تازہ انجیر بھی شامل ہیں۔ ۲۲ جولائی ۱۹۳۴ء کو سید نذیر نیازی کو تحریر کرتے ہیں:

''تازہ انجیر کا انتظام ہو گیا ہے۔ ہر روز ملتان سے آجاتی ہے۔ اور انجیر بھی نہایت عمدہ کابل اور قندھار کی انجیروں سے بھی بہتر سردہ کا بھی انتظام ہو گیا ہے۔ مگر وہ اگست میں کابل سے آنا شروع ہوگا۔'' (۱۰۹)

یہاں اقبال سردہ کا ذکر کیا مگر اقبال کو اس سے بھی فرق نہیں پڑا۔

ان اجزاء کے علاوہ اقبال نے بادام، چلغوزہ اور مصری وغیرہ بھی کھائے ۱۱۔اکتوبر۱۹۳۶ء کو سید نذیر نیازی کو لکھتے ہیں:

''دیگر عرض یہ ہے کہ اب بہ نسبت سابقہ خفیف سی تبدیلی آواز میں ہوئی ہے۔ خدا کرے اس میں ترقی ہو۔ بادام تو روز کھاتا ہوں۔ چلغوزہ مصری کے ساتھ کھانے کے بعد پستہ چلغوزہ چند روز کھایا۔ بعدازاں خود بخود چھوٹ گیا۔ مجھے تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ بادام مع مصری پستہ چلغوزہ سے زیادہ مفید ہے۔ بہرحال اگر پستہ و چلغوزہ کا التزام بھی ضروری ہے تو کل سے پھر شروع کر دوں گا۔۔۔(۱۱۰)

حکیم نابینا نے اقبال کو پرندوں اور نر خرگوش کا مغز کھانے کا مشورہ دیا تھا۔اور اقبال کی طبیعت مغز کھانے کی طرف مائل نہ تھی۔ بکرے کا مغز بھی حکیم نے تجویز کیا تھا۔ جانوروں کا مغز پھر بھی کھایا جا سکتا تھا مگر پرندوں کا مغز کھانا اقبال کے لیے ناممکنات میں سے تھا۔اقبال ۱۱۹کتوبر۱۹۳۶ء کو نذیر نیازی کو تحریر کرتے ہیں:

''بادام ہر روز کھاتا ہوں باقی رہا خرگوش کا دماغ اس کے لیے دریافت کروں گا کہ کوئی طریقہ ایسا نکلے کہ کراہٹ نہ ہو۔ مغز عصفور کا جوہر کس طرح تیار کرتے ہیں۔ اگر تیار شدہ ممکن ہو تو اس کو میں استعمال ضرور کر لوں گا۔ حکیم صاحب یا کسی ڈاکٹر سے دریافت کر کے مطلع کریں'' (۱۱۱)

۱۱۴کتوبر۱۹۳۷ء کو پروفیسر مظفرالدین کو لکھتے ہیں:

''حکیم صاحب سے یہ بھی دریافت کیجئے کہ آیا سونے کے کشتہ کا استعمال میرے لیے مفید یا مضر ہے حکیم صاحب کے ایک دوست جنھوں نے دیر تک ان کے ساتھ کام کیا ہے یعنی شہزادہ غلام محی خان کشتہ طلاء کا استعمال میرے لیے مفید بتاتے ہیں اس کے علاوہ کشتہ یاقوت کا استعمال بھی وہ میرے لیے مفید بتاتے ہیں۔ میں نے ان سے یہی کہا تھا کہ حکیم صاحب

قبلہ کے مشورہ کے بغیر کوئی کشتہ استعمال نہیں کر سکتا۔" (۱۱۲)

ان تمام ادویات سے قطع نظر اقبال نے برقی علاج بھی کروایا۔ اور برقی علاج کروانے کے لیے اقبال بھوپال تشریف لے گئے۔ یہاں ڈاکٹر تقی عابدی کو صہبا لکھنوی کا اختلاف ہے۔ صہبا لکھنوی نے اقبال اور بھوپال میں یہ لکھا ہے کہ اقبال نقرس کے علاج کے لیے بھی بھوپال تشریف لے گئے۔ مگر ڈاکٹر تقی عابدی کا کہنا ہے کہ اقبال صرف گلے کے علاج کے لیے تین دفعہ بھوپال گئے تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

"یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ صہبا لکھنوی کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ بھوپال میں اقبال کا نقرس کا علاج ہوا۔ یہ سچ ہے کہ تمام عمر خفیف اور کبھی کبھار شدید نقرس کا درد ہوتا تھا لیکن بھوپال کے بجلی کے علاج یا ڈاکٹر عبدالباسط انصاری کے سینے کے ایکس ریز سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔" (۱۱۳)

اب ذرا صہبا لکھنوی کا بیان ملاحظہ ہو

"لیکن ۱۹۳۴ میں نقرس کی شکایت نے شدت اختیار کر لی۔ تو عرصہ تک آپ نے دلی کے مشہور طبیب حکیم نابینا عبدالوہاب انصاری کا علاج کیا اور اس علاج معالجہ کے سلسلے میں نذیر نیازی اقبال کی ہر مکمل خدمت کرتے رہے تھے۔ اسی سلسلے میں وہ اوائل ۱۹۳۵ء میں نواب بھوپال اور راس مسعود کی خواہش پر پھر بھوپال آئے اور بجلی کے ذریعے نقرس کا علاج شروع کرایا" (۱۱۴)

گلے کے علاج کے لیے اقبال نے یقیناً بھوپال کا سفر کیا اور یہ مختلف خطوط سے ظاہر بھی ہوتا ہے۔ مگر ڈاکٹر تقی عابدی کا اندازہ ہے کہ صہبا لکھنوی نے درد گلو اور نقرس کو ایک ہی بیماری سمجھ لیا ہوگا اس لیے بار بار اقبال اور بھوپال میں نقرس کا ذکر سفر بھوپال میں کر دیتے ہیں مگر ایسا نہیں ہے۔ اقبال کے سفر بھوپال کے متعلق ۱۱ مارچ ۱۹۳۴ء کا خط بنام عباس علی خان لمعہ ملاحظہ ہو

"آپ کی حسب خواہش ضرور بھوپال جا کر بجلی کے ذریعے علاج کراؤں گا" (۱۱۵)

پھر ایک اور خط میں اسی بات کا تذکرہ دوبارہ کرتے ہیں۔ یکم دسمبر ۱۹۳۴ء کو عباس علی خان لمعہ کو لکھتے ہیں

"جناب کی گراں قدر رائے کا شکریہ۔ انشاء اللہ بھوپال جاؤں گا اور بجلی کے علاج سے بھی استفادہ حاصل کروں گا۔ میں نے صحت کی مجبوریوں کے باعث ولایت جانے کا قصد ترک کر دیا ہے۔" (۱۱۶)

سید نذیر نیازی کو بجلی سے علاج کی اطلاع دیتے ہوئے جنوری ۱۹۳۵ء کو لکھتے ہیں:

"حکیم صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں کہ حالت میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ آواز بدستور ہے میں یہاں سے اس ماہ کے آخر میں بھوپال جاؤں گا۔ آپ کو پہلے مطلع کردوں گا۔" (۱۱۷)

بھوپال آنے کا مشورہ سر راس مسعود نے دیا تھا۔ سر راس مسعود اقبال کے بہت قریبی دوستوں میں تھے اور ان کی علالت کے متعلق بہت فکر مند تھے۔ سر راس مسعود کے بے حد اصرار پر اقبال نے بھوپال جانے کا فیصلہ کیا۔ اور یوں ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ء کو بھوپال چلے گئے۔ وہاں جا کر اپنے دوست احباب سے خط و کتابت جاری رکھی۔ برقی علاج سے اقبال کو کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے برقی علاج کا کورس تین ماہ کا ہے جو اقبال کو مکمل کرنا چاہیے۔ اقبال کے لیے اتنا عرصہ رکنا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ سردار بیگم کی حالت تشویش ناک ہوتی جا رہی تھی اور یوں اقبال بھوپال سے ۷ مارچ ۱۹۳۵ء کو واپس آ گئے۔ اقبال کو برقی علاج کے لیے دوبارہ بھوپال جانا تھا۔ ۱۹ مارچ ۱۹۳۵ء کو عرشی صاحب کو خط لکھتے ہیں

"میری صحت عامہ تو بہت بہتر ہو گئی ہے مگر آواز پر ابھی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ علاج برقی ایک سال تک جاری رہے گا۔ دو ماہ کے وقفے کے بعد پھر بھوپال جانا ہوگا۔" (۱۱۸)

اگر اس خط کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اقبال دوسری دفعہ کے لیے بھوپال روانہ ہونے والے تھے۔ اقبال ۱۳ جولائی ۱۹۳۵ء کو نذیر نیازی کو لکھتے ہیں:

"میں یہاں سے ۱۵ جولائی کی شام بروز سوموار روانہ ہو کر ۱۶ کی صبح

دہلی پہنچوں گا۔ وہاں تمام دن قیام رہے گا تا کہ جاوید دہلی دیکھ سکے۔ آپ
مجھ سے ریلوے اسٹیشن پر ملیں اور بھوپال کی گاڑی میں جو وہاں شام کو چلے گی
میرے لیے دو سیٹ سیکنڈ کلاس ریزرو کروا لیں۔" (۱۱۹)

دوسری دفعہ برقی علاج کروانے سے اقبال کی صحت پر اچھا اثر پڑا تھا اور ان کی آواز کچھ صاف معلوم ہو رہی تھی۔ لہٰذا ۱۵ اگست ۱۹۳۵ء کو شجاع الدین کو لکھتے ہیں:

"میں بغرض علاج بھوپال میں مقیم ہوں اور اگست کے آخر تک یہاں رہوں گا میری صحت عامہ پہلے کی نسبت بہت اچھی ہے اور آواز میں بھی کسی قدر فرق ہے۔ امید ہے کہ اس دفعہ کے علاج سے بہت فائدہ ہوگا۔" (۱۲۰)

اقبال ایک دفعہ پھر بھوپال سے واپس آ رہے تھے لہٰذا ۱۵ اگست ۱۹۳۵ء کو سید نذیر نیازی کو لکھتے ہیں۔

"آواز میں فرق ہے۔ امید ہے کہ اب کے علاج سے فائدہ ہوگا۔
میں غالباً ۲۶ یا ۲۸ اگست کو یہاں سے روانہ ہوں گا شاید ایک دفعہ پھر بھوپال آنا پڑے۔" (۱۲۱)

دوسری دفعہ بھوپال کا سفر اقبال کے لیے مفید ثابت ہوا تھا۔ جس نے اقبال کی صحت پر اچھا اثر کیا تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں

"بھوپال میں برقی علاج کے دوسرے دور نے اقبال کی صحت پر اچھا اثر ڈالا۔ یوں تو وہ علاج کے مسائل میں مصروف تھے لیکن شیش محل میں انہوں نے قرآن کریم پر نوٹس لکھنے کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ فکر اور استغراق میں ہمیشہ ڈوبے رہتے۔ جب بھی موقع ملتا اور طبیعت میں آمد کا نزول ہوتا تو شعر بھی کہتے"۔ (۱۲۲)

پانی پت کے جشن کا ذکر کرتے ہوئے عبدالمجید سالک ذکر اقبال میں تحریر کرتے ہیں:

"علامہ ہمیشہ ارادے باندھتے تھے کہ فلاں مہینے انگلستان جاؤں گا فلاں وقت ویانا جا کر علاج کراؤں گا۔ روڈس لیکچرز بھی ہو جائیں گے اور صحت کے متعلق بھی اطمینان ہوگا۔ لیکن اس دفعہ پانی پت کا سفر کیا تو معلوم ہوا کہ ان

میں کسی لمبے سفر کی زحمت برداشت کرنے کی اہلیت باقی نہیں۔" (۱۲۳)

زندہ رود میں جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

"نومبر ۱۹۳۴ء سے سر راس مسعود بھوپال میں وزیر تعلیم وصحت و امور عامہ کے فرائض انجام دے رہے تھے انہوں نے گلے کی تکلیف کے بارے میں اقبال کو بھوپال آکر بجلی کا علاج کرانے کی دعوت دی اقبال کے بعض احباب نے بھی یہی مشورہ دیا تھا بھوپال کے حمیدیہ اسپتال میں اس وقت بجلی کے علاج سے متعلق جدید ترین مشین نصب کی گئی تھیں۔ بالآخر سر راس مسعود کے اصرار پر اقبال نے بھوپال جا کر بجلی کا علاج کرانے کا ارادہ کر ہی لیا۔" (۱۲۴)

ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھوپال کی فضا نے اقبال کی طبیعت پر اچھا اثر کیا تھا۔ صبح مومن ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام، جمعیت اقوام مشرق اور مسولینی اسی قیام کے دوران اقبال نے لکھی تھیں ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں۔

"بھوپال کے علاوہ دہلی کا لال قلعہ، قطب مینار اور نظام الدین اولیاء کے مزار کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے اسی سفر کے دوران سروجینی نائیڈو سے بھی ملاقات رہی۔" (۱۲۵)

ڈاکٹر جاوید اقبال زندہ رود میں تحریر کرتے ہیں:

"اقبال کا قیام سر راس مسعود کی رہائش گاہ "ریاض منزل" میں تھا۔ جب وہاں پہنچے تو بیگم امت المسعود نے ان کا خیر مقدم کیا۔ ممنوں حسن خان کو اقبال کی پیشی میں مقرر کیا گیا تھا تا کہ کسی چیز کو ضرورت ہو تو اقبال انہیں اطلاع دیں۔" (۱۲۶)

یہاں ڈاکٹر جاوید اقبال نے ممنون حسن خان کی زبانی بہت ہی خوبصورت بات بتائی ہے۔

"کھانے کے بعد اقبال کا کمرہ دیکھنے گیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بستر جو سر راس مسعود نے اپنے مہمان عزیز کے لیے بچھوایا تھا اسے ان کے

ملازم نے اٹھا دیا تھا اور اس کی جگہ اقبال کا معمولی بستر لگا دیا تھا۔ میں نے جب دریافت کیا تو ملازم نے بتایا کہ اقبال کو ہمیشہ اپنے بستر پر ہی لیٹے دیکھا اور علامہ اقبال کے بستر پر دو کتابیں رکھی ہوئی تھیں ایک مثنوی مولانا روم اور دوسری دیوان غالب" (۱۲۷)

اقبال کو پرہیز کی عادت نہ تھی۔ یونہی اقبال برقی علاج کروانے کے بعد لاہور واپس آئے شدید بیمار ہو گئے۔ وہی کھانسی دمہ اور بلغم کی شکایت پھر سے شروع ہوگئی جس کا اثر گلے پر بھی پڑا۔ پانی پت میں جشن حالی منایا جا رہا تھا۔ اقبال نے صحت کو پس پشت ڈال کر جشن حالی میں شرکت کے لیے رخت سفر باندھ لیا پانی پت کی محفل سے لطف اندوز ہوئے مگر خود علالت کی وجہ سے شعر نہ سنا سکے۔ پانی پت کا یہ سفر اقبال کے لیے بالکل سودمند ثابت نہ ہوا تھا۔

زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

"۲۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اقبال مع چوہدری محمد حسین راجہ حسن اختر نذیر نیازی علی بخش اور راقم مولانا حالی کے صد سالہ جشن ولادت کی تقریبات کے لیے پانی پت پہنچے اور دو دن وہی قیام کیا۔ سر راس مسعود بھی بھوپال سے تشریف لائے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے مولانا حالی کے بے شمار شیدائی پانی پت پہنچے ہوئے تھے۔ اقبال نے پانی پت پہنچتے ہی حضرت شاہ بوعلی قلندر کے مزار پر حاضری دی۔" (۱۲۸)

ڈاکٹر جاوید اقبال زندہ رود میں تحریر کرتے ہیں:

"خواجہ غلام السیدین نے اعلان کیا کہ گلے کی خرابی کے سبب اقبال اپنے اشعار خود نہ سنائیں گے بلکہ کوئی اور صاحب ان کے اشعار سنائیں گے۔" (۱۲۹)

مگر اقبال سے یہ درخواست کی گئی کہ شعر گوئی کے دوران ڈائس پر تشریف لائیں یوں حالی مسلم اسکول کے ایک استاد نے خوش اسلوبی کے ساتھ یہ شعر پڑھ کر سنائے

مزاج نافہ راما نند عرفی نیک می بینم

چوں محمل راگراں بینم حدی را تیز تر خوانم

ڈاکٹر عبدالباسط اور سر راس مسعود کو بھوپال آنے کے لیے مجبور کر رہے تھے۔ ۳ مارچ ۱۹۳۶ کو سید نذیر نیازی کو لکھتے ہیں:

''میں انشاء اللہ ۱۹ اپریل کی شام ساڑھے سات بجے لاہور پہنچ جاؤں گا۔'' (۱۳۰)

اقبال نے جب بھوپال کا تیسری دفعہ دورہ کیا تو دلچسپ اور روحانیت سے بھرپور واقعہ ان کے ساتھ پیش آیا۔ چنانچہ اس واقعہ کے متعلق اقبال ۲۹ جون ۱۹۳۶ء کو سر راس مسعود کو لکھتے ہیں:

''۲۔ اپریل کی شب کو جب میں بھوپال میں تھا۔ میں نے تمہارے دادا رحمتہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضور کی خدمت میں عرض کر۔ میں اسی وقت بیدار ہو گیا فوراً کچھ شعر یادداشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے۔ کل ساٹھ شعر ہوئے لاہور آ کر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے اگر یہی زیادہ بڑی مثنوی کا آخری حصہ ہو جائے تو خوب ہو۔ الحمدللہ'' (۱۳۱)

اقبال کا رجحان شروع سے ہی مذہب کی طرف بہت زیادہ تھا۔ یہ ان کو اپنے والد اور والدہ سے ورثہ میں ملا تھا۔ اگر مثنوی میں ''پس چہ باید کرد'' کا مطالعہ کیا جائے تو ''حضور رسالت مآب'' کے شعر اسی بات کی غمازی کرتے ہیں۔

کار این بیمار نتواں بردبیش
من چوں طفلاں نالم از داروی خویش
عدر نسازد با دوا ہا جان زار
تلخ و بویش برمشامم ناگوار
با پرستاران شب دارم ستیز
باز روغن در چراغ من بریز

ڈاکٹر تقی عابدی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''یعنی بیماری سے چھٹکارا نہیں اور بچوں کی طرح کڑوی دواؤں سے گھبراتا ہوں۔ میں تاریکی پھیلانے والوں سے لڑ رہا ہوں کچھ اور تیل میرے چراغ میں ڈال دے۔'' (۱۳۲)

لیکن برقی علاج کے بعد بھی اقبال کی آواز صاف نہ ہو سکی۔ یوں اقبال ۸۔ اپریل ۱۹۳۶ء کو برقی علاج کا آخری کورس ختم کر کے اسی روز بھوپال سے ۱۹۔ اپریل ۱۹۳۶ء کو لاہور واپس پہنچ گئے۔

اسی واقعے کو ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی زندہ رود میں یوں نقل کیا ہے۔

''گلے کے بیٹھ جانے کے متعلق پہلی سی بے چینی نہ رہی تھی۔ آواز میں ترقی کے بارے میں مایوس تھے۔ ۱۳۔ اپریل ۱۹۳۶ء کی رات کو شیش محل میں سو رہے تھے کہ سر سید احمد خان کو خواب میں دیکھا وہ پوچھتے ہیں تم کب سے بیمار ہو۔ جواب دیا دو سال سے اوپر مدت گزر گئی۔ فرمایا حضور رسالتؐ کی خدمت میں عرض کرو۔ اسی وقت ان کی آنکھ کھل گئی اور حضور کی خدمت میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے کی خاطر اشعار ان کی زبان پر جاری ہو گئے اس عرض داشت نے بالآخر ان کی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' کی صورت اختیار کی۔'' (۱۳۳)

تبخیرِ معدہ

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے عوارض کا ذکر کرتے ہوئے تبخیرِ معدہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ تبخیر معدہ کی تکلیف کی وجہ تقی عابدی نے مرغن غذا اور شلغم اچار بتائی ہے۔ اقبال درون خانہ میں خالد نظیر تبسم بیان کرتے ہیں:

''ہر قسم کا اچار انہیں بہت پسند تھا۔ خاص طور پر شلغم کا اچار بہت مرغوب تھا۔ فرمایا کرتے اچار شلغم ایک نعمت ہے۔ آم کا اچار جب ڈالا جاتا تو خاص طور پر ان کی ہدایت ہوتی کہ آم کی گٹھلی کے اندر کا گودا رہنے دیا جائے کیونکہ انہیں یہ بہت پسند تھا اور اچار کی پھانک کے ساتھ گودا بھی بڑی

رغبت سے کھایا کرتے تھے۔" (۱۳۴)

اقبال دہی لسی اور فالودہ کا استعمال بہت زیادہ کرتے تھے کیونکہ یہ تبخیر معدہ کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ مگر اقبال سوڈے کا استعمال بھی کثرت سے کیا کرتے تھے جو معدہ کے لیے مضر ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ تمباکو نوشی کا استعمال بھی تبخیر معدہ کے لیے ٹھیک نہیں تھا۔ تبخیر معدہ کی ایک اور وجہ دواؤں میں کشتہ کی ملاوٹ تھی۔ ڈاکٹر تقی عابدی کشتہ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

"عجب نہیں کہ اقبال کی ہر روز یونانی اور ایلو پیتھک دوائیں معدہ کی دیوار کو متورم کر کے تبخیر پیدا کر دیتی ہوں۔ اقبال کی کئی دواؤں میں کشتہ، ملا ہوتا جو کچی دھات یا ان کے مرکبات سے بنا ہوتا جدید تحقیقات میں یہ تمام مرکبات اگر زیادہ مقدار میں ہوں تو مضر ہوتے ہیں تبخیر معدہ کی وجہ سے اقبال کا معدہ کمزور ہو چکا تھا۔ ان کی بھوک مر چکی تھی۔ اور ان کی خوراک بھی کم ہو چکی تھی۔" (۱۳۵)

ڈاکٹر تقی عابدی نے تبخیر معدہ کے متعلق ۲۳/ مارچ ۱۹۳۵ء کا ایک خط بھی شامل عنوان کیا ہے۔ جو محمد عباس علی خان لمعہ کو لکھا گیا۔

"یہاں اب گرمی شروع ہو چکی ہے ایسے موسم میں علی العموم میرا معدہ اور بھی خراب ہو جاتا ہے۔ آپ کا خیال بہت درست ہے اور میرا بھی یہی تجربہ ہے دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا مجھ کو تعلیل غذا مفید ہوتی ہے۔" (۱۳۶)

اقبال چونکہ ترشی کا استعمال بہت زیادہ کرتے تھے لیکن معدہ کی تبخیر کی وجہ سے اب ترش غذا کا استعمال کم ہونے لگا تھا۔ اقبال ۲۷/ جون ۱۹۳۶ء کو پروفیسر الیاس برنی کو لکھتے ہیں:

"دودھ بالائی دہی اور ترشی کے استعمال کا عادی تھا چوں کہ دو سال سے ترشی کا استعمال نہیں کر سکتا اس لیے میرا کھانا بالکل بے لطف ہو گیا ہے۔ بھوک بھی کم لگتی ہے۔" (۱۳۷)

۱۲۔ جولائی ۱۹۳۶ء کو پروفیسر الیاس برنی کو لکھتے ہیں:

''ترشی میں ابھی تک نہیں کھا سکتا ہوں ہاں دہی اگر میٹھا ہو تو کسی قدر کھالیتا ہوں'' (۱۳۸)

ریح کا عارضہ اور قبض

ریح کے عارضہ کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

''علامہ اقبال کا گوارشی نظام جوانی سے درہم برہم تھا۔ معدہ کی تبخیر ہمیشہ رہتی اور سوڈے کا استعمال کرنے سے قولج یا (Colitis) کے دورے بھی شدید ہوئے۔ ہمیشہ قبض کی شکایت کبھی کم اور کبھی زیادہ رہی۔ آخری علالت کے دوران بھوک بھی نہیں لگتی تھی اس کے علاوہ ریح کی تولید اور درد کا تذکرہ کئی خطوط میں نظر آتا ہے جو اس شکایت پر مزید روشنی ڈالتے ہیں۔'' (۱۳۹)

اقبال نے ۲۔ جنوری ۱۹۳۵ء کو سید نذیر نیازی کو لکھا:

''ریح کا اخراج پہلے کی نسبت کم ہوتا ہے ممکن ہے اخراج ریح نہ ہونے کی وجہ سے یہ درد ہو'' (۱۴۰)

ایک اور خط جو سید نذیر نیازی کو ۵۔ جنوری ۱۹۳۵ء کو لکھا گیا۔ اقبال تحریر کرتے ہیں:

''شانوں کے درمیان رات کو درد ہوتی ہے جس سے نیند میں خلل واقع ہوتا ہے اگر ریح کا اخراج ہوتا رہے تو درد سے افاقہ رہتا ہے۔'' (۱۴۱)

۲۰۔ مئی ۱۹۳۷ء کو شیخ اعجاز احمد کو تحریر کرتے ہیں:

''ا۔ اپریل ۳۷ کے ابتداء میں جب حکیم صاحب سے ملا تھا۔ تو انہوں نے فرمایا تھا۔ کہ تمہارا جگر ریح پیدا کرتا ہے۔ اب اس کا علاج ضروری ہے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک معجون عطا فرمائی تھی۔ چند خوراک باقی ہے اگر اسی کو جاری رکھنا ہو تو اس کے مقدار بھی کافی ارسال کر دیں مگر بیشتر اس کے لیے حکیم صاحب قبلہ اسی معجون کے استعمال کا حکم دیں یا اس میں کوئی ترمیم کریں۔'' (۱۴۲)

اس خط میں اقبال نے اپنی بیماری کی مکمل وضاحت بھی حکیم صاحب کو ارسال کی۔ اقبال اپنی بیماری کے متعلق ہر علامت اپنے معالج کے سامنے رکھ دیتے تھے۔

(۱) ''جگر بدستور ریح پیدا کر رہا ہے اس میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوئی۔ غالباً یہ معجون موثر نہیں ہوئی۔''

(۲) ریح کا پیدا ہونا

ریح جو پیدا ہوتی ہے جب تک نہ نکلے کمر میں درد رہتا ہے۔ اور دونوں طرف کے گردوں پر بوجھ سا محسوس ہوتا ہے۔ نکل جائے تو درد میں تخفیف ہوتی ہے۔'' (۱۴۳)

اقبال کو قبض کی کیفیت ہمیشہ سے تھی اور علالت کے آخری دنوں میں یہ کیفیت زیادہ تکلیف دہ ہو گئی تھی۔ پھر علالت کے دنوں میں اکیسروں معجونوں گولیوں اور جوشاندوں کا استعمال نے بھی طبیعت پر اثر کیا تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

''اقبال کی خوراک سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سبزیات کی نسبت گوشت زیادہ کھاتے تھے۔ دودھ لسی، دہی اور دوسری قبض آور غذاؤں کے شوقین تھے۔ اقبال کی بھتیجی وسیمہ مبارک کے قول کے مطابق پانی کم پیتے تھے چنانچہ یونانی دواؤں کا اثر یہ ہوا کہ اقبال کی قبض کو دور کرنے میں مجرب ثابت ہوئی ہیں۔ اور آج کے اس ترقی یافتہ ایلوپیتھک دور میں بھی ایک بڑی تعداد میں لوگ یونانی دوا کا استعمال کرتے ہیں:'' (۱۴۴)

قبض کے مرض کے متعلق بھی اقبال کے خطوط کو ڈاکٹر تقی عابدی نے حوالے کے طور پر پیش کیا ہے۔ ۱۱۔ اگست ۱۹۳۴ء کو اقبال نے سید نذیر نیازی کو لکھا:

''پہلے کسی قدر قبض تھی مگر پاخانہ کی حالت بہت اچھی تھی اب مجھے صبح پاخانہ کھل کر آتا ہے۔ مگر بہت نرم تر تقریباً دست شاید جو دوا رات کو کھائی جاتی ہے وہ دست آور ہے۔ دن کے وقت انجیر بھی ہر روز ملتان سے منگوا کر کھاتا ہوں وہ بھی قبض کشا ہوتی ہے۔'' (۱۴۵)

اسی طرح کا ایک اور خط بھی ڈاکٹر تقی عابدی نے قبض کے عارضے کے متعلق شامل کیا ہے۔

اقبال ۲۹۔ ستمبر ۱۹۳۴ کو سید نذیر نیازی کو لکھتے ہیں:

"دوا کا استعمال شروع ہوا ہے میں صبح کو بٹیر اور شام کو تیتر کھاتا ہوں۔ سبزی کا استعمال بہت کم کر دیا ہے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پاخانہ سدہ بن کر گھٹلیوں کی طرح آتا ہے اس واسطے میں نے دریافت کیا تھا کہ آیا حکیم صاحب نے دوا میں قبض کا خیال رکھا ہے یا نہیں۔" (۱۴۶)

۲۷۔ جون ۱۹۳۶ء کو پروفیسر الیاس برنی کو لکھتے ہیں:

"قبض کی بھی شکایت رہتی ہے۔" (۱۴۷)

۲۷۔ ستمبر ۱۹۳۶ء کو مولوی عبدالحق کو لکھتے ہیں:

"پہلے سے اچھا ہوں مگر افسوس کہ ابھی سفر کے لائق نہیں۔ خصوصاً جب کہ سفر ۱۲ گھنٹے سے زیادہ ہو۔ رات بھر ریل میں سفر کرنے سے مجھے قبض ہو جاتی ہے۔ جو سخت تکلیف دیتی ہے اور یہ سلسلہ کئی کئی دن رہتا ہے۔" (۱۴۸)

ڈاکٹر تقی عابدی نے ڈاکٹر مظفر الدین کے نام لکھے گئے اقبال کے دو خط بھی شامل کیے ہیں جو مختصر ضرور ہیں لیکن اقبال کے عارضے کو واضح کرتے ہیں ۲۹ مارچ ۱۹۳۸ء کو ڈاکٹر مظفر الدین کو لکھتے ہیں:

"اس شکایت کے علاوہ دوسری شکایت یہ ہے کہ اجابت با قاعدہ اور کھل کر نہیں ہوتی۔" (۱۴۹)

یہ خط ۳۱۔ جون ۱۹۳۸ء کو ڈاکٹر مظفر الدین کو لکھتے ہیں

"قبض کی شکایت بھی عموماً رہتی ہے۔" (۱۵۰)

درد قولنج

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کی چار تکلیفیں اور بڑی بیماریوں کا ذکر کیا ہے جس میں ایک درد قولنج ہے۔ درد قولنج کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں

"قولنج عربی لفظ ہے جس کا مصدر قون ہے۔ غالباً انگریزی میں یہ لفظ

عربی سے لیا گیا ہے۔ درد قولنج سے مراد پیٹ کا درد، بڑی آنت کا درد، وہ درد جو پسلی کے نیچے ہوتا ہے بعض اوقات کیسہ صفر کے درد کو بھی قولنج کا درد کہا جاتا ہے۔" (۱۵۱)

درد قولنج کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی نے سید نذیر نیازی کی کتاب اقبال کے حضور کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس میں سید نذیر نیازی نے اقبال کی اس بیماری کے متعلق ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔

"۱۱۔ مارچ ۱۹۳۸ء بروز جمعہ کو میں نے خیریت مزاج دریافت کی اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ حضرت علامہ نے حسب معمول فرمایا الحمد اللہ پھر اپنی صحت اور علالت کا ذکر کچھ اس طرح کرنے لگے کہ اس میں یاس وحزن کا رنگ غالب تھا ارشاد ہوا مجھ پر چار حملے ہو چکے ہیں ایک قولنج کا دورہ جو آج سے بہت پہلے بڑی شدت کے ساتھ ہوا تھا۔ پھر ۱۹۲۸ء میں درد گردہ نے خاصا پریشان کیا ۱۹۳۴ء میں گلا بیٹھ گیا اور اب چند دنوں سے جو حالت ہے اچھی نہیں ہے۔" (۱۵۲)

درد قولنج کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی نے مہاراجہ کشن پرشاد کو ۷ ستمبر ۱۹۱۷ لکھا گیا ایک خط شامل کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ مولانا گرامی کو بھی اس بیماری کے متعلق چند ایک خطوط لکھے گئے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر تقی عابدی نے خود اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اس بیماری کے متعلق چند ایک خطوط کے علاوہ زیادہ مواد نہیں مل سکا۔ اقبال لاہور سے ۷ ستمبر ۱۹۱۷ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں:

"بندہ درگاہ اقبال ۳۰ اگست کی شام کو یہاں سے روانہ حیدر آباد ہونے والا تھا کہ ۲۹ کی شام کو بخار نے آ دبایا اور اس کے ایک دو روز بعد پیچش کا اضافہ ہوا ہفتہ بھر سخت تکلیف کا سامنا رہا۔ ڈاکٹر صاحب ایک ہفتہ تک اجازت نہیں دیتے اور میں نے بھی صحت کے خیال سے یہ بہتر سمجھا کہ سفر حیدر آباد ملتوی کر دوں" (۱۵۳)

اقبال ۱۱۶ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو مولانا گرامی کو لکھتے ہیں:

"میں حیدر آباد جانے کو تھا مگر بخار کی وجہ سے رک گیا۔" (۱۵۴)

۱۶۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کو اقبال نے لکھا

"حیدر آباد کے سفر کے لیے تیار تھا مگر علالت کی وجہ سے رک گیا جیسا کہ ایک عریضہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔" (۱۵۵)

ڈاکٹر تقی عابدی نے جو خط مولانا گرامی کے نام سے یہاں شامل کیا ہے جس میں دوا روانہ کرنے کا ذکر ہے۔ وہاں بیماری کا ذکر نہیں ہے کہ کس بیماری کے لیے انہوں نے مولانا گرامی کو خط روانہ کیا تھا۔ درد قولج کا ذکر بھی نہیں گیا گیا۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر تقی عابدی درد قولج کے متعلق ایک تحقیقی بات کو بھی بیان کیا۔

"اس بات کا امکان ہے کہ علامہ کو Dysentry یا پیچش ہوگی ہو جو پہلے خفیف اور بعد میں شدید صورت اختیار کر لی ہو جس کا اقبال نے مجرب علاج کروایا جیسا کہ اوپر کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے اور اسی لیے یہ تکلیف برطرف ہوگئی ورنہ اقبال اس کا ذکر ضرور کرتے۔" (۱۵۶)

دانتوں کی بیماری

علامہ محمد اقبال کو باقی بیماریوں کے ساتھ دانتوں اور مسوڑھوں کی بیماری بھی رہی اقبال کی زندگی کے آخری پندرہ سالوں میں لکھے گئے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو مسوڑوں کی بیماری جوانی سے ہی تھی۔ کیونکہ اقبال انگریزی مصنوعات کا استعمال بہت کم کرتے تھے اس طرح انگریزی برش یا Tooth Past کی جگہ وہ مسواک اور منجن کا استعمال کرتے تھے۔ کیونکہ یہ اسلامی طریقہ عمل تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

"(Gingivitis) یا مسوڑوں کے پھول جانے میں دانت اور مسوڑے کے درمیان جراثیم اور بعض اوقات غذا دوا یا منجن کے ذرات پھنس جاتے ہیں اور انفیکشن کی وجہ سے مسوڑہ پھول کر تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح کے حملے دانتوں کی جڑوں کو کمزور کر دیتے ہیں اور جراثیم کے مسلسل ترشحات سے دانت میں سوراخ ہو جاتے ہیں۔" (۱۵۷)

ڈاکٹر تقی عابدی نے کچھ خطوط کو اس ضمن میں شامل کیا ہے ان خطوط سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے پیچھے کے چبانے والے دانت نکلوا دیئے تھے مگر خراب دانتوں کی جگہ مصنوعی دانتوں کا ذکر کہیں نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اقبال آخری عمر تک مسواک اور منجن کا استعمال کرتے رہے۔ اور ڈینٹل سرجن سے استفادہ کرتے رہے۔ اقبال ۲۵ مئی ۱۹۲۳ء کو خان محمد نیاز الدین کو لکھتے ہیں:

''میرا مسوڑہ پھول گیا تھا۔ آپریشن کرایا گیا جس سے تکلیف میں اضافہ ہوا اب کچھ آرام ہے۔'' (۱۵۸)

۱۳ جولائی ۱۹۲۴ء کو خان محمد نیاز الدین کو لکھتے ہیں:

''میں کئی روز تک بیمار رہا مسوڑا پھول گیا تھا جس کو کل چروا دیا گیا۔ اب خدا کے فضل سے آرام ہے۔ مگر گزشتہ ہفتہ سخت تکلیف رہی۔'' (۱۵۹)

۲۵ مئی ۱۹۳۱ کو مولوی صالح محمد ادیب تونسوی کو لکھتے ہیں:

''شام کو میں درد دنداں میں مبتلا ہو گیا اس واسطے مجبوراً آج پاک پتن کا سفر کرنے سے قاصر ہوں کہ دانت نکلوا دینے کا ارادہ ہے۔'' (۱۶۰)

۷ جون ۱۹۳۱ء کو مولوی محمد ادیب تونسوی کو لکھتے ہیں:

''چار روز کی سخت تکلیف کے بعد دونوں دانت جو رکھتے تھے ان کو اکھڑوا دیا گیا'' (۱۶۱)

۱۹۔ جنوری ۱۹۳۵ء کو پروفیسر میاں محمد شریف کو اقبال نے لکھا:

''مسوڑے پھول جانے کی وجہ سے سخت تکلیف رہی۔ دو آپریشن یکے بعد دیگرے ہو چکے ہیں۔ گزشتہ رات جو آپریشن ہوا اس سے کسی قدر افاقہ ہوا۔ مگر اب تک صاحب فراش ہوں۔ چنانچہ خط بھی لیٹے ہوئے لکھ رہا ہوں۔'' (۱۶۲)

۲۳ جون ۱۹۳۶ء کو پروفیسر الیاس برنی کو لکھتے ہیں:

''موتی منجن اور اکسیر آئل کی دو شیشیاں جس میں اونس دوا ہو مہربانی کر کے وی پی بھجوا دیجیے۔'' (۱۶۳)

۲۱ر جولائی ۱۹۳۶ء کو پروفیسر الیاس برنی کو لکھتے ہیں:

''موتی منجن اور تیل کے لیے میں نے آپ کی خدمت میں لکھا تھا کہ دوکاندار سے کہہ کر وی پی بھجوا دیجئے وہ پارسل اب تک نہیں ملا۔'' (۱۶۴)

کم خوابی

علامہ اقبال اپنی مصروفیات اور عبادات کی وجہ سے بہت کم سوتے تھے۔ سحر خیزی تو اقبال کی صفت عظمیٰ تھی۔ سحر خیزی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی نے مہاراجہ کشن پرشاد کو ۱۱۔جون ۱۹۱۸ء کو لکھے گئے ایک خط کو شامل کیا ہے۔

''سرکار کی صاحبزادی کی علالت کی خبر سن کر متردد ہوا ہوں اللہ تعالیٰ صحت عاجل کرامت فرماوے۔ انشاء اللہ کل صبح کی نماز کے بعد دعا کروں گا۔ کل رمضان کا چاند یہاں دکھائی دیا۔ آج رمضان المبارک کی پہلی ہے۔ بندہ روسیاہ کبھی تہجد کے لیے اٹھتا ہے اور بعض دفعہ تمام رات بیداری میں گزر جاتی ہے سو خدا کے فضل و کرم سے تہجد سے پہلے بھی اور بعد میں دعا کروں گا کہ اس وقت عبادت الٰہی میں بہت لذت حاصل ہوتی ہے کیا عجب ہے کہ دعا قبول ہو جائے۔'' (۱۶۵)

۳۱۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں:

''صبح چار بجے کبھی تین بجے اٹھتا ہوں پھر اس کے بعد نہیں سوتا۔ سوائے اس کے کہ مصلیٰ پر کبھی اونگھ جاؤں۔'' (۱۶۶)

علی الصبح اٹھ کر قرآن حکیم کی تلاوت اقبال کا روز کا معمول تھا۔ اقبال درون خانہ میں خالد نذیر صوفی تحریر کرتے ہیں۔

''انہیں رات کو دیر سے سونے کی عادت تھی دس گیارہ بجے تک محفل جمی رہتی محفل برخاست ہونے کے بعد کچھ دیر مطالعہ فرماتے یا حقہ منہ میں دبائے خاموش گہری سوچوں میں گم رہتے۔ اکثر نماز عشاء ادا کر کے سوتے

مگر پھر علی الصبح بیدار ہو جاتے۔ کبھی تہجد اور کبھی نماز ادا کرتے اور پھر حسب معمول خوش الحانی سے تلاوت کلام پاک فرماتے۔ ان کی سحر خیزی کا یہ عالم تھا کہ علی بخش کو فجر کی نماز کے لیے وضو کے پانی اور جائے نماز کا اہتمام رات کو سونے سے پہلے ہی کرنا پڑتا۔ کیونکہ فجر کی نماز اوّل وقت میں ادا کرنا ان کا معمول تھا۔" (۱۶۷)

اقبال کو نیند میں خراٹے لینے کی عادت تھی۔ اور خراٹے بھی بہت گرج دار آواز میں لیتے تھے۔ خالد نذیر صوفی مزید تحریر کرتے ہیں:

"انہیں سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر بستر کے ایک طرف لیٹنے کی عادت تھی۔ اس حالت میں ان کا ایک پاؤں ہلتا رہتا جس سے اندازہ ہوتا کہ ان کی نیند ابھی گہری نہیں ہوئی لیکن جوں ہی نیند گہری ہوتی خراٹوں کا دور شروع ہو جاتا۔" (۱۶۸)

کچھ تو عبادت کی وجہ سے رات کو جاگنے کی عادت تھی کچھ بیماریوں کی وجہ سے رات کو نیند کم ہو گئی تھی بدن کے درد دمہ کے دردوں اور پیٹھ کے درد سے کئی بار نیند سے جاگتے اور پھر مشکل سے سو پاتے۔ کم خوابی کے عارضے کو واضح کرنے کے لیے ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے خطوط کا سہارا لیا ہے۔ اقبال نے ۲۔ جنوری ۱۹۳۵ء کو سید نذیر نیازی کو خط لکھا۔

"زیادہ تر رات کو نیند بھی مجھ کو پہلے کی نسبت کم آتی ہے۔ اور بھوک بھی کم لگتی ہے۔" (۱۶۹)

۳۔ فروری ۱۹۳۸ء کو ڈاکٹر مظفر الدین کو لکھتے ہیں

"اس کے علاوہ حکیم صاحب کی خدمت میں یہ بھی عرض کریں کہ میری بھوک کم ہو گئی ہے اور نیند بھی پہلے کی طرح مسلسل نہیں آتی۔ رات کو میں چھ سات گھنٹے تو سو لیتا ہوں مگر یہ نیند مسلسل نہیں آتی۔" (۱۷۰)

۱۶۔ فروری ۱۹۳۸ء کو پھر مظفر الدین کو تحریر کرتے ہیں

"کم خوابی کی بھی شکایت ہے۔ مسلسل نیند صرف رات کے آخری

گھٹنوں میں آئی ہے پہلے گھٹنوں میں وقتاً فوقتاً اس میں خلل پیدا ہو جاتا ہے۔'' (۱۷۱)

۲۹ مارچ ۱۹۳۸ء کو ڈاکٹر مظفر الدین کو لکھتے ہیں:

''تیسری شکایت یہ ہے کہ رات کو نیند شب کے پہلے حصے میں بہت کم آتی ہے۔ آخری حصے میں البتہ کچھ نیند آتی ہے۔'' (۱۷۲)

علالت کے دنوں میں اقبال کی نیند بہت ہی کم ہو چکی تھی درد کی شدت میں اگر کمی واقع ہو بھی جاتی مگر نیند نہیں آتی تھی۔ حکیم محمد افضل نے نیند کے لیے روغن گل مالس کو مفید بتایا مگر افاقہ نہ ہوا۔ حکیم قریشی کا نسخہ روغن بھی کامیاب نہ ہوا۔ ڈاکٹر تقی عابدی مضمون کا اختتام ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''چنانچہ ڈاکٹر جمعیت سنگھ نے نیند کے لیے ایلو پیتھک دوا تجویز کی لیکن نیند آور دوا کا اثر اقبال پر سخت ہوا چنانچہ اقبال پر غشی کی سی حالت طاری ہوگئی اور وہ بے خبری میں پلنگ سے فرش پر گر گئے۔ اقبال نے پھر نیند کی گولیاں نہ کھائی بلکہ ان کو دوسری ایلو پیتھک دواؤں سے بھی نفرت ہوگئی۔'' (۱۷۳)

ضعف قلب

ڈاکٹر تقی عابدی نے چوب مرگ میں دعوی کیا ہے کہ علامہ کا انتقال ضعف قلب کی بدولت ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:

''علامہ کے انتقال نقرس، درد گردہ کی پتھری، گلو درد، آواز کا بیٹھ جانا یا دوسرے چھوٹے عوارض کی وجہ سے نہیں بلکہ قلب کی بیماری اور اس کے مضر اثرات سے ہوا جس کی بناء پر ان کی برونکائٹس اور برونشت نمونیا میں تبدیل ہوگئی اس لیے کھانسی کی شدت کے ساتھ ساتھ سینہ میں درد اور بلغم میں خون بھی آنے لگا تھا۔'' (۱۷۴)

ان کی تحقیق کے مطابق مرگ تو ضعف قلب سے ہوئی مگر ساتھ میں دمہ، سینہ میں درد اور بلغم بھی ضعف قلب کی وجہ سے ہوئے۔ اختلاج قلب کی بیماری تو اقبال کو جوانی سے تھی۔ مگر عمر کے آخری

حصے میں ان کو غشی کے دورے زیادہ پڑنے لگے تھے۔ اور اسی ضعف قلب کی وجہ سے ان کا جگر پھیل چکا تھا۔ انتقال سے دو سال قبل شانوں میں بھی شدید درد رہنے لگا تھا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال علالت کی آخری رات اقبال کے شانوں کے درد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اقبال کوئی گھنٹے بھر کے لیے سوئے ہوں گے کہ شانوں میں شدید درد کے باعث بیدار ہو گئے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم اور میاں محمد شفیع نے خواب آور دوا دینے کی کوشش کی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ فرمایا کہ دوا میں افیون کے اجزاء ہیں اور میں بے ہوشی کے عالم میں مرنا نہیں چاہتا علی بخش اور میاں محمد شفیع ان کے شانے اور کمر دبانے لگے تا کہ درد کی شدت کم ہو۔'' (۱۷۵)

اقبال کو علاج کے دوران پرہیز کی بالکل عادت نہ تھی وہ ان چیزوں سے بے حد اکتاہٹ محسوس کرتے تھے۔ اقبال نے جب سر راس مسعود کے گھر قیام کیا تو ڈاکٹروں نے ان کو مکمل آرام کرنے کو کہا تھا۔ ان دنوں میں اقبال نے زینہ بھی چڑھنا ہوتا تو سید صاحب اور ان کی بیگم اقبال کو سہارا دیا کرتے تھے۔ مگر اقبال کو یہ بات بہت ناگوار محسوس ہوتی تھی کچھ دن تو اقبال نے یہ سب برداشت کیا مگر پھر تنگ آ کر منع کر دیا کہ آپ لوگ ناحق تکلیف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں۔

> ''اسی دِن یا شاید اگلے روز میں چھت پر ٹہل رہا تھا کہ سر راس مسعود دوڑے دوڑے میرے پاس آئے اور گھبرا کر کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب آپ کیا غضب کرتے ہیں آرام سے لیٹے رہیے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو انہوں نے کہا کہ ڈاکٹروں کے نزدیک میری بیماری کس قدر خطرناک ہے۔ یعنی اقبال کو ہر لمحہ بتایا بھی جاتا تھا کہ یہ مرض ان کے لیے بہت خطرناک ہے مگر اس کے باوجود بھی اقبال بد پرہیزی کرتے تھے۔'' (۱۷۶)

ڈاکٹر تقی عابدی کا یہ دعویٰ جاوید اقبال کے اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے جب علالت کی آخری صبح اقبال درد کی شدت سے کراہ رہے تھے۔ علی بخش شانے داب رہے تھے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم اور میاں محمد شفیع مسجد میں صبح کی نماز ادا کرنے کے لیے چلے گئے تو علی بخش ان کے پاس اکیلا رہ گیا علی بخش نے دیکھا کہ اقبال نے دل پر ہاتھ رکھ کر ہائے کا لفظ منہ سے نکالا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''اسی اثناء میں اچانک اقبال نے اپنے دونوں ہاتھ دل پر رکھے اور ان کے منہ سے ''ہائے کا لفظ نکلا۔ علی بخش نے فوراً آگے بڑھ کر انہیں شانوں سے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ فرمایا: دل میں شدید درد ہے اور قبل اس کے کہ علی بخش کچھ کر سکے انہوں نے 'اللہ' کہا۔'' (۱۷۷)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے ضعف قلب کی وجوہات بیان کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ اقبال نے چونکہ تیس پینتیس سال تک تمباکو نوشی کی اس لیے دل کی کمزوری کی وجہ بن سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اقبال مرغن غذائیں بہت استعمال کرتے تھے دیسی گھی کا استعمال مقدار میں قدرے زیادہ تھا۔ میٹھے کے ساتھ ساتھ نمک کا استعمال بھی زیادہ تھا۔ پھر سونے، چاندی اور دوسری دھاتوں کا استعمال قلب وجگر کے لیے مضر تھا۔ اقبال درون خانہ میں خالد نذیر صوفی بیان کرتے ہیں:

''ترش چٹ پٹے اور مرغن کھانے انہیں بہت مرغوب تھے نمک مرچ تیز پسند کرتے تھے کھانے کے بعد میٹھا ضرور کھاتے۔ عام طور پر والدہ جاوید دودھ اور سویوں کی کھیر پکا کر رکھتیں جسے وہ بڑے شوق سے کھاتے'' (۱۷۸)

تمباکو نوشی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''تمباکو نوشی سے کھانسی کی شکایت بھی تھی جس نے رفتہ رفتہ دمہ قلبی کی صورت اختیار کر لی۔۔۔ آخر کار بحیثیت مجموعی کمزوری اور ضعف کے باعث دِل بڑھ گیا۔ اور پوری طرح خون پمپ کرنے کے قابل بھی نہ رہا۔ جس کے نتیجے میں معمولی محنت کرنے سے ان کا دم پھول جاتا۔'' (۱۷۹)

حکیم نابینا کا خیال تھا اگر اقبال کے گلے کا علاج بہترین نتائج کے لیے کرنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اقبال کے دل کا علاج کیا جائے۔ ذکر اقبال میں عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں۔

''حکیم نابینا کا ارشاد یہ تھا کہ میں سب سے پہلے علامہ کے قلب اور اعصاب کی تقویت کا اہتمام کرنا چاہیے صحت درست ہو گئی تو گلا خود بخود ٹھیک ہو جائے گا لیکن اس کے لیے وقت کی ضرورت ہے۔'' (۱۸۰)

ضعف قلب کا اشارہ کرتے ہوئے ذکر اقبال میں عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں:

"اس وقت علی بخش کے سوا کمرے میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ علامہ نے اس سے فرمایا میرے شانوں کو دباؤ پھر لیٹے لیٹے پاؤں پھیلا دیئے۔ اور دِل پر ہاتھ رکھ کر کہا یا اللہ یہاں درد ہے۔ اس کے ساتھ ہی سر پیچھے کی طرف گرنے لگا۔ علی بخش نے بڑھ کر سہارا دیا۔" (۱۸۱)

ڈاکٹر تقی عابدی کے مطابق تمباکو نوشی کی وجہ سے اقبال کے قلب کی رگیں تنگ ہوگئی تھی۔ قلب بدن کو خون کی ترسیل کرنے سے قاصر تھا۔ جب دل سے خون بدن کی طرف سرایت نہیں کرسکتا تھا تو دل خون سے بھرا رہتا ہے اور پھیپھڑے جگر اور بدن کے دوسرے حصے قلب میں خون نہیں بھیج سکتے تھے۔ اور سارا خون پھیپھڑوں میں جمع ہوتا رہتا ہے اور پھیپھڑوں میں پانی بھرنے سے اقبال کو دمہ قلبی کی بھی شکایت ہوگئی تھی۔ یعنی دمہ کی بیماری بھی ضعف قلب کی وجہ سے ہوئی دمہ کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

"پھر ایک شب تین چار گھنٹے کھانسی کا دورہ پڑا۔ علاج کیا گیا چند دنوں بعد انفلوائنزا اور کھانسی کی شکایت تو دور ہوگئی لیکن گلا بیٹھ گیا۔" (۱۸۲)

عبدالمجید سالک نے بھی اس بات کا ذکر، ذکر اقبال میں کیا ہے کہ ضعف قلب کی وجہ سے اقبال کو دمہ قلبی ہوگیا تھا۔ لکھتے ہیں:

"ضیق النفس کے لیے حکیم قریشی صاحب نے ایک ہلکا سا جوشاندہ تجویز کر رکھا تھا جس کے استعمال سے سکون ہو جاتا تھا حکیم صاحب کی تشخیص یہ تھی کہ علامہ کو دمہ قلبی ہے اور اس کی وجہ ضعف قلب ہے۔ چنانچہ ڈاکٹروں نے اس کی بھی تشخیص کی تائید کی۔ ان دنوں ہم نے اکثر دیکھا کہ علامہ بستر پر بیٹھ کر تکیہ اپنے آگے رکھوا لیتے اور اس پر سر ٹیک دیتے۔ ۲۵ فروری کو دمہ کا دورہ ہوا۔" (۱۸۳)

عبدالمجید سالک نے ساتھ ہی دمہ قلبی کے لیے دوا کا بھی ذکر کیا ہے۔ اقبال دمہ قلبی کے لیے جوشاندہ کا استعمال کرتے تھے۔ ۲۵ فروری کو جب اقبال کو دورہ پڑا تو انہوں نے جوشاندہ ہی استعمال کیا مگر کچھ بہتری محسوس نہ ہوئی۔ اب جوشاندہ کو خدا حافظ کہہ کر ایلوپیتھک علاج کی طرف متوجہ

ہوئے۔ اس علاج میں دورے کو روکنے کی کوشش کچھ دنوں کے لیے کامیاب ہو جاتی تھی۔ عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

"۳۰ مارچ کی شب کا ذکر ہے علامہ پر ضعف قلب سے غشی طاری ہوئی اور وہ اسی حالت میں پلنگ سے گر گئے۔ دوسرے دن حکیم قریشی صاحب نے ان کو دیکھا تو ان کے نیاز مندوں کو بتادیا کہ علامہ کا قلب نہایت ضعف ہے۔" (۱۸۴)

یہاں قلب کے علاج میں جو مسئلہ درپیش تھا وہ ایلو پیتھک ادویات تھیں جن سے اقبال بہت گھبراتے تھے۔ ڈاکٹری دواؤں سے علامہ کو سخت نفرت تھی۔ دواؤں سے تلخی کی وجہ سے اقبال کا علاج جاری نہیں رہ پاتا تھا۔ مگر جب دوائیاں کسی ایسی چیز کے ساتھ دی جاتی جو ان کی پسندیدہ ہو تو خوشی سے کھا لیتے عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں۔

"ڈاکٹری دواؤں سے علامہ کو نفرت تھی۔ لیکن جب انہیں خمیرہ گاؤزبان، عنبری یا دوالمسک اوراق نقرہ میں لپیٹ کر دی جاتی تو بے حد خوش ہوتے وہ کہا کرتے تھے کہ ہماری دواؤں کے اثرات صدیوں کے تجربے سے ثابت ہیں۔ آج کل کی دواؤں کا کیا ہے ادھر ایجاد ہوئیں ادھر متروک۔" (۱۸۵)

زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایک ایسا واقعہ بیان کیا جو ان دنوں کا ہے جب اقبال کو کھانسی کے شدید دورے پڑتے تھے یہاں تک کہ کھانستے کھانستے غشی کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ایک دفعہ تو اقبال پلنگ سے نیچے گر گئے۔ بیان کرتے ہیں:

"انہی ایام میں دمے کے پے در پے دوروں کے بعد نیم بیہوشی کے عالم میں راقم نے انہیں دو مرتبہ اپنی خوابگاہ میں مرزا اسد اللہ خان غالب اور مولانا جلال الدین رومی سے باتیں کرتے سنا تھا۔ دونوں مرتبہ علی بخش کو بلوا کر پوچھا کہ مرزا غالب یا (مولانا رومی) ابھی اٹھ کر گئے ہیں۔ دیکھنا کہیں چلے تو نہیں گئے اور علی بخش نے اس جواب پر کہ یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا

فرمایا چلو ٹھیک ہے۔" (۱۸۶)

ڈاکٹر تقی عابدی اقبال نے عارضہ قلب پر تحقیق کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ دمہ قلبی ضعف قلب کی وجہ سے تھا تو ساتھ ہی یہ بات تحقیق کے بعد ثابت کی کہ قلب میں ہر وقت خون بھرا رہتا جس کی وجہ سے اندرونی خانے خاصے بڑے اور پھیل گئے تھے اور یوں دِل سائز میں بڑا ہو گیا۔ جس کو ڈاکٹر تقی عابدی نے (Cardiornagaly) کہا ہے۔

دل کے سائز کے بڑھنے کے علاوہ ضعف قلب کی وجہ سے پھیپھڑوں اور جگر میں خون کا انجماد بھی ہو گیا۔ اور یہ قلب کے عضلات کی کمزوری کا نتیجہ تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی کا کہنا ہے کہ اگر اقبال اپنے احباب اور حکیموں کے مشوروں کو پس پشت ڈال کر ایلو پیتھک علاج کروا لیتے تو یہ مرض ان کی موت کا سبب نہ بنتا۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

> "افسوس کی بات یہ ہے کہ اقبال کے انتقال کے کچھ ہفتے قبل ایلو پیتھک جرمن ڈاکٹر زیلشر نے علامہ کا معائنہ کر کے قلب کے مرض کی تشخیص بھی دی اور یہ بھی کہا کہ علامہ کا دل پھیل کر Ox Heart کی شکل اختیار کر لیا ہے۔ اور اس کا علاج صحیح نہیں ہوا۔" (۱۸۷)

ڈاکٹر تقی عابدی کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر زیلشر علامہ کا علاج کرنا چاہتے تھے مگر ان کو علامہ کا علاج کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اگر ڈاکٹر زیلشر اقبال کا علاج کرتے تو یقیناً اقبال کی یہ تکلیف رفع ہو جاتی۔ مگر اقبال کو دیسی علاج پسند تھا۔ یوں وہ حکیموں اور دوستوں کے مشورے مانتے رہے اور یونانی علاج پر اکتفا کرتے رہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ضعف قلب کے متعلق اقبال کے چند خطوط کو شامل کیا ہے جو اقبال کے ضعف قلب کی بدولت ہونے والی تکالیف اور علامتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

ذکر اقبال میں عبدالمجید سالک نے دو ایسی بیماریوں کا ذکر کیا ہے جس میں ایک ضعف قلب کا پتہ دیتی ہے کہ اقبال کو جوانی کے دنوں میں ہی سر چکرانے کی بیماری لگ چکی تھی ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ مگر اقبال نے اس بیماری کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اگر اقبال وقت پر اس بیماری کی طرف توجہ دیتے تو تشخیص قدرے آسان ہو جاتی۔ عبدالمجید سالک بیان کرتے ہیں:

"ان دنوں علامہ اقبال نے ایک دو نئی شکائتیں محسوس کیں۔
وسط اگست میں ان کا سر دفعتاً چکرایا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا
گیا۔" (۱۸۸)

یہاں آنکھوں کے آگے اندھیرا آنے کی وجہ تو معلوم ہوتی ہے کہ آخری عمر میں موتیا اتر سکتا تھا مگر سر چکرانا ضعف قلب ہی کی بدولت معلوم ہوتا ہے اسی بات کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی نے ۲۸ اگست ۱۹۳۴ء کو سید نذیر نیازی کو لکھا گیا ایک خط بھی شامل کیا ہے۔

"مجھے ابتدائے علالت میں بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے
آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ جائے اور سر چکرائے۔ جوں جوں صحت ترقی
کرتی گئی یہ بات رفع ہوتی گئی چنانچہ تین چار روز پہلے تک اس کا نشان باقی
نہ تھا۔ اب تین چار روز سے پھر ایسا ہوتا ہے حالانکہ میری صحت سب اچھی
ہے۔ مہربانی کر کے حکیم صاحب سے جہاں تک ہو سکے جلد اس کا تذکرہ
کیجئے اور ان کے جواب سے مجھے مطلع فرمائیے کہ اس کا باعث کیا ہے۔؟"
(۱۸۹)

ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق اقبال کو اختلاج قلب کی شکایت جوانی سے ہی تھی۔ اور اقبال کا خیال تھا کہ بائیسکل متواتر چلانے کی وجہ سے ان کو یہ شکایت ہوئی۔ ۱۲ مئی ۱۹۲۲ء کو شیخ اعجاز احمد کو لکھتے ہیں۔

"بھائی صاحب کے خط سے معلوم ہوا ہے کہ تم کو گیارہ روز میں دو دفعہ
اختلاج قلب کی شکایت ہوئی ہے میرا خیال ہے کہ شاید اس کا باعث بائیسکل
کی متواتر سواری ہے کسی عمدہ ٹانک کا استعمال ضروری ہوگا۔ اس قسم کی شکایت
زمانہ طالب علمی میں تھی۔ گھبرانا نہیں چاہیئے اللہ تعالیٰ شفا دے گا۔" (۱۹۰)

اختلاج قلب کے لیے بھی اقبال حکیموں پر اکتفا کرتے تھے اختلاج قلب کے سلسلے میں دواؤں کا ذکر کرتے ہوئے ۲۳ مارچ ۱۹۳۵ء کو محمد عباس لمعہ کو خط لکھتے ہیں

"گولیوں کا استعمال جاری ہے اور لسی بھی استعمال کرتا ہوں جس

سے اختلاج میں ضرور افاقہ ہے۔ اس کے ساتھ آپ کی حسب خواہش آنولے کا مربہ بھی استعمال کر رہا ہوں۔" (۱۹۱)

ڈاکٹر تقی عابدی نے چونکہ تحقیق سے یہ بات ثابت کی ہے کہ کچھ ایسی وجوہات تھیں جس کی وجہ سے اقبال کو مختلف بیماریوں نے گھیر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک وجہ تمباکو نوشی تھی۔ ڈاکٹر تقی عابدی لکھتے ہیں اقبال نے کم از کم تیس (۳۰) پنتیس (۳۵) سال تک تمباکو نوشی کی۔

علامہ کی زیادہ تر بیماریوں کی جڑ تمباکو نوشی تھی اگر اقبال کو یہ معلوم ہوتا تو وہ کبھی بھی تمباکو نوشی نہ کرتے۔ تمباکو نوشی پر تحقیقی گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

"آج کی جدید میڈیکل تحقیق کے بموجب برونکائٹس ضعف قلبی دمہ ،گلو کی خرابی، گردہ کی بیماریاں اور آواز کا بیٹھ جانا وغیرہ سب کچھ تمباکو نوشی کی وجہ سے ہو سکتے ہیں۔ اقبال عموماً حقہ پیتے اور جب گھر سے باہر یا سفر پر ہوتے تو سگریٹ کا ڈبہ ساتھ رکھتے تھے۔" (۱۹۲)

حقہ کو تازہ رکھنے کے لیے اقبال کے خدمت گزار علی بخش ہر وقت تیار رہتے تھے وہ کبھی بھی حقے کو بجھنے نہ دیتے تھے۔ اگر اقبال کا دمہ کا دورہ پڑا ہے تو وہ دمہ ختم ہونے سے پہلے چلم بڑھا دیتے تھے۔ یہاں تقی عابدی نے بہت سی خوبصورت الفاظ سے حقہ کی موجودگی کا حوالہ دیا ہے۔"

"دن ہو یا رات خلوت ہو یا جلوت سفر ہو یا گھر تمباکو علامہ اقبال کا مونس دیا ور بنا ہوا تھا۔" (۱۹۳)

ذکر اقبال میں عبد المجید سالک علی بخش اور حقے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"علی بخش حقے کے معاملے میں بڑا باقاعدہ اور پابند تھا تمباکو علی العموم میاں نظام الدین مرحوم کے کھیتوں سے آتا۔ علی بخش اہتمام سے اس کو تیار کرتا اور دن بھر چلمیں بھرتا۔ کیونکہ اس کے سوا اسے کوئی اور کام بھی نہ تھا۔" (۱۹۴)

اقبال درون خانہ میں خالد نظیر صوفی تحریر کرتے ہیں:

"انہیں رات کو دیر سے سونے کی عادت تھی دس گیارہ بجے تک محفل

جمی رہتی۔ محفل برخاست ہونے کے بعد کچھ مطالعہ فرماتے یا حقہ منہ میں دبائے خاموش گہری سوچوں میں گم رہتے۔" (۱۹۵)

روزگار فقیر میں سید وحید الدین ایک یادگار سگریٹ کا واقعہ بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال سگریٹ کے کس قدر شوقین تھے۔

"ڈاکٹر صاحب ایک بار سیالکوٹ سے ریل گاڑی میں لاہور جا رہے تھے۔ شیخ اعجاز احمد بھی اس ٹرین سے اپر کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ سمبڑیال اسٹیشن پر جب ٹرین ٹھہری تو شیخ صاحب سیکنڈ کلاس میں ڈاکٹر صاحب سے کھانے کے لیے دریافت کرنے کی غرض سے آئے۔ اسی ڈبے میں ککے زئی خاندان کے ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ جب انہیں پتہ لگا کہ شاعر مشرق ان کے ہم سفر ہیں تو انہوں نے حیرت و مسرت کے ملے جلے انداز میں کہا۔ یہ ڈاکٹر محمد اقبال ہیں؟ ان سے میرا تعارف کرا دیجیے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ان سے ہاتھ ملایا اور اپنی سگریٹ کی ڈبی کھول کر ایک سگریٹ پیش کی ہم سفر بزرگ نے ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ سے وہ سگریٹ لے لی مگر سگریٹ کو سلگانے کی بجائے اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ڈاکٹر صاحب کو حیرت ہوئی انہوں نے پوچھا کہ آپ نے سگریٹ سلگائی نہیں وہ صاحب بولے کہ یہ متبرک سگریٹ میرے خاندان میں یادگار کے طور پر محفوظ رہے گی۔ ڈاکٹر صاحب اس پر مسکرائے انہوں نے دوسری سگریٹ دیتے ہوئے فرمایا اچھا تو اس سے شوق فرمائیے ہم سفر بزرگ نے اس سگریٹ کو بھی سلگائے بغیر جیب میں رکھ لیا۔" (۱۹۶)

یعنی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال ہر وقت سفر میں سگریٹ ساتھ رکھتے تھے۔ گھر میں حقہ پیتے تھے اور سفر میں سگریٹ ساتھی ہوتا تھا۔ ایک اور جگہ فقیر سید وحید الدین تحریر کرتے ہیں۔

"حقہ ان کی زندگی کا بہترین ساتھی تھا کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ وہ تو موجود ہوں اور حقہ ان کے پاس موجود نہ ہو علی بخش کو بھی سب سے زیادہ

ان کے حقے کا ہی خیال رکھنا پڑتا جب کسی دوست کے ہاں تشریف لے
جاتے تو ان کی سب سے بڑی تواضع یہی سمجھی جاتی اور میزبان سب سے
پہلے اسی کی فکر کرتا۔" (۱۹۷)

علامہ اقبال کی عادت تھی کہ صبح سویرے اٹھتے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر قرآن مجید پڑھتے تھے۔ پھر کوئی کتاب یا عدالت کی طرف رُخ کرتے تھے۔ عدالت سے واپسی پر کھانا تناول فرماتے اور ملنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہوتا تھا۔ علی بخش گھر کی دیکھ بھال کرتا اور حقہ گرم رکھتا۔ سید نذیر نیازی دانائے راز میں تحریر کرتے ہیں:

"ڈاکٹر صاحب کو دن بھر حقے کی طلب رہتی تھوڑی دیر کے
بعد آواز آتی۔ علی بخش۔ بخش کو اچھا خاصا طول دیتے۔ علی بخش حقہ! تا آنکہ
علی۔ اور حقہ اور ڈاکٹر صاحب لازم و ملزوم ہو گئے۔" (۱۹۸)

روزگار فقیر میں سید وحید الدین حقے سے متعلق ایک واقعہ تحریر کرتے ہیں جب اقبال ایک مقدمے کے سلسلے میں کیمل پور گئے۔ شیخ اعجاز احمد اقبال کے ہمراہ تھے۔ جب صبح پانچ بجے سیالکوٹ والی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اب اقبال کو حقے کی طلب ہوئی۔ قلی کو لالچ دیا کہ اگر اس وقت جا کر گھر سے حقہ لے آؤ تو انعام ملے گا۔ قلی انعام کے لالچ میں جا کر حقہ لے آیا۔ واقعہ شیخ اعجاز احمد کی زبانی بیان ہے۔

"مٹی کا پیندا، ٹوٹی ہوئی چلم، مگر علامہ حقے کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔
بستر کو پلیٹ فارم پر رکھ دیا۔ اس پر بیٹھ کر حقے کے کش لگانے لگے۔ قلی بھی
پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ حقہ پیتے اس قلی سے باتیں کرنے لگے شیخ اعجاز احمد نے
کہا حقہ تو بڑا گندا ہے کہنے لگے جسے تمباکو کی عادت پڑ جائے اسے طلب کے
وقت ان نزاکتوں کا خیال ہی نہیں آتا۔ تم اس کی عادت نہ ڈالنا۔" (۱۹۹)

اس واقعہ سے اقبال کی عادت کا اندازہ تو ہوتا ہے مگر ساتھ میں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اقبال بخوبی جانتے تھے کہ تمباکو نوشی اچھی عادت نہیں ہے تبھی شیخ اعجاز احمد کو اس عادت سے منع کر رہے تھے۔ اقبال درون خانہ میں خالد نذیر صوفی محترمہ حجاب امتیاز علی سے ملاقات کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔

جب حجاب امتیاز علی نے اقبال کو دیکھا تو پنجابی لباس میں ملبوس اس کا قومی ہیرو قدرے شفقت سے اس طرف دیکھ رہا تھا۔ اقبال نے حجاب امتیاز علی کو ساتھ بٹھالیا۔ اور بہت ہی عزیز چیز ان کو پیش کی۔ اور وہ عزیز چیز سگریٹ تھی۔ جب کہ وہ سگریٹ نہیں پیتی تھیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے عوارض کی دوسری وجہ یہ بتائی ہے کہ اقبال کو ورزش بالکل پسند نہ تھی۔ جوانی کے زمانے میں تو ورزش ان کا معمول تھا۔ مگر بعد میں ہر طرح کی ورزش اور ہوا خوری کو ترک کر دیا تھا۔ کچھ تو ان کی عادت کا قصور تھا کہ ورزش کی عادت نہ تھی اور دوسری وجہ ان کی بے حد مصروف زندگی۔ انہوں نے زندگی کے معمولات میں خود کو اس طرح مصروف کر لیا تھا کہ زندگی میں کبھی ورزش کرنے کا خیال ہی نہ آیا۔ کھیل میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ خالد نذیر صوفی اقبال درون خانہ میں تحریر کرتے ہیں

''وہ فطرتاً تساہل پسند تھے۔ چارپائی پر نیم دراز گاؤ تکیے لگائے بیٹھے رہنے کے بڑے دلدادہ تھے۔ وقت کی پابندی ان کے لیے مشکل تھی۔ اگر کہیں وقت مقرر پر پہنچنا ہوتا تو انہیں ہمیشہ دیر ہو جاتی'' (۲۰۰)

یہاں تساہل پسندی سے خالد نذیر صوفی کی مراد یہ نہیں ہے کہ ان کی طبیعت میں کاہلی تھی۔ بلکہ تساہل پسندی سے ان کی مراد یہ ہے یہ ہے کہ ان کو نقل و حرکت پسند نہ تھی۔ چلنا پھرنا ان کو ناگوار گزرتا تھا۔ پھر تیز قدم اٹھاتے تو ان کی طبیعت پہ اور گراں گزرتا تھا۔ اسی لیے خالد نظیر صوفی نے اگلے ہی فقرے میں اس کی وضاحت کر دی ہے کہ ان وہ چارپائی پر گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھے رہنے کے دلداہ تھے۔ غلام رسول مہر اقبال درون خانہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم کی طبیعت ابتداء ہی سے غور و فکر میں انہماک و استغراق کی طرف مائل تھی رفتہ رفتہ یہ انہماک بڑھتا گیا اور نقل و حرکت بارِ خاطر ہونے لگی۔ حالانکہ بالکل ابتدائی دور میں وہ پہلوانوں کے اکھاڑے میں جاتے اور ورزش کرتے تھے۔ ایک زمانے میں سیر بھی باقاعدہ کرتے رہے تھے پھر نقل و حرکت کم ہوتی گئی۔ اسی وجہ سے ان کے جسم کے نچلا حصہ کمزور ہو گیا تھا۔'' (۲۰۱)

اقبال کی محفل کئی گھنٹوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ جو کرسی استعمال کرتے تھے وہ یعنی آرام دہ کرسی تھی۔ احباب کی محفل جمتی تو سارا سارا دن اور رات گئے تک جاری رہتی۔ صحن سے برآمدہ اور برآمدے سے کمرے تک محض چلنا ان کی زندگی کا معمول تھا۔ باہر اگر گرمی محسوس ہوتی تو ڈرائنگ روم میں صوفے پر جا کر بیٹھ جاتے۔ سردی محسوس ہوتی تو خواب گاہ کے پلنگ پر نیم دراز ہو جاتے تھے۔ یعنی نقل و حرکت ان کی زندگی سے مفقود تھی نشست برخاست کرتے کرتے بھی کئی گھنٹے گزر جاتے۔ غلام رسول مہر تحریر کرتے ہیں:

''مرحوم کی نشست کا معاملہ بھی عجیب تھا ان کے ارشادات کا سلسلہ جاری ہو جاتا تو وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہ رہتا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک روز مجھے فرصت تھی اور میں صبح ہی ان کی خدمت میں پہنچ گیا میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کے وسیع برآمدے میں باتیں شروع ہو گئیں جب میں اجازت لے کر اٹھا تو گیارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ اس اثنا میں کرسیاں تو ادھر ادھر کھسکاتے رہے لیکن اٹھے نہیں اور اتفاق یہ کہ اس روز کوئی ملاقاتی بھی صحبت میں خلل انداز نہ ہوا۔'' (۲۰۲)

جس شخص کا یہ معمول ہو کہ گیارہ گھنٹے تک نشست کو قائم رکھا اور حرکت نہ کرے اور اس دوران بار بار حقہ بھی پیتا رہے تو بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور گھنٹوں بات چیت کرنا گلے پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ چنانچہ معمول کے مطابق اتنی دیر تک بیٹھے رہنا قلبی بیماریوں کا باعث بنا۔ اور ساتھ میں حقہ کے کش لگاتے رہنا دمہ کو جنم دیتا رہا۔ نقل و حرکت کے فقدان پر بحث کرتے ہوئے غلام رسول مہر مزید لکھتے ہیں۔ کہ جب دسمبر ۱۹۳۱ء میں اقبال لندن سے روما اور قاہرہ ٹھہرتے ہوئے یروشلم گئے۔ جہاں سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین نے موتمر اسلامی کا انعقاد کیا تھا۔ جب ہم اس ہوٹل پہنچے جو ہماری قیام گاہ سے دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ جب چائے پی چکے تو باہر کوئی موٹر موجود نہ تھی ہم سے پہلے جو لوگ بھی باہر نکلے وہ موٹر کاروں پر سوار ہو کر اپنی قیام گاہوں پر جا چکے تھے۔ اب دو ہی راستے باقی تھے۔ یا تو موٹر کار کا انتظار کیا جاتا کہ کوئی واپس آئے یا پھر پیدل چل کر قیام گاہ تک پہنچا جائے۔ مجھے دوسرا راستہ زیادہ بہتر لگا کہ موٹر کار کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ چل کر قیام گاہ تک پہنچا

جائے۔ غلام رسول مہر تحریر کرتے ہیں۔

''میں نے عرض کی کہ ہماری قیام گاہ کچھ دور تو نہیں کیوں نہ ٹہلتے ٹہلتے پیدل وہاں پہنچ جائیں ''فرمایا'' ٹھیک ہے چلو لیکن پانچ دس قدم چل کر رک گئے اور فرمایا'' مہر صاحب! ہم تھک جائیں گے حسن اتفاق سے ایک موٹر آ گئی اور ہم اس میں سوار ہو کر قیام گاہ پہنچ گئے۔'' (۲۰۳)

یعنی اقبال کے لیے دو فرلانگ چلنا بھی گوارہ نہ تھا۔ ان کو یہ بات بہت مشکل لگ رہی تھی کہ اتنا چل کر کیسے قیام گاہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ سفر اتنا نہ تھا مگر فکر کا خوف تھا۔ جو ان کو گھیر لیتا تھا۔ اور یہ فکر انہماک میں نقل و حرکت سے گریز ہی کا نتیجہ تھی۔

ان تمام عوارض میں کبھی اقبال کی طبیعت سنبھل جاتی تو کبھی پھر سے قلب گردے اور جگر ماؤف ہو جاتے۔ نیند آتی ہی نہ تھی۔ مسلسل بے خوابی کا عالم طاری رہنے لگا۔ وقت کاٹنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ دمے کے دورے زندگی سے مایوس کرتے جا رہے تھے۔ اردو ادب کا ایک تحقیقی و تخلیقی مجلہ ''الاقرباء'' میں ڈاکٹر محمد سفیان نے حکیم الامت کے مسائل صحت پر ایک جامع مضمون تحریر کرتے ہوئے حکیم الامت کا دار فانی سے کوچ کرنے کا واقعہ بیان کیا ہے۔

''ڈاکٹر عبدالقیوم اور میاں محمد شفیع صبح کی نماز ادا کرنے کی خاطر قریب کی مسجد میں پہنچ گئے تھے۔ اور صرف علی بخش ہی اقبال کے پاس رہ گیا تھا۔ اسی اثنا میں اقبال نے اپنے دونوں ہاتھ دل پر رکھے اور ان کے منہ سے ہائے کا لفظ نکلا علی بخش نے فوراً آگے بڑھ کر انہیں شانوں سے اپنے بازوؤں میں تھام لیا فرمایا دل میں شدید درد ہے اور قبل اس کے کہ علی بخش کچھ کر سکے انہوں نے اللہ کہا اور ان کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔'' (۲۰۴)

حواشی:

۱۔ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان ۲۰۰۷ء)، ص ۹
۲۔ ایضاً، ص ۹
۳۔ ایضاً، ص ۹
۴۔ ایضاً، ص ۹
۵۔ ایضاً، ص ۱۰
۶۔ ایضاً، ص ۱۰
۷۔ ایضاً، ص ۱۰
۸۔ ایضاً، ص ۱۱
۹۔ ایضاً، ص ۱۱
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۲
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۲
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۲
۱۳۔ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (دوم) (لاہور: اردو اکادمی ۱۹۹۱ء)، ص ۳۴۱
۱۴۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۱۲ء)، ص ۱۱۲
۱۵۔ وحید الدین، سید، فقیر، روزگار فقیر (کراچی: لائن آرٹ پریس ۱۹۶۶ء)، ص ۱۲۴
۱۶۔ ایضاً، ص ۲۲۴
۱۷۔ ایضاً، ص ۲۲۴
۱۸۔ سالک، عبدالمجید، ذکر اقبال (لاہور: بزم اقبال ۱۹۸۳ء)، ص ۱۹۳
۱۹۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، ص ۵۹۷
۲۰۔ ایضاً، ص ۵۹۷
۲۱۔ نذیر نیازی، دانائے راز، (لاہور: اقبال اکادمی ۱۹۸۸ء)، ص ۱۵
۲۲۔ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان ۲۰۰۷ء)، ص ۱۲
۲۳۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، ص ۵۹۷
۲۴۔ وحید الدین، سید، فقیر، روزگار فقیر، ص ۲۲۵

۲۵۔ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید ، ص ۱۸
۲۶۔ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم) (دہلی: اردو اکادمی ۱۹۹۸ء) ص ۵۹۴
۲۷۔ ایضاً ، ص ۶۱۹
۲۸۔ ایضاً ، ص ۴۸۱
۲۹۔ ایضاً ، ص ۶۶۷
۳۰۔ صوفی، خالد نذیر، اقبال درون خانہ (لاہور: اقبال اکادمی ۲۰۰۸ء) ، ص ۱۲۶
۳۱۔ ایضاً ، ص ۱۲۵
۳۲۔ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (اول) (دھلی اردو اکادمی) ، ص ۶۶۲
۳۳۔ علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز) ، ص ۱۹۷
۳۴۔ علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز) ، ص ۹۰۶
۳۵۔ رانا غلام یٰسین، علامہ اقبال اور طب (لاہور: اردو بازار ۲۰۱۲ء)، ص ۶۵
۳۶۔ ایضاً ، ص ۸۵
۳۷۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۵۹۷
۳۸۔ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید ص ۲۸
۳۹۔ رانا غلام یٰسین، علامہ اقبال اور طب، ص ۳۱
۴۰ سید وحید الدین، فقیر، روزگار فقیر، (کراچی: لائن آرٹ پریس ۱۹۶۶ء)، ص ۲۲۴
۴۱ سالک، عبد المجید، ذکر اقبال ، ص ۲۱۹
۴۲ سالک، عبد المجید، ذکر اقبال ، ص ۲۲۱
۴۳ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید ص ۲۸
۴۴ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم) (دہلی: اردو اکادمی ۱۹۹۸ء) ص ۶۲۳
۴۵ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم) (دہلی: اردو اکادمی ۱۹۹۸ء) ص ۵۰۵
۴۶ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (دوم) (دہلی: اردو اکادمی ۱۹۹۱ء)، ص ۳۳۱
۴۷ ایضاً ، ص ۳۴۵
۴۸ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (سوم) (دہلی: اردو اکادمی ۱۹۹۳ء)، ص ۲۶۸
۴۹ صہبا لکھنوی، اقبال اور بھوپال (لاہور: اقبال اکادمی ۲۰۰۰ء)، ص ۸۱
۵۰ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید ص ۱۹۲

۵۱ سالک، عبدالمجید، ذکر اقبال، (لاہور: بزم اقبال ۱۹۸۳ء)، ص ۱۴۱
۵۲ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۵۹۷
۵۳ سید وحید الدین، فقیر، روزگار فقیر، ص ۲۲۴
۵۴ رانا غلام یٰسین، علامہ اقبال اور طب، ص ۳۰
۵۵ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (اول) (دہلی: اردو اکادمی ۱۹۹۶ء)، ص ۲۵۶
۵۶ ایضاً ، ص ۵۸۵
۵۷ ایضاً ، ص ۵۱۱
۵۸ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم) ، ص ۵۱۷
۵۹ ایضاً ، ص ۵۹۴
۶۰ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (دوم) ، ص ۶۹۹
۶۱ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم) ، ص ۶۱۲
۶۲ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید ص ۲۱
۶۳ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (سوم) ، ص ۵۹۰
۶۴ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (دوم) ، ص ۵۹۰
۶۵ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید ص ۲۵
۶۶ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۵۰۱
۶۷ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۵۰۲
۶۸ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (اول)، ص ۶۱۱
۶۹ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۶۰۵
۷۰ صوفی، خالد نذیر، اقبال درون خانہ ، ص ۱۲۶
۷۱ ایضاً ، ص ۳۱
۷۲ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید ص ۹۸
۷۳ صوفی، خالد نذیر، اقبال درون خانہ ، ص ۳۱
۷۴ ایضاً ، ص ۷
۷۵ ایضاً ، ص ۷
۷۶ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید ص ۵۰

۷۷ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۵۹۷
۷۸ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید ص ۵۱
۷۹ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۵۹۹
۸۰ ایضاً ، ص ۶۰۰
۸۱ ایضاً ، ص ۵۹۹
۸۲ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید ص ۵۱
۸۳ سالک، عبدالمجید، ذکر اقبال ، ص ۱۸۹
۸۴ ایضاً ، ص ۱۹۰
۸۵ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۵۹۸
۸۶ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (سوم) ، ص ۵۵۸
۸۷ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (سوم) ،ص ۶۲۸
۸۸ صوفی، خالد نذیر، اقبال درون خانہ ، ص ۳۵
۸۹ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید ص ۵۱
۹۰ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم)، ص ۶۳۲
۹۱ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید ص ۵۶
۹۲ سید وحید الدین، فقیر، روزگار فقیر، ص ۱۵۳
۹۳ صہبا لکھنوی، اقبال اور بھوپال ، ص ۹۵
۹۴ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم)، ص ۶۷
۹۵ صہبا لکھنوی، اقبال اور بھوپال ، ص ۹۸
۹۶ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، ص ۵۴
۹۷ ایضاً ، ص ۵۴
۹۸ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۶۰۳
۹۹ صوفی، خالد نذیر، اقبال درون خانہ ، ص ۲۷
۱۰۰ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (دوم)، ص ۵۲۹
۱۰۱ ایضاً ، ص ۴۸۶
۱۰۲ ایضاً ، ص ۴۸۹

۱۰۳ صوفی، خالد نذیر، اقبال درون خانہ ، ص ۲۷
۱۰۴ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم)، ص ۴۵
۱۰۵ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (دوم)، ص ۵۶۵
۱۰۶ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۱۸۹
۱۰۷ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید
۱۰۸ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (سوم) ، ص ۵۴۷
۱۰۹ ایضاً ، ص ۵۶۰
۱۱۰ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (سوم) ، ص ۶۴۷
۱۱۱ ایضاً ، ص ۵۶۰
۱۱۲ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم) ، ص ۵۹۴
۱۱۳ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید، ص ۹۶
۱۱۴ صہبا لکھنوی، اقبال اور بھوپال ، ص ۸۸
۱۱۵ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (سوم) ، ص ۴۷۶
۱۱۶ ایضاً ، ص ۶۸۵
۱۱۷ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم) ، ص ۴۵
۱۱۸ ایضاً ، ص ۹۶
۱۱۹ ایضاً ، ص ۱۴۹
۱۲۰ ایضاً ، ص ۱۶۳
۱۲۱ ایضاً ، ص ۱۶۷
۱۲۲ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید، ص ۵۳
۱۲۳ سالک، عبدالمجید، ذکر اقبال ، ص ۹۷
۱۲۴ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۶۰۶
۱۲۵ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید، ص ۱۰۷
۱۲۶ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۶۰۶
۱۲۷ ایضاً ، ص ۶۰۶
۱۲۸ ایضاً ، ص ۶۱۹

۱۲۹ ایضاً ، ۶۱۶
۱۳۰ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم) ، ص ۲۹۲
۱۳۱ ایضاً ، ص ۳۴۳
۱۳۲ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۵۴۷
۱۳۳ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۶۱۲
۱۳۴ صوفی، خالد نذیر، اقبال درون خانہ ، ص ۲۹
۱۳۵ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید، ص ۴۲
۱۳۶ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم) ، ص ۹۹
۱۳۷ ایضاً ، ص ۳۴۱
۱۳۸ ایضاً ، ص ۳۶۰
۱۳۹ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید، ص ۹۲
۱۴۰ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم) ، ص ۳۸
۱۴۱ ایضاً ، ص ۴۵
۱۴۲ ایضاً ، ص ۴۶۸
۱۴۳ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید، ص ۶۳
۱۴۴ ایضاً ، ص ۶۴
۱۴۵ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (سوم) ، ص ۵۹۷
۱۴۶ ایضاً ، ص ۶۳۸
۱۴۷ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم) ، ص ۳۴۱
۱۴۸ ایضاً ، ص ۳۹۴
۱۴۹ ایضاً ، ص ۶۵۶
۱۵۰ ایضاً ، ص ۶۳۶
۱۵۱ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید، ص ۶۵
۱۵۲ سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور (لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۸۱ء) ،ص ۳۴۰
۱۵۳ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (اول) ، ص ۶۵۸
۱۵۴ ایضاً ، ص ۶۶۲

۱۵۵ ایضاً ، ص ۶۶۵

۱۵۶ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید، ص ۶۶

۱۵۷ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید، ص ۶۷

۱۵۸ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (دوم) ، ص ۴۴۷

۱۵۹ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (دوم) ، ص ۵۲۰

۱۶۰ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (دوم) ، ص ۲۱۱

۱۶۱ ایضاً ، ص ۲۱۴

۱۶۲ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم) ، ص ۵۸

۱۶۳ ایضاً ، ص ۳۲۴

۱۶۴ ایضاً ، ص ۳۶۳

۱۶۵ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (اول) ، ص ۲۲۷

۱۶۶ ایضاً ، ۵۳۴

۱۶۷ صوفی، خالد نذیر، اقبال درون خانہ ، ص ۳۱

۱۶۸ ایضاً ، ص ۳۲

۱۶۹ صوفی، خالد نذیر، اقبال درون خانہ ،(چہارم) ، ص ۳۸

۱۷۰ ایضاً ، ص ۶۳۶

۱۷۱ ایضاً ، ص ۶۳۹

۱۷۲ ایضاً ، ص ۶۵۶

۱۷۳ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید، ص ۷۰

۱۷۴ ایضاً ، ص ۳۰

۱۷۵ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۵۱۷

۱۷۶ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید، ص ۳۲

۱۷۷ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۵۲۷

۱۷۸ صوفی، خالد نذیر، اقبال درون خانہ ، ص ۲۹

۱۷۹ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۵۹۷

۱۸۰ سالک، عبدالمجید، ذکر اقبال ، ص ۱۹۲

۱۸۱ ایضاً ، ص ۲۲۳

۱۸۲ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۵۹۷

۱۸۳ سالک، عبدالمجید، ذکر اقبال ، ص ۳۱۹

۱۸۴ ایضاً ، ص ۳۱۹

۱۸۵ ایضاً ، ص ۳۲۰

۱۸۶ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۷۱۷

۱۸۷ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید، ص ۳۱

۱۸۸ سالک، عبدالمجید، ذکر اقبال ، ص ۱۹۳

۱۸۹ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (سوم) ، ص ۶۰۹

۱۹۰ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (دوم) ، ص ۲۵۵

۱۹۱ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم) ، ص ۹۹

۱۹۲ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، چوں مرگ آید، ص ۳۶

۱۹۳ ایضاً ، ص ۳۶

۱۹۴ سالک، عبدالمجید، ذکر اقبال ، ص ۲۳۱

۱۹۵ صوفی، خالد نذیر، اقبال درون خانہ ، ص ۳۱

۱۹۶ سید وحید الدین، فقیر، روزگار فقیر، ص ۱۲۱

۱۹۷ ایضاً ، ص ۲۲۲

۱۹۸ سید نذیر نیازی، دانائے راز ، ص ۱۴۲

۱۹۹ سید وحید الدین، فقیر، روزگار فقیر، ص ۱۵۹

۲۰۰ صوفی، خالد نذیر، اقبال درون خانہ ، ص ۲۸

۲۰۱ ایضاً ، ص ۸

۲۰۲ صوفی، خالد نذیر، اقبال درون خانہ ، ص ۹

۲۰۳ ایضاً ، ص ۹

۲۰۴ الاقربا سہ ماہی سالنامہ ۲۰۱۲ء (اسلام آباد :الاقرباء فاؤنڈیشن) ص ۷۵

باب سوم

اقبال کے عرفانی زاویے ایک تجزیاتی مطالعہ

اقبال عاشق رسول ﷺ اور اہل بیت

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے عرفانی زاویے میں اقبال کے عشق محمدیؐ سے والہانہ جذبے کے اظہار کے لیے تین مضمون شامل کیے ہیں جو ایک دوسرے سے منسلک ہیں ایک مضمون ''علامہ فنافی الرسول'' اور دوسرا ''اقبال اور زیارت روضہ رسولؐ '' ہے۔ ان دونوں موضوعات کا اظہار اقبال کی نعتیہ شاعری میں ہوتا ہے جو تیسرا مضمون ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

> ''یہ سچ ہے کہ علامہ اپنی ابتدائی عمر ہی سے عاشق رسولؐ تھے لیکن جس زمانے میں وہ فلسفہ خودی کے نشہ میں چور تھے اس موضوع پر کچھ زیادہ نہ لکھ سکے مگر آخری عمر میں جب ان کے دل میں عجیب سوز و گداز پیدا ہوا تو انہوں نے پھر نعتیہ شاعری کی طرف توجہ کی اور اس موضوع پر خصوصاً ارمغان حجاز میں بہت کچھ لکھا۔'' (۱)

ارمغان حجاز میں اقبال نے حضور رسالتؐ کے نام سے حضورؐ سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ اس سے پہلے بھی اقبال حضور اکرمؐ سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کر چکے تھے مگر حضورِ رسالتؐ میں ان کے لہجے میں تبدیلی آ گئی تھی۔ حضور اکرمؐ سے ان کا عشق اور جذبہ محبت بڑھ گیا تھا اور شوخی کے بجائے وہ انتہائی احترام اور نیاز مندی سے بات کرنے لگے تھے۔

''ندانم دِل شہید جلوہ کیست
نصیب اور اقرار یک نفسِ نیست

بصحرا بردمش افسردہ ترگشت
کنارِ آبجوئے زار بگریست (۲)

خواجہ حمید یزدانی اس شعر کی شرح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خدا معلوم میرا دل کس ذات گرامی کے جلووں کا شہید ہے (یعنی حضور اکرمؐ) کے جلووں کا بے حد شیدائی ہے) کہ اس کو ایک پل بھی چین نصیب نہیں ہے میں اِسے صحرا میں لے گیا۔ وہ اور بھی زیادہ فسردہ اور اداس ہو گیا۔ چنانچہ ندی کے کنارے اس نے خوب گریہ زاری کی حضور اکرمؐ کی ذات گرامی سے بے پناہ عشق کے باعث عاشق (علامہ) کا دِل بے حد بے قرار اور اداس ہے اور وہ محبوب کی خدمت اقدس میں جلد بھیجنے کا آرزومند ہے۔'' (۳)

آخری عمر میں آپؐ سے حضرت اقبال سے محبت آخری حد تک پہنچ چکی تھی کبھی کبھی تو آپ کا اسم گرامی سنتے ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ اقبال وضو کے بغیر آپ کا اسم مبارک زبان پر لانے کو بے ادبی خیال کرتے تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کے مطابق علامہ کی نعتیہ شاعری کی جان ان کا سچا عشق رسولؐ ہے جس کی بدولت ان کے کلام میں فراوانی جذبات، بلندی، تخیل فکر و نظر، تاثیر اعجاز، درد و لذت اور حکیمانہ و فلسفیانہ اقدار کا بحرِ زخار موجیں مارتا نظر آتا ہے عشق رسولؐ میں لکھا گیا ہر شعر تار رباب کی طرح درد و کرب کی موج معلوم ہوتا ہے۔

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو
کہ راکب خستہ و بیمار و پیراست
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی
بپایش ریگِ ایں صحرا حریراست (۴)

اس شعر سے بھی عیاں ہوتا ہے کہ اقبال آپؐ سے اپنے جذبہ عشق کا اظہار تنہائی میں کرنا چاہتے تھے۔ خواجہ حمید یزدانی اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تو میرے نغمے (شاعری) کے مقامات کے بارے میں کیا پوچھتا ہے۔ میرے ساتھی نہیں جانتے کہ میں کہاں سے آیا ہوں میں نے اس صحرا

میں اپنا سامان سفر کھول کے رکھ دیا ہے تاکہ میں اس کی خلوت میں تنہا نغمہ سرائی کروں۔ اس خیالی سفر میں صحرائے عرب میں پہنچ کر خود کو وہاں روک لیا ہے۔ تاکہ حضور اکرمؐ سے اپنے عشق و محبت کا اظہار تنہائی میں کروں اور یوں میرے اس اظہار میں کوئی مخل نہ ہو۔ علامہ نے اس اظہار کو نوا کا نام دیا ہے۔"(۵)

اقبال قیام یورپ کے بعد اس ذات گرامی کی سیرت کا مطالعہ کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں جس کو رب العزت نے سید مکی مدنی کہہ کر پکارا ہے تو اقبال پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہ وہ ذہن برگزیدہ ہے جس میں کبھی کوئی شائبہ نہیں ہے۔ اقبال کو اس مردِ کامل کی تلاش تھی جو جوہر عشق کا کامل ترین مصدر ہو۔ شعر اقبال میں سید عابد علی عابد تحریر کرتے ہیں۔:

"اقبال کو رسول پاکؐ کی ذات اُس جوہر کی مصدر نظر آئی۔ ان کی ذات میں سوز و ساز، ذکر و فکر، علم و عمل، بصارت و بصیرت، فرد اور نظر گھل مل کر اس طرح حل ہو گئے تھے کہ فقیری اور شاہی کا اجتماع چشم فلک نے پہلے نہ دیکھا تھا نہ پھر دیکھے گی۔"(۶)

اقبال کی جستجو آپ کی ذات پر آ کر مطمئن نظر آتی ہے وہ اضطراب جس نے اقبال کو فلسفے کی موشگافیوں میں الجھا کر رکھا ہوا تھا۔ اس کو منزل مل گئی تھی اقبال پر ایک حقیقی عالم کھل گیا۔ اور اسی عالم میں اقبال عشق محمدیؐ سے لبریز ہو کر شعر کہنے لگے۔

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے(۷)

یعنی آپ کی ذات عشق کی قوت سے لبریز ہے۔ اور اسی عشق کا واسطہ دے کر خدا کو بھی راضی کیا جا سکتا ہے اسم محمدؐ سے دنیا کے اندھیرے چھٹ سکتے ہیں۔ اور اللہ بھی اسی اسم محمد کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے اقبال کی زبانی کہہ اٹھتا ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں(۸)

حضرت اقبال آپؐ کے عشق میں غرق ہو چکے تھے۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے

عبدالمجید سالک ذکر اقبال میں تحریر کرتے ہیں:

''عشق رسولؐ ان کے رگ و ریشہ میں رچا ہوا تھا۔ حضور سرور کائنات کا ذکر ذرا موثر طور پر ہوا اور علامہ اقبال کے آنسو جاری ہوئے۔ پھر جب تک خود بخود طبیعت ہلکی نہ ہو جاتی تھی ان کی گریہ وزاری کوئی نہ روک سکتا تھا۔'' (۹)

انہوں نے نبی پاک حضرت محمدؐ کو حصار اسلام کا مرکز قرار دیا آبروئے ما زنام مصطفیٰ است کہا اور واضح کیا کہ

مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

ملاحظہ فرمائیے یہ اشعار کسی مقرب زدہ کے لیے اقبال نے نہیں لکھے بلکہ بنز وصحرائے بھٹکے ہوئے عالم اسلام کی صورت حال سے غافل کانگرسی عالم مولانا حسین مدنی کے لیے لکھے ہے جو وطنی قومیت کا پرچار کرنے والا تھا۔

پھر اپنی نظم ذوق شوق میں نبی پاک کو آیہ کائنات کا معنی دیریاب قرار دیا اور پوری امت کو ان کے گرد اکٹھا کرنے کے لیے زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ ترے محیط میں حباب
شوکت سنجر وسلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب (۱۰)

اپنے فارسی کلام میں بھی بحضور رسالت مآبؐ میں اپنی جذبات کا اظہار کیا اور نبی پاک کو انسان کامل اور مرکز ملت اور ایک آئیڈیل کے طور پر پیش کرتے ہوئے ان کے گرد جمع ہونے اور ان سے محبت اور وقار کا درس دیا، یوں مسلمانوں کو ایک مرکز فراہم کیا جس کے گرد اکھٹے ہوں اور ان کے نقش قدم پر چلیں۔

اگر تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ عرب میں حضورؐ سے قبل

کوئی ایسی شخصیت صفحہ ہستی پر موجود نہ تھی جو معرفت الٰہی کے حصول کے بعد لوگوں کو ایک خدا کی عبادت کی دعوت دے جو انسان کو بتائے کہ کائنات میں اس کا مقام و مرتبہ کیا ہے۔ مختلف انبیاء کے مبعوث کیے جانے کے باوجود دنیا جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں ڈوبتی جارہی تھی۔ اور اس جاہلیت کے دور کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے تو خیر کی شمع روشن فرمائی۔

نکتہ توحید باز آموزدش

رسم و آئین نیاز آموزدش (۱۱)

زیب النساء سرویا اقبال کی رسولؐ سے وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''علامہ اقبال رسول پاکؐ کے اس مقام و مرتبہ سے بخوبی آشنا ہیں۔
اسی بنا پر رسول پاک کی ذات و برکات کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں:'' (۱۲)

علامہ اقبال کا عقیدہ تھا کہ اگر آپ کو مکمل طور پر پہچاننا ہے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نظر سے دیکھنا ہوگا۔ اللہ کا پیغام قرآن کی شکل میں نبی پاکؐ پر نازل ہوا وہ امت مسلمہ کے لیے طاقت کا سرچشمہ ہے اور آپ کے اقوال ملت کی زندگی کے لیے شہ رگ ہے۔ اور آپؐ کا پیغام ہر قبیلے اور ہر قوم کے لیے یکساں تھا۔ آپ کا پیغام بلا امتیاز تمام زمانے اور تمام انسانوں کے لیے ہے۔ آپؐ کی تعلیمات کسی کے لیے مخصوص نہ تھیں۔ زیب النساء سرویا تحریر کرتی ہیں:

''علامہ اقبال رسالت محمدؐ کی ابدیت اور عالمگیریت پر صدق دل سے گواہی دیتے ہیں ان کے نزدیک شریعت محمدیؐ ملک وقوم گروہ زمانے وغیرہ کی قید سے آزاد ہے کیونکہ یہ تمام بنی نوع انساں کے لیے قانون حیات ہے جب تک دنیا میں ''حیات'' موجود ہے۔ شریعت محمدیہؐ کی ضرورت درکار رہے گی۔'' (۱۳)

اسرار ورموز کا یہ شعر شریعت محمدیہ کی عکاسی کرتا ہے۔

ہست دین مصطفیٰ دین حیات

شرع او تفسیر آئین حیات (۱۴)

آپ کی تعلیمات رہتی دنیا تک موجود رہیں گی۔ اقبال کا دعویٰ ہے کہ آپ کی تعلیمات اور قرآن دونوں زندہ و پائندہ ہیں۔ قرآن پاک ہر طرح کی تحریف سے بری ہے۔ کیونکہ اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے اور مومن کا سینہ بھی اس کا محافظ ہے۔

آں کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم (۱۵)

زیب النساء تحریر کرتی ہیں:

"علامہ اقبال یہ موقف رکھتے تھے کہ رسول پاکؐ کے قلب پر قرآن کے صرف معانی ہی نہیں بلکہ الفاظ بھی اُترتے تھے اور یہ وہی الفاظ ہیں جو قرآن پاک میں نظر آتے ہیں۔" (۱۶)

اقبال کے مطابق جو بھی عشق محمدیؐ سے سرشار ہے اس کے اختیارات کے ایک حصے میں تمام بحر و بر ہیں اور مومن دنیا میں ضروریات زندگی یعنی کھانے اور سونے کی بدولت زندہ نہیں بلکہ عشق محمدی کی وجہ سے زندہ ہے۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآن وہی فرقان وہی یٰسین وہی طٰہٰ (۱۷)

اقبال کی جستجو آپ کی ذات پر آ کر ختم ہوتی ہے۔ اقبال کے دِل بیقرار کو پناہ صرف اور صرف آپؐ کے پاس ملتی ہے۔ اسی سکوں کے عالم میں اقبال رسول کی عقیدت میں سرشار نظر آتا ہے۔

اور یوں اقبال اس مقام سے عشق کے ذریعے عقیدت کے اعلیٰ مقام پر جا کر یوں کہتے ہیں

یا خدا در پردہ گویم یا تو گویم آشکار
یا رسول اللہ او پنہاں و تو پیدائے من (۱۸)

نفائس اقبال میں سید عابد علی عابد تحریر کرتے ہیں:

"پھر اور آگے بڑھا رسول کی ذات گرامی کو تمام فیوض کا منبع قرار دیا۔

جب دست طلب دراز کیا انہیں کے سامنے دراز کیا۔ جب کچھ مانگا انہیں سے مانگا۔ جب پکارا انہیں کو پکارا۔" (۱۹)

اقبال کی عقیدت رسول پاکؐ کی ذات گرامی سے نہایت عمیق اور ذاتی فکر پر مبنی ہے۔ اور اسلام نے رسول پاکؐ کے ذریعے ان کی تعلیم کے ذریعے اور ان کے افعال کے ذریعے وحدت مطلقہ اور توحید کامل کا ایک نہایت واضح تصور پیش کیا اور اس تصور کے تمام اسرار و رموز فاش کیے تاکہ اقوام عالم کے اندر جہالت کا سد باب کیا جا سکے سید عابد علی عابد تحریر کرتے ہیں:

"رسول پاکؐ کی ذات میں مشاہدات و واردات سوز و ساز دین و سلطنت، فقر و شہنشاہی اس طرح سموئے گئے کہ خود ان کی ذات دوئی کے تصور کے خلاف ایک زندہ ثبوت، توحید کے نکتے کی تفسیر اور حقیقت مطلقہ کی وحدت کی دل نشیں برہاں بن کر رہ گئی۔" (۲۰)

اقبال کا یقین تھا کہ دنیا میں دوئی کا خوفناک مرض جو دلفریب صورتوں کا روپ دھار کر اسلام کے عقائد میں شامل ہو گیا تھا اس کا علاج صرف اور صرف رسول عربیؐ کے پاس موجود تھا۔ حقیقت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک کو شریعت اور دوسری کو طریقت کا نام دے دیا گیا۔ حج نماز روزہ زکوۃ سب ساقط کر دیئے گئے بلکہ ان اسلامی عقائد کی جگہ خود فراموشی وجد اور ریاضت کو قرب خداوندی کا وسیلہ بنایا گیا۔ ان حالات کو سامنے رکھ کر اقبال نے ساقی نامہ میں صحت مند احتجاج کیا:

مسلمان ہے توحید میں گرم جوش
مگر دِل ابھی تک ہے زنار پوش

تمدن تصوف شریعت کلام
بتان عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

عجم کے خیالات میں کھوگیا
یہ سالک مقامات میں کھوگیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے(۲۱)

عابد علی عابد شعر اقبال میں بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آپ خود غور کیجئے کہ رسول پاکؐ کے متعلق جب خود اقبال کا یہ خیال ہو تو وہ عقیدت کے اس مقام پہ ہوگا محبت کی کس منزل تک پہنچ گیا اور جب رسول پاک کا ذکر کرتا ہوگا تو کس طرح سرشار ہو کر کرتا ہوگا۔ اقبال کی سرشاری کی کیفیت یہ ہے کہ اس نے نہایت وضاحت سے یہ کہہ دیا ہے کہ خدا کے وجود سے انکار کرنا ممکنات میں سے ہے لیکن مقام رسالت اور شان نبوت سے انکار کرنا محال ہے۔''(۲۲)

آپ کو رسولؐ کی ذات سے بے حد لگاؤ تھا۔ اس بات کا اندازہ راج پال کے اس واقعے سے بھی لگایا جا سکتا ہے جب اس نے رنگیلا رسولؐ کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی مسلمانوں کے جذبات بھی مجروح ہوئے تھے مگر حکومت برطانیہ نے راج پال کو باعزت بری کر دیا۔ مگر علیم الدین یہ برداشت نہ کر سکا اور اس نے راج پال کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یوں حکومت برطانیہ نے علیم الدین کو پھانسی کا حکم دے دیا۔ اور یہ عشق محمدیؐ میں سرشار مجاہد ہمیشہ کے لیے زندہ و جاوید ہو گیا اور اقبال نے اس موقع پر جو الفاظ کہے تھے وہ عشق محمدی کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں کہ ہم پڑھے لکھوں سے تو وہ ان پڑھ ترکھان کا لڑکا کہیں زیادہ عقلمند نکلا ہم بحثوں میں الجھتے رہے وہ کامیاب ہو گیا۔

اسرار خودی کے یہ اشعار حضور انورؐ کی محبت میں جس انداز سے لکھے گئے ہیں وہ اہل دل کے لیے متاع گراں بار ہیں۔

در دلِ مسلم مقام مصطفیٰ است
آبروئے ما زنام مصطفیٰ است
طور موج از غبار خانہ اش
کعبہ رابیت الحرم کا شانہ اش (۲۳)

تفسیر اقبال میں بہار الہ آبادی نے بہت ہی خوبصورت طریقے سے اقبال اور عشق رسول کو ثابت کیا ہے اور جا بجا نعتیہ اشعار کے حوالے دیئے ہیں مثلاً لکھتے ہیں:

''معراج مبارک، انسانی صلاحیتوں کا منتہی ہے۔ جس کے متعلق علامہ اقبال نے کئی مقامات پر عجیب عجیب نکات بتائے ہیں اور قوم کو بیدار کرنے کے لیے اس سے بہت مفید نتائج اخذ کیے ہیں۔'' (۲۴)

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں (۲۵)

اقبال کو حج اور روضہ رسول کی بے حد خواہش تھی مولانا اسلم جراجپوری، ''آثارِ اقبال'' میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو اقبال کے آخری ایام میں سے ہے۔

''اس سال ان کا ارادہ حج کرنے کا تھا لیکن بیماری اور کمزوری کی حالت یہ تھی کہ کوٹھی سے باہر نکلنا بھی مشکل تھا کہتے تھے کہ میں دو سال سے ارادہ حج میں ہوں۔ عملاً جب موقع اللہ دے بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لیے ہیں جو اس سفر سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں سے کچھ سنایا بھی۔ مکہ سے مدینہ کی روانگی کے وقت کی ایک غزل لکھی ہے۔ جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

تو باش ایں جاہ با خاصاں پیامبر
کہ من دارم ہوائے منزل دوست (۲۶)

شہید علیم الدین کا جنازہ دیکھ کر اقبال شدید غم کی حالت میں تھے بیماری کی حالت میں بھی جنازے کو کندھا دیا۔ شہید علم الدین کی کامیابی پر خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے یعنی علامہ کو ان لوگوں سے بھی عقیدت تھی جن کو آپؐ سے محبت تھی۔ بانگ درا میں موجود نظم جواب شکوہ بھی عشق محمدیؐ کا پیکر

معلوم ہوتی ہے۔ علامہ کی یہ شاہکار نظم چند ایسے اشعار پر مشتمل ہے جو رحمت اللعالمین کے لیے بے پناہ عقیدت کی غمازی کرتے ہیں۔ جواب شکوہ کا ایک شعر ہے

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے (۲۷)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی جواب شکوہ میں موجود اقبال کے والہانہ جذبے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں

''اقبال کی اس دعوت عمل کا مرکزی نکتہ چونکہ عشق رسولؐ ہے۔ اس لیے نظم کے آخری حصے میں جذبہ عشق سے سرشار وہی والہانہ کیفیت موجود ہے جو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے اقبال پر عموماً طاری ہوتی تھی۔'' (۲۸)

جواب شکوہ کا ایک اور شعر عشق محمدیؐ سے بھرپور نظر آتا ہے:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں (۲۹)

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ''اقبال کی طویل نظمیں'' میں لکھتے ہیں:

''اقبال کے نزدیک راہ حق کے مجاہدوں کو عقل و عشق کے اسلحے سے لیس ہونا چاہیے ان کا مقصود خلافتِ الٰہی ہے۔ ان کا سب سے بڑا ہتھیار حب رسولؐ ہے۔ ''کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں'' کا مفہوم ہے کہ اگر مسلمان آپؐ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کر کے صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں تو پھر تقدیر بھی ان کے سامنے سرنگوں ہو جائے گی۔ یہ دنیا ہی نہیں پوری کائنات ان کے تصرف میں ہو گی۔'' (۳۰)

اقبال کا دل اسی عشق محمدیؐ کی بدولت روضہ رسول کی زیارت کو ترستا رہا۔ نوجوانی سے لے کر علالت کے دنوں تک اقبال کے دل میں روضہ اطہر پر حاضری کی شدید خواہش رہی جہاں بھی روضہ

رسولؐ پر حاضری کا ذکر آتا تو آپ کی آنکھیں آبدیدہ ہو جاتیں

اوروں کو دیں حضورؐ یہ پیغام زندگی

میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں (۳۱)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کو روضہ اطہر پر حاضری کی شدید خواہش کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ مشہور ہے کہ ایک دن علامہ اقبال کے والد مرحوم نے اقبال کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پوچھا اقبال تم ملکوں ملکوں پھرتے رہے لیکن روضۂ اطہر پر حاضری نہ دی۔ یہ سنتے ہی اقبال کی حالت غیر ہوگئی چہرہ سرخ ہو گیا آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اسی اندرونی درد و کرب کی حالت میں بڑی دھیمی آواز میں کہا وہاں کس منہ سے جاتا۔ یعنی اقبال ساری عمر یہی سمجھتے رہے کہ ابھی ان کا نفس اس قدر پاکیزہ نہیں ہے کہ آپؐ کے سامنے جا سکے۔ کیونکہ آپؐ کا نام لینے سے پہلے حتی الامکاں وضو کی کوشش کرتے تھے۔ مگر جب اقبال نے آخری عمر میں محسوس کیا کہ اب ان کا نفس کسی حد تک پاکیزہ ہو چکا ہے تو ان کی آنکھیں جواب دے چکی تھیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے چوں مرگ آید میں اقبال کے عوارض چشم کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعہ تحریر کیا ہے کہ ایک بار گھر میں ان کے عزم حجاز کا ذکر چھڑا تو علامہ کی ہمشیرہ نے کہا آپ کی آنکھوں میں پانی اتر رہا ہے۔ ایسی حالت میں حج کا سفر کس طرح کر سکتے ہیں۔ اللہ خیر رکھے اگلے سال آپریشن کے بعد چلے جایئے گا اس پر بڑے درد انگیز مگر پرشوق لہجے میں فرمایا ''آنکھوں کا کیا ہے آخر اندھے بھی تو حج کر ہی آتے ہیں''

ڈاکٹر تقی عابدی علامہ اقبال اور زیارت روضہ رسولؐ کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

''انہیں شرم کا احساس تھا اور وہ اپنے نفس کا مزید تزکیہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ افسوس جب اقبال اس تزکیہ نفس کی بدولت فنافی الرسولؐ کی منزل پر پہنچے تو بوڑھے اور بڑی حد تک معزور ہو چکے تھے۔ ان کی آنکھیں جواب دے چکی تھی۔ لیکن اس وقت بھی انہیں حضورؐ کے سامنے جانے سے شرمندگی تھی۔'' (۳۲)

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر

روز محشر عذر ہائے من پذیر

در حسابم رانگری ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

اے خدا تو دو عالم کا غنی ہے اور میں محتاج حشر کے دِن میرے گناہوں کو معاف کر دے اگر میرے صفحہ اعمال دیکھنا لازمی ہو تو اسے حضورؐ کی نظر سے بچا کر دیکھ لے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال کے ہاں عقل وفلسفہ سب عشق رسولؐ کے تابع ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس رباعی کے متعلق ایک دلچسپ بات بھی بتائی ہے کہ یہ رباعی غالباً ارمغان حجاز میں شامل ہوئی تھی۔ اقبال نے یہ رباعی اپنے تزکیہ نفس کی بدولت سب احباب کے سامنے پڑھی چنانچہ مولوی ابراہیم سب جج گوجرانوالہ نے جب رباعی محمد رمضان انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ کے سامنے پڑھی تو وہ بے ہوش ہو گئے۔ اور یوں اقبال نے ان کی التجا پر یہ رباعی مولوی محمد رمضان کو بخش دی۔:

> ''بعد ازاں اقبال کی خدمت میں خط تحریر کیا جس میں التجا کی کہ رباعی انہیں بخش دی جائے تا کہ مرنے کے بعد یہ رباعی ان کے ماتھے پر لکھ کر انہیں دفن کیا جائے'' (۳۳)

اقبال نے اس رباعی کے بجائے اسی موضوع کے متعلق ایک اور رباعی کہی جو ارمغانِ حجاز میں موجود ہے۔

به پایاں چو رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہؐ مارا
حساب من زچشم اونہاں گیر (۳۴)

اس کی تشریح کرتے ہوئے خواجہ حمید یزدانی لکھتے ہیں:

> ''جب یہ عالم پیرا اپنے اختتام کو پہنچے گا اور ہر پوشیدہ تقدیر کھل کر سامنے آجائے گی یعنی ہزاروں برس سے چلی آنے والی یہ دنیا ختم ہو جائے گی اور انسانوں کے اعمال ان کے سامنے آجائیں گے، اس وقت ہمیں حضور اکرمؐ کے سامنے رسوا نہ کیجیو ہمارے اعمال سے متعلق پوچھ گچھ

حضورؐ کی نگاہوں سے چھپا کر کیجیو تا کہ مجھے اپنے گناہوں اور خطاؤں پر حضورؐ کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔'' (۳۵)

حضور حق میں بھی اقبال نے ایک اور ایسی رباعی لکھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کو روضہ اقدس پر جانے کی کس قدر خواہش تھی۔

بدن واماندو جانم درتگ و پوست
سوئے شہری کہ بطحا در راہِ اوست
تو باش ایں جا و باخاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزل دوست (۳۶)

یہ شعر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اقبال کا جسم ناتواں اور کمزور ہو چکا تھا مگر وہ مدینے کا رخت سفر باندھنے کے آرزومند تھے:

''میرا جسم تھک گیا اور میری روح اس شہر کی طرف بھاگ دوڑ کر رہی ہے جس کی راہ میں بطحا (مکہ) آتا ہے یعنی حضور اکرمؐ کے شہر مدینہ کی طرف میری جان متوجہ ہے۔ تو یہاں یعنی مکہ میں اپنے خاص بندوں کے ساتھ مل بیٹھ مجھے تو اپنے محبوب (حضور اکرمؐ) کی منزل (مدینہ کی طرف جانے کی آرزو ہے'' (۳۷)

اقبال کو آپ کی ہستی سے اس قدر لگاؤ تھا کہ وہ اپنی بیماری کے لیے بھی عشق محمدیؐ اور درود کو بہترین اکسیر تصور کرتے تھے۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ اقبال ۳۔ اپریل ۱۹۳۶ء کو شیش محل میں سو رہے تھے کہ سر سید احمد خان کو خواب میں دیکھا جنہوں نے بیمار ہونے کی مدت پوچھی تو آپ نے جواب دیا کہ دو سال سے اوپر کی مدت گزر چکی ہے تو سر سید نے فرمایا:

''حضور رسالت مآب کی خدمت میں عرض کرو۔ اسی وقت ان کی آنکھ کھل گئی اور حضورؐ رسالت کی خدمت میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے کی خاطر اشعار ان کی زبان پر جاری ہو گئے۔ اسی عرض داشت نے بالاسحران کی مثنوی

"پس چہ باید کرد اقوام شرق" کی صورت اختیار کی۔"(۳۸)

اقبال جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے دوران مصر کے آثار قدیمہ دیکھنے میں مشغول تھے تو ہوٹل میں قیام کے دوران صاحب طریقت بزرگ سید محمد ماضی ابوالعزائم اپنے صاحبزادوں کے ساتھ علامہ سے ملنے کے لیے آئے۔ تو آپ کی طبیعت کو ناگوار گزرا کہ مجھے کہہ دیتے میں خدمت میں حاضر ہو جاتا مگر انہوں نے اقبال کے متعلق جو الفاظ کہے کہ آپ نے دین کو تمسک کیا ہے اور اگر میں دین کے تمسک کیے ہوئے برگزیدہ بندے کی خدمت میں خود حاضر ہوں گا تو مجھے بھی خوشی ہو گی اور میرے آقا حضرت محمدؐ کو بھی خوشی ہو گی یہ بات سننا تھی کہ اقبال کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔ آنسوؤں کا سیلاب تھا جو بے اختیار امڈ آیا تھا تو آپ نے جو فرمایا جاوید اقبال نے اس کو یوں نقل کیا ہے۔

"ایسا زمانہ بھی آ گیا ہے کہ لوگ مجھ گناہ گار کو متمسک بالدین سمجھ کر حضور خواجہ در جہاں کے ارشاد کے اتباع میں بغرض خوشنودی آنحضرتؐ ملنے آتے ہیں" (۳۹)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے اس مضمون میں اقبال کے عالم خیال میں کئی دفعہ آستانہ نبویؐ پر حاضری دینے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ علامہ اقبال کے دل میں عشق رسولؐ اس قدر موجزن تھا کہ اگر وہ حقیقت میں روضہ اطہر پر جانے سے ناکام ہوئے تو دوسری طرف عالم خیال میں کئی دفعہ آستانہ رسالتؐ پر حاضری کا شرف نصیب ہوا۔ مگر ہر دفعہ رنگ جدا تھا:

فرشتے بزم رسالتؐ میں لے گئے مجھ کو
حضور آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو

اقبال جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جا رہے تھے تو آپ نے منشی طاہر الدین کو ایک خط لکھا تھا کہ جس میں ایک واقعہ بیان کیا کہ جب سید علی امام نے میل و فرسنگ کا حساب لگا کر کہا تھا کہ اس وقت ہم ساحل مدینے کے سامنے سے گزر رہے ہیں تو اقبال کی آنکھیں نمناک ہو گئیں

خاک یثرب اقبال کو بے حد عزیز تھی کیونکہ وہاں اقبال کے دلبر رہتے ہیں۔ مگر بڑھاپے نے آرزو کو پایہ تکمیل کو نہ پہنچنے دیا۔

بایں پیری رہ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے در صحرا سرِ شام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ (۴۰)

خواجہ حمید یزدانی اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں (علامہ) نے اس بڑھاپے میں یثرب کا سفر کچھ اس انداز میں اختیار کیا کہ عاشقانہ سرور و مستی میں گاتا ہوا چلتا رہا اور میری یہ حالت و کیفیت بالکل اس پرندے کی طرح تھی جو صحرا میں شام کے وقت اپنے آشیانے کی طرف پرواز کرنے کی آرزو میں اپنے پر کھولتا ہے گویا میرے لیے یہ سفر انتہائی شادمانی اور سرور و مسرت کا سفر تھا۔'' (۴۱)

''اقبال کے حضور'' میں نذیر نیازی نے بیان کیا ہے کہ وہ جب اقبال سے ملنے آتے ہیں جہاں غلام احمد پرویز بھی موجود تھے۔ غلام احمد پرویز نے سفر حج کا ذکر چھیڑ دیا۔ تو اقبال نے جو جواب دیا وہ یوں رقم کرتے ہیں:

''ارادہ تو ہے بشرطیکہ صحت اجازت دے ورنہ اب کے نہیں تو اگلے سال سہی آگے جو اللہ کو منظور۔۔۔ایک طرح سے تو میں حج ہی کے راستے میں ہوں۔ چاہتا ہوں یہ راستہ جلد طے ہو جائے۔ پھر ذرا دم لے کر مگر بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا یہ راستہ طے تو ہو جاتا ہے لیکن مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔'' (۴۲)

اقبال کی حالت ناگفتہ بہ تھی جسم کمزور تھا آنکھوں میں چمک باقی نہ تھی۔ جسم نقاہت کا شکار تھا۔ مگر آپؐ کے دیدار کی طلب تھی کہ جاتی ہی نہ تھی۔

غم پنہاں کہ بے گفتن عیاں است
چو آید برزباں یک داستاں است

رہے پیر پیچ دراہی خستہ و زار

چراغش مردہ و شب درمیان است (۴۳)

اس شعر سے ایک تو اقبال کی صحت کا بھی معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ بات بھی ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے عالم خیال میں آستانہ نبوی پر حاضری دی۔ یہاں آپؐ سے عشق غم کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ راستہ الجھاؤ والا ہے اور مسافر تھکا ماندہ کمزور و ناتواں اور بیمار ہے۔ زندگی کا چراغ بجھ رہا ہے۔ ارادہ روضہ رسولؐ پر جانے کے لیے تیار کرتا ہے۔ مگر صحت ایسی نہیں ہے کہ وہاں تک جا سکیں۔ فارسی کے دو شعراء بھی حضورؐ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ اور ان کے اشعار بھی جذبہ عشق محمدیؐ سے سرشار نظر آتے ہیں۔ اقبال بھی عاشق رسولؐ تھے اور خود کو اس قافلے میں شریک سمجھتے تھے جو مکہ مدینہ کی طرف گامزن تھا۔

گہے شعر عراقی را بخوانم

گہے جامی زند آتش بجانم

ندانم گرچہ آہنگ عرب را

شریک نغمہ ہائے سار بانم (۴۴)

اقبال کو یقین تھا کہ امت مسلمہ کے مسائل کا حل صرف اور صرف حضور کی ذات سے وابستگی ہے۔ اور مسلمان جس زوال کا شکار ہیں ان سے صرف اور صرف حضور اکرم کی ذات ہی نکال سکتی ہے۔

دردن ما بجز دودِ نفس نیست

بجز دست تو سارا دسترس نیست

دگر افسانہ غم با کہ گو یم

کہ اندر سینہ با غیر از تو کس نیست (۴۵)

اقبال کے عشق رسولؐ کے جذبات کا مکمل احاطہ ناممکن ہے مگر خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر اقبال حضور اکرمؐ کے روضہ کی زیارت سے مستفید ہونے کے لیے چلے جاتے تو کبھی زندہ واپس نہ آتے بلکہ ادھر ہی اپنی جان قربان کر دیتے۔ اقبال کی یہ تمام نعتیہ شاعری جو ارمغان حجاز کا منبع معلوم ہوتی ہے۔ اسی عشق رسولؐ کا عکس ہے۔

نعت میں عموماً حضورؐ کے سراپا حسن و جمال، کمال وفضائل اور روضہ رسول کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ یہ سب باتیں پوری طرح سوز و گداز کے ساتھ اقبال کے عشق میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی اقبال کی نعتیہ شاعری کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

''نعتیہ کلام میں اقبال کا آہنگ جدا ہے۔ الفاظ اور ہیں سوز و گداز مختلف ہے اسلوب منفرد ہے عشق و مستی کے معیار اور پیمانے جو انہوں نے اپنے لیے بنائے ہیں تمام دوسرے پیمانوں سے بازی لے گئے۔'' (۴۶)

عشق دم جبرئیل عشق دم مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام (۴۷)

اقبال کا غم صرف اور صرف امت مسلمہ کی بدحالی تھی۔ وہ قوم کو قوم رسول ہاشمی بنانا چاہتے تھے۔ اپنے تمام غموں کا حل دربار رسالتؐ میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ وہ ملت کی ہدایت و کامرانی کی دعا بھی اسم محمدؐ کے وسیلے سے مانگتے ہیں۔

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اُجالا کر دے

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے نعتیہ کلام کی بحث کو بے حد خوبصورت الفاظ میں سمویا ہے۔

''ملت کا دار و مدار اور اس کے درماں کی طلب اقبال کی نعتیہ شاعری کا خاص رنگ ہے قوم کی بدبختی، بدحالی، بے کسی، ہدایت و کامرانی اور بے نوائی کا دکھڑا رنج و الم درد و غم کے ساتھ میر ملت و امم کے دربار میں سوز و گداز کے لہجہ میں سنایا جا رہا ہے اور ملت کی ہدایت کامرانی اور ترقی کی دعائیں مانگی جا رہی ہیں'' (۴۸)

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کے تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری (۴۹)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کی نعتیہ شاعری میں یہ واضح کیا کہ آپؐ کی تعلیمات سب کے لیے یکساں تھیں اور عورتوں کو آپؐ نے برابری کے حقوق دلوائے۔ اقبال کو بھی عورت کی آزادی اور حقوق

سے خاص شغف تھا۔ اقبال نے ان اشعار کو بھی شامل کیا ہے جو یمن کے قبیلے بنی طے کی بیٹی کے متعلق تھا۔

دخترک را چوں نبیؐ بے پردہ دید
چادر خود پیش روئے اوکشید (۵۰)

جب یمن کے قبیلے بنی طے کو اسلامی فوجوں سے شکست ہوئی اور سردار طے کی بیٹی کو اسیر بنا کر دربار نبویؐ میں پیش کیا گیا تو آپؐ نے اس کو اپنی چادر سے ڈھانکا اور آزاد کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال آپ کی ذات کو مرد کامل تصور کرتے ہیں اور آپؐ کے وجود کو بقا کا ضامن قرار دیتے ہیں

ماند شب ہا چشم او محروم نوم
تا بہ تخت خسروی خوابیدہ قوم (۵۱)

اقبال کا خیال ہے کہ آج امت مسلمہ طے قبیلے کی اس لڑکی سے بھی زیادہ برہنہ ہے۔ ہمارے کردار اور عمل کی وجہ سے احترام عالم میں ہماری کوئی عزت نہیں ہے۔ اس دنیا میں ذلیل ہونا ہمارے اعمال کی بدولت ہے مگر روز محشر صرف آپ پر امید ہے کہ آپ بھرم رکھ لیں گے۔

ما ازاں خاتوں طے عریاں تریم
پیش اقوام جہاں بیچادر یم
روز محشر اعتبار ماست او
در جہاں ہم پردہ دار ماست او (۵۲)

یہ نعتیہ شاعری بھی عشق محمدی کا ہی اجر تھی۔ اقبال عشق کے انتہائی درجے پر پہنچ چکے تھے۔ جہاں ان کا جسم اور روح دونوں ہی عشق محمدیؐ میں سرشار نظر آتے ہیں۔ اسی جذبے کی بدولت روضہ رسولؐ پر حاضری کے لیے آنکھیں بوڑھی ہوگئی مگر علالت کی آخری رات بھی کسی نعت کا ذکر کرتے رہے اور آنے والے ہر مہمان سے اسی نعت کے متعلق پوچھتے رہے جو جوانی میں سن رکھی تھی۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینۂ رنگ ترے محیط میں حباب

اقبال کے اس جامع شعر کی تشریح کرتے ہوئے خواجہ حمید یزدانی لکھتے ہیں:

''اے حضور اکرم آپ ہی لوح اور آپؐ ہی قلم ہیں۔ حضورؐ ہی کے ذریعے علم خدائی انسانوں پر ظاہر ہوا اور آپؐ ہی کا وجود مبارک قرآن کریم ہے کیونکہ آپؐ نے ہی انسانوں تک خدائی احکامِ پہنچائے۔ اس شیشے جیسے گنبد (آسمان) کی حیثیت آپؐ کے سمندر میں بلبلے کی سی ہے۔'' (۵۳)

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حاجی سردار محمد اقبال اور طالب علم اقبال ہم نشین کے حوالے سے تشریح بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''کہ آنحضرتؐ میں تن تنہا وہ تمام خوبیاں جمع تھیں جو علیحدہ علیحدہ تمام انبیاء اکرام میں ایک ایک کر کے موجود تھیں۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علی مرتبت اور افضل الانبیا بلکہ افضل البشر ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے۔'' (۵۴)

دیکھا گیا ہے کہ حضورؐ کا نام مبارک آتے ہی اقبال کا دل بھر آیا ہے اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی ہیں ڈاکٹر صاحب کی علالت کا سلسلہ عرصہ سے جاری تھا اور کبھی کبھی اخبار سے کوئی خبر مل جایا کرتی تھی مگر یہ بات مسلمان میں بھی نہیں تھی کہ قرآن کا مفسر اسلام، انسانیت کا ہمدرد، مسلمانوں کا غم خوار، اور دنیا کا ایک بڑا آدمی اقبال ہمیشہ کے لیے ہم سے اس قدر جلد مبرا ہو جائے گا۔

علامہ محمد اقبال کی دعا

ڈاکٹر تقی عابدی نے علامہ اقبال کی دعا کا ذکر کرنے سے پیشتر دعا کا مفہوم بیان کیا ہے:

''اگرچہ دعا کا لفظ عربی ہے لیکن یہ سہ حرفی لفظ اردو اور فارسی میں کسی ترجمہ اور تفسیر کا محتاج نہیں دین اسلام نے مسلمانوں کو دنیا اور عقبی کے لیے دعا کرنے کی تاکید کی ہے انسان عموماً ان خواہشات کے لیے دعا کرتا ہے جس میں اس کو امداد غیبی کی ضرورت ہوتی ہے۔'' (۵۵)

دعا کا مفہوم ادا کرتے ہوئے مولوی نور الحسن نور اللغات میں وضاحت کرتے ہیں کہ

''دعا۔ خدا سے مانگنا خواہش کرنا خدا سے درخواست کرنا، التجا، وہ فقرہ جس کا مقصود خدا سے درخواست کرنا۔'' (۵۶)

اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں دعا کا ترجمہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

''دعا کے معانی ہیں صلوٰۃ ذکر ضرب اور ورد کا ذکر بکثرت آتا ہے۔ دل میں کی جانیوالی عبادت کا مفہوم کسی حد تک ذکر اور فکر کی اصطلاحات سے ادا کیا جا سکتا ہے دعا میں ہمیشہ ایک باضابطہ استدعا کا تصور شامل ہوتا ہے چاہے یہ دعائے خیر ہو یا دعائے بد۔ حالات کے مطابق دعا (خدا سے استدعا کرنا) کی طرح کی ہو سکتی ہے اس بناء پر دعا کا ترجمہ ذاتی التجا کرنا بھی جائز ہے۔'' (۵۷)

سید ابو اعلیٰ مودودی نے تفہیم القرآں میں دعا کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''دعا آدمی اس ہستی سے مانگتا ہے جس کو وہ سمیع و بصیر اور فوق الفطری اقتدار کا مالک سمجھتا ہو اور دعا مانگنے کا قرب محرک دراصل آدمی کا یہ اندرونی احساس ہوتا ہے کہ عالم اسباب کے تحت فطری ذرائع و وسائل اس کی کسی تکلیف کو رفع کرنے یا کسی حاجت کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ثابت ہو رہے ہیں۔ اس لیے کسی فوق الفطری اقتدار کی مالک ہستی سے رجوع کرنا ناگزیر ہے یہ سب کچھ اس عقیدے کی بناء پر ہوتا ہے کہ وہ ہستی اس کو ہر جگہ ہر حال میں دیکھ رہی ہے اس کے دل کی بات بھی سن رہی ہے اور اس کو ایسی قدرت مطلقہ حاصل ہے کہ اس کو پکارنے والا جہاں بھی ہو وہ اس کی مدد کو پہنچ سکتی ہے اور اس کی بگڑی بنا سکتی ہے۔'' (۵۸)

سید منیر حسین اپنے تحقیقی مقالے ''اقبال کی دعائیہ شاعری میں بیان کرتے ہیں

''اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے وہ ہر صورت میں اپنے بندوں کو مختلف نعمتوں سے نوازنا چاہتا ہے تا کہ تہی دامن بندے اس

کے بیکراں لطف و کرم سے اپنی جھولیاں بھرتے رہیں۔'' (۵۹)

حضرت امام جعفر صادق کے حوالے سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا:

''دعا مومن کا اسلحہ ذہن کا سکون اور زمین و آسماں کا نور ہے۔'' (۶۰)

حضرت ابن مسعود کہتے ہیں کہ رسولؐ نے فرمایا:

''تم خداوند تعالیٰ سے اس کا فضل مانگا کرو اس لیے کہ خدا تعالیٰ مانگنے کو بہت پسند کرتا ہے اور بہترین عبادت کشادگی کا انتظار ہے۔'' (۶۱)

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں سید نذیر نیازی نے مشہور امریکی نفسیات دان پروفیسر ولیم جیمز کی ایک عبارت خصوصیت سے لکھی ہے۔

''سائنس کچھ بھی کہے مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے دعا یا عبادت کا سلسلہ بھی قائم رہے گا۔ الا یہ کہ ہم انسانوں کی ذہنی ساخت میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا ہو جائے مگر اس کا جہاں تک ہمارے علم سے تعلق ہے کوئی امکاں نہیں دراصل دعا کو تحریک ہوتی ہے تو اس لیے کہ اختیارِ نفس انسانی کے اگرچہ کئی مراتب ہیں بایں ہمہ اس کی تہوں میں ایک نفس اجتماعی پوشیدہ ہے جسے اپنا سچا ہمدم کسی مثالی دنیا ہی میں مل سکتا ہے۔ لہٰذا کتنے انسان ہیں جو ہمیشہ نہیں تو اکثر اس ہمدم صادق کی تمنا اپنے سینوں میں لیے پھرتے ہیں اور جس کی بدولت ایک حقیر سا انسان بھی جسے بظاہر لوگوں نے دھتکار رکھا ہو محسوس کرتا ہے کہ اس کی ہستی بھی اپنی جگہ پر کچھ ہے۔'' (۶۲)

علامہ اقبال کا یقین تھا کہ دعا کی ضرورت ہر انسان کو ہر وقت اور ہر عہد میں رہے گی اس کی ضرورت سے انکار ممکن نہیں ہے یہ محض تسکین قلب کا ذریعہ ہے بلکہ اس سے انسانی زندگی کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ اور انسان کے سیرت و کردار کی تعمیر ممکن ہوتی ہے۔ دعا میں ایک وہ مقام ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

اقبال نے جس طرح خودی کے ساتھ بیخودی کو ضروری قرار دیا اسی طرح وہ انفرادی دعا کے ساتھ ساتھ اجتماعی دعا اور عبادت کے بھی قائل ہیں۔ ان کے خیال میں اس کے ذریعے ہمارا مقصد زیادہ کامیابی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ انفرادی عبادت کے مقابلے میں اجتماعی عبادت اور دعا میں خلوص وصداقت کا رنگ زیادہ ہوتا ہے۔ اجتماعی عبادت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اقبال اپنے خطبے میں کہتے ہیں:

"لہٰذا دعا خواہ انفرای ہو خواہ اجتماعی ضمیر انسانی کی اس نہایت درجہ پوشیدہ آرزو کی ترجمان ہے کہ کائنات کے ہولناک سکوت میں وہ اپنی پکار کا کوئی جواب سنے یہ انکشاف وتجسس کا وہ عدیم المثال عمل ہے جس میں طالب حقیقت کے لیے نفی ذات ہی کا لمحہ اثبات ذات کا لمحہ بن جاتا ہے۔ اور جس میں وہ اپنی قدر وقیمت سے آشنا ہو کر بجا طور پر سمجھتا ہے کہ اس کی حیثیت کائنات کی زندگی میں سچ مچ ایک فعال عنصر کی ہے یہی وجہ ہے کہ نفس انسانی کی اس روش کے پیش نظر جو دعا میں اختیار کی جاتی ہے اسلام میں صلوٰۃ میں نفی واثبات دونوں کی رعایت ملحوظ رکھی۔" (۶۳)

علامہ اقبال کو دعا پر بہت یقین تھا اور شادی کے بعد اولاد کی دعا بھی کرتے رہے جو مستجاب ہوئی۔ خالد نذیر صوفی اقبال درون خانہ میں تحریر کرتے ہیں:

"میری شادی کو تقریباً بارہ تیرہ برس گزر گئے۔" (۶۴)

یعنی اقبال نے اولاد کے لیے دعا بھی کی۔

دعا مستجاب کرنا یا نہ کرنا تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ دعا قبول ہو یا نہ ہو یہ انسان کی روحانی تربیت کا سامان ضرور فراہم کرتی ہے یہ انسان کی قلبی وروحانی تربیت کر کے اس وسیلے تک لے جاتی ہے جہاں عام حالات میں کسی کا پہنچنا انسان کے اختیار میں نہیں۔ دعا کے ذریعے انسان کے دل میں امید پیدا ہوتی ہے۔ خدا کی ذات پر بھروسہ بڑھتا ہے۔ ہر مشکل کا مقابلہ کرنا انسان کی عادت بن جاتی

ہے۔ڈاکٹرعشرت حسن انوراقبال کی مابعدالطبیعیات میں تحریر کرتے ہیں

''اقبال کے نزدیک دعا اولاً قلب انسانی کے لیے جبلی ہے کہ آدمی کو دعائے خیر کے بغیر چارہ نہیں۔ بر ملا اور رہنمائی حاصل کرنے کی ایک شدید آرزو کا نام ہے اور اس لحاظ سے تمام مذہبی شعور کا ایک اہم عامل یا عنصر ہے۔ ثانیاً دعا تامل کا ایک انداز ہے اس کا مقصد روحانی تنویر ہے لہٰذا دعا کا عمل انسانی ایشور اور حقیقت مطلقہ کے مابین رابطہ قائم کر دیتا ہے ثانیاً دعا اپنا ایک اثر رکھتی ہے وہ ہمارے جذبات کو عمیق تر اور ہمارے ارادے کو حرکی بناتی ہے اور اس طرح گردوپیش کی دنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں لانے کی طاقت وقدرت عطا کرتی ہے۔'' (۶۵)

یہ وہ بحث تھی جس کے متعلق ڈاکٹر تقی عابدی نے لکھا ہے کہ دعا کسے کہتے ہیں؟ دعا کس سے مانگی جاتی ہے۔ دعا کس طرح کی جاتی ہے۔ دعا کس چیز کی کرنا چاہیے؟ دعا میں وسیلے کی کیا اہمیت ہے۔ یہ بحث بہت طویل ہے۔ اور ڈاکٹر تقی عابدی نے اس بحث کو خارج ازمحل قرار دیا ہے۔ موضوع کی طرف واپس آتے ہوئے اقبال کی بانگ درا میں موجود دو دعائیہ نظموں کا ذکر ڈاکٹر تقی عابدی نے بطور خاص کیا ہے جن میں بچے کی دعا اور دوسری ''دعا'' کے زیر عنوان لکھی گئیں ہیں۔ بانگ درا میں موجود ان دونوں نظموں کا ذکر ڈاکٹر تقی عابدی نے ضرور کیا ہے مگر ان کے متعلق تفصیل کے ساتھ نہیں لکھا ہے۔ بچے کی دعا کچھ یوں ہے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

مرے اللہ ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پر چلانا مجھ کو (٦٦)

اقبال نے یہ دعا ایک بچے کے منہ سے کہلوائی ہے یہ دعا ان کی اپنی ہے اور وہ یہ دعا تمام امت مسلمہ سے منگوانا چاہتے تھے لیکن بچے کے منہ سے نکلا ایک ایک حرف اثر انگیز دکھائی دے رہا ہے میزان اقبال میں محمد منور تحریر کرتے ہیں:

"یہ بھی ایک انداز بیاں ہے کہ شاعر خود کچھ کہنے کے بجائے اپنے خیالات کا دوسروں کی زبانی اظہار کرے۔ جو گفتہ آید در حدیث دیگراں کا مصداق ہے۔"(٦٧)

ڈاکٹر تقی عابدی نے بانگ درا کی جس دوسری نظم کا ذکر کیا ہے اس کا عنوان "دعا" ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے براہ راست خدا تعالیٰ کو مخاطب کر کے مسلمانوں کے لیے دعا مانگی ہے۔ کہ خدا تعالیٰ مسلمانوں کو پھر سے اوصاف حمیدہ عطا فرمائے۔ اور اسلاف کی طرح کامیابی سے ہمکنار کرے۔ تاکہ مسلمان اپنی عظمت رفتہ پھر سے حاصل کر سکیں۔ ڈاکٹر محمد ریاض اس نظم کی بابت تحریر کرتے ہیں۔

"یہ دعا جہاں ایک طرف علامہ کی خود شناسی کو ظاہر کرتی ہے وہاں ملت اسلامیہ کے لیے ان کا درد و سوز اس سے ظاہر ہوتا ہے وہ آرزومند تھے کہ ان کے افکار اور خیالات عالم انسانی میں اور خصوصاً عالم اسلام میں پھیلیں۔"(٦٨)

بانگ درا کی وہ نظم کچھ یوں ہے۔

یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
پھر وادی فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے
پھر شوق تماشا دے پھر ذوق تقاضا دے
محروم تماشا کو پھر دیدہ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

پیدا دل ویراں میں پھر شورش محشر کر
اس محمل خالی کو پھر شاہد لیلا دے
اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو
وہ داغ محبت دے جو چاند کو شرما دے
رفعت میں مقاصد کو ہمدوش ثریا کر
خودداری ساحل دے آزادی دریا دے
بے لوث محبت ہو بیباک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر دل صورت مینا دے
احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشہ فردا دے
میں بلبل نالاں ہوں اک اجڑے گلستان کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے(۶۹)

اس دعا کے حوالے سے اقبال کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے سید منیر حسین تحریر کرتے ہیں:

''زندہ تمنا زندگی کی علامت ہے اسی سے دل میں حرارت اور روح میں تڑپ پیدا ہوتی ہے شوق تماشا میں آرزومندی اور ذوق تقاضا میں تحریک اور فعالیت ہے علامہ اقبال نے دونوں پر زور دیا ہے۔ انسان کی آرزوئیں امنگوں اور ولولوں کے پیچھے صرف زندہ تمنا ہی برسر عمل ہوتی ہے۔ زندہ تمنا کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے لیے چشم بینا کی دعا کی ہے۔ کہ وہ بصیرت کی روشنی سے محروم ہو چکے ہیں انہیں پھر سے چشم بینا عطا فرما۔ علامہ اقبال نے خود چشم بینا کی دعا کی ہے کیونکہ چشم بینا ایک خاص بصیرت کی حامل ہوتی ہے۔''(۷۰)

اس دعا میں علامہ اقبال نے امت مسلمہ کے اتحاد و استحکام کی دعا کی ہے۔ تاکہ ماضی کی طرح روشن مستقبل دوبارہ سے حاصل کر سکیں۔ اقبال نے اس نظم میں آرزومندی شوق تماشا ذوق تقاضا دیدہ بینا اور خودداری کے جوہر دکھائے ہیں اس کے اندر عمل کا پیغام بھی ہے۔ اس نظام کو بلاشبہ قومی نظم یا قومی دعا کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہ دو نظمیں تھیں جن کا ذکر تو ڈاکٹر تقی عابدی نے کیا مگر وضاحت نہیں کی تھی۔ ان دو دعائیہ نظموں کے علاوہ اقبال کی ایک اور دعائیہ نظم کا بھی تذکرہ ڈاکٹر تقی عابدی نے کیا ہے جو فارسی کی کتاب زبور عجم کا حصہ ہے اس کا عنوان بھی ''دعا'' ہی ہے اس دعا کے متعلق ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

''اس نظم کے تجزیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے جو دعائیں مانگی تھیں وہ سب کی سب قبول ہوئیں یہ نظم لفظ ''یارب'' سے شروع ہو کر ''بدہ'' یعنی دے پر ختم ہوتی ہے عام انسانوں کی دعاؤں میں شخصی مسائل اور دنیاوی معاملات جن میں مال و عزت اولاد طویل عمر کسب جاہ و چشم جیسے امور شامل ہوتے ہیں لیکن علامہ کی دعا میں ایسی کوئی چیز شامل نہیں۔ اگرچہ یہ دعا براہ راست موصوف کے لیے تھی۔'' (۷۱)

اس دعا میں علامہ اقبال نے اپنی متعدد آرزوؤں کا اظہار کیا ہے دعا کے ساتھ ساتھ دعا مانگنے کے مختلف انداز بھی سامنے آتے ہیں۔ اقبال نے خودشناسی اور خداشناسی کو بھی مدِنظر رکھا ہے۔ نظم

کے دوران مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا مانگنے والا کوئی عام بندہ نہیں بلکہ کوئی خداشناس آدمی ہے جو اپنی حیثیت کو بخوبی جانتا ہے اور اپنے آپ کو عاجز و درماندہ محسوس نہیں کرتا۔

یارب درون سینہ دل با خبر بدہ　　در بادہ نشہ رانگرم آں نظر بدہ
این بندہ را کہ بانفس دیگراں نزیست　　یک آہِ خانہ زاد مثل سحر بدہ

سلیم مرا بجوی تنگ مایۂ مپیچ
جولانگہی بوادی و کوہ وکمر بدہ
سازی اگر حریف یم بیکراں مرا
بااضطراب موج سکونِ گہر بدہ
شاہین من بصید پلنگان گذاشتی!
ہمت بلند وچنگل ازین تیز تر بدہ
رفتم کہ طایران حرم را کنم شکار
تیری کہ ناقگندہ وفتد کارگر بدہ (۷۲)

اقبال اللہ تعالیٰ سے باخبر دل کی دعا کرتے ہیں کیونکہ مومن کی پہچان اس کا بیدار دل ہی تو ہے۔ جو تلاوت قرآن پاک اور آیات معرفت کی تلاوت کرتا رہے ایسی شراب کے پوشیدہ نشے کو دیکھ سکے۔ اگر ایک کافر کا دل بیدار ہے تو وہ غافل مسلمان سے بہتر ہے۔ یہ اسی دعا کا اثر تھا کہ اقبال ایک باخبر اور زندہ شاعر کے طور پر مشہور ہوئے۔ اقبال نے یہاں پوشیدہ نشہ سے مراد نظر معرفتِ الٰہی مراد لیا ہے۔ نظر بصیرت جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کو دیکھ اور محسوس کر سکے اقبال ذاتی محنت اور مشقت کے قائل تھے۔ اسی لیے اللہ سے دعا کرتے ہیں:

"اس بندے کو دوسروں کے خیراتی سانسوں پر زندہ نہ رکھ سحر کی طرح
ایک ذاتی شعلہ اور روشن آہ عطا کردے۔" (۷۳)

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے شاعری میں اتنی محنت کی کہ تائید الٰہی حاصل کر لی۔ رموز بیخودی میں اقبال کی محنت عروج پر نظر آتی ہے۔ اقبال چاہتے تھے کہ ان کے خیالات محدود نہ رہیں بلکہ لامحدود لوگوں کے ذہنوں سے گزر جائیں اسی لیے دعا کرتے ہیں کہ ان کے خیالات کے سیلاب کو تنگ

نہروں سے نہیں بلکہ وادیوں کہساروں اور میدانوں میں بکھیر دے اور اقبال کی یہ دعا قبول ہوگئی۔ آج اقبال مشرقی شاعر کے طور پر پوری دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان پر نصف صدی میں چار ہزار سے زائد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اقبال کی شہرت سے بہت لوگ جلنے لگے تھے۔ ان پر مختلف قسم کے الزامات لگائے جا رہے تھے کفر کے فتوی منبروں سے دیئے گئے۔ شکوہ کی کاپیاں خرید خرید کر جلائی گئی۔ لیکن پھر بھی یہ چراغ جلتا رہا۔ ڈاکٹر تقی عابدی اقبال کی دعا کو یوں بیان کرتے ہیں:

''کیونکہ مرا حریف موجود ہے اس لیے میرے دریائے بیکراں کو موجوں کا اضطراب اور موتی کا سکون عطا فرما۔'' (۷۴)

ان الزامات، بہتان اور الزامات کا مقابلہ اقبال نے شاہین کی طرح تیز پنجوں کے ساتھ کیا۔ اقبال کی ساری زندگی بڑی بڑی طاقتوں کے ساتھ دست و پنجہ زم کرتے گزر گئی۔ مشرق و مغرب کے حاسد اقبال کے ساتھ شرارتیں کر رہے تھے۔ مگر اقبال اس جنگ میں کامیاب رہے۔ اور شاہین کے پنجوں کی طرح درندوں کو کریدتے رہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی آخری شعر کی دعائیہ تشریح کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''میں حرم کے پرندوں کے شکار کے لیے جا رہا ہوں مجھے ایسے تیر دے جو ہدف پر لگیں اور جو ٹوٹ کر بیکار نہ ہو جائیں'' (۷۵)

اقبال عاشق امام حسینؓ

علامہ اقبال نے تکبیر امام حسین کو حقیقی فقر قرار دیا ہے۔ وہ فقر جس کے متلاشی ساری عمر علامہ محمد اقبال رہے۔ حضرت امام حسین نے اہل بیت کی قربانی دے کر نوع انسانی کو آزادی کا پیغام دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال حضرت امام حسین سے والہانہ عشق کرتے تھے۔ حضرت امام حسینؓ کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد عبدالمعبود تحریر کرتے ہیں:

''حسین نام ابوعبداللہ کنیت سید شباب اہل الجنہ اور ریحانہ النبی لقب والد گرامی قدر علیؓ اور سیدہ بتول جگر گوشہ رسول فاطمہ ماجدہ تھیں۔ اس لحاظ سے آپ کی ذات ستودہ صفات قریش کا خلاصہ اور بنی ہاشم کا عطر تھی

شجرِ طیبہ یہ ہے حسین بن علی بن ابی طالب بن ہاشم بن عبد مناف قریشی ہاشمی وطلبی"(۷۶)

حضرت امام حسینؓ کی پیدائش کے متعلق ایک واقعہ بھی حضرت ام فضل بنت حارث سے منسوب ہے۔ حضرت ام فضل بنت حارث نے خواب میں دیکھا کہ رسول کریمؐ کے وجود مبارک کا ٹکڑا کاٹ کر اُن کی گود میں ڈال دیا گیا۔ وہ یہ خواب دیکھ کر بہت پریشان ہوئے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خوشخبری دی کہ حضرت فاطمہؑ کے ہاں بیٹا پیدا ہو گا جو تمہاری گود میں ڈالا جائے گا۔ حضرت امام حسینؓ کا زمانہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کا زمانہ تھا واقعہ کربلا کی وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد عبدالمعبود تحریر کرتے ہیں:

"سیدنا حسنؓ کے دستبردار ہو جانے کے بعد ۵۶ھ میں جب امیر معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کے لیے بیعت لینا چاہی تو سیّدنا حسینؓ بھی ان حضرات کے ساتھ جو اس بیعت کے حق میں نہیں تھے۔ یزید کی ہمنوائی اور اس کی بیعت سے انکار اور گریز بالآخر میدان کربلا میں خانوادہ نبوت کی شہادت پر منتج ہوا۔ بالآخر وہ قیامت خیز ساعت بھی آگئی کہ فلک امامت کا آفتاب میدان جنگ کے اُفق پر طلوع ہوا طویل اور شدید جنگ کے بعد محرم الحرام ھ مطابق ستمبر ۶۸۱ کو خانوادہ نبوی کا آفتاب ہدایت ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔"(۷۷)

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے مسلمانوں کو تعلیم دی ہے کہ وہ عزلت نشینی کی زندگی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر حضرت امام حسینؓ کے نقش قدم پر چلیں۔ پیام مشرق میں کہتے ہیں:

تیروسناں و خنجر و شمشیرم آرزوست
بامن میا کہ ملک شبیرؓم آرزوست"(۷۸)

اقبال چاہتے تھے کہ مسلمان حضرت امام حسینؓ کی طرح ایثار و قربانی کے جذبے سے مالا مال ہوں ان کے اندر امام حسینؓ کا فقر موجود ہو ارمغان حجاز میں مسلمانوں کو مسلک شبیریؓ کی دعوت دیتے ہیں:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیریؓ

کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دیگری (۷۹)

حضرت امام حسین وہ شخص ہیں جنہوں نے باطل کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ انہوں نے اپنے نانا حضرت محمدؐ کے دین کی پاسداری کی خاطر اپنا سارا خاندان خون کی نظر کر دیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے جتنا خوب صورت یہ مضمون حضرت امام حسینؓ پر لکھا ہے اسی لحاظ سے حضرت معین الدین چشتیؒ کے اس شعر کا بیان کیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔

شاہ است حسینؓ بادشاہ است حسینؓ

دین است حسینؓ دین پناہ است حسینؓ

سرداد نداد دست در دست یزید

حقا کہ بنائے لاالہ است حسینؓ

اقبال نے تو حضرت امام حسینؓ کو داستان حرم کی انتہا قرار دے دیا۔

غریب و سادہ و رنگین ہے داستان حرم

نہایت اس کی حسینؓ ابتداء ہے اسماعیل (۸۰)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے جذبات کو بہت ہی خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔

''علامہ فرماتے ہیں کہ کعبہ کی داستان سادہ اور دلچسپ ہوتے ہوئے بھی عجیب اور غریب معلوم ہوتی ہے اس کی بناء جو حضرت ابراہیمؑ نے رکھی اس کے قیام میں حضرت اسمائیلؑ نے شدت تشنگی سے ایڑیاں رگڑی۔ حضور اکرمؐ نے اسے بتوں سے پاک کیا اور حضرت امام حسینؓ نے اس کی حرمت کو اپنی جان و مال کی قربانی دے کر بام عروج پر پہنچایا۔ اور قیامت تک کے لیے محکم بنا دیا۔ امام حسین عشق الٰہی کے پیامبر تھے اور دوسرے پیامبران عشق کی طرح اپنے عشق کا اظہار کر رہے تھے۔'' (۸۱)

ڈاکٹر محمد اقبال نے رموز بیخودی میں واقعہ کربلا کی مکمل تفسیر بیان کی ہے۔

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت

حریت را زہر اندر کام ریخت

خاست آں سر جلوہ خیر الامم

چوں سحاب قبلہ باراں در قدم

برزمین کربلا بارید و رفت

لالہ در ویرانہ ھا کارید و رفت

تا قیامت قطع استبداد کرد

موج خوں او چمن ایجاد کرد (۸۲)

اقبال خود بھی ملوکیت کے سخت مخالف تھے حضرت امام حسینؓ نے بھی ملوکیت کی مخالفت کی۔ حضرت امام حسین کا پسندیدہ نظام خلافت اسلامی تھا۔ لیکن اب خلافت برائے نام بھی باقی نہ رہی تھی۔ ملوکیت اپنا میدان بنانے چلی تھی۔ قرآنی اصولوں کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ آزادی کو سلب کرلیا گیا۔ وہ دین جس کی خاطر آپؐ نے مشکلات کو برداشت کیا اب پھر سے دنیا سے رخصت ہونے جا رہا تھا۔ چنانچہ اپنے نانا کے دین کو بچانے کے لیے محمدؐ کے نواسے حضرت امام حسینؓ آگے بڑھے۔ ظالمانہ نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے حضرت امام حسین ابر باراں کی طرح برسے۔

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت

سطر عنوان نجات ما نوشت (۸۳)

میدان کربلا میں مسلمانوں کی تعداد کا ذکر کرتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں

دشمنان چوں ریگ صحرا لا تعد دوستاں او بہ یزداں ہم عدد (۸۴)

دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اقبال نے ریت کے ذروں کے برابر بتائی ہے۔ جب کہ امام حسینؓ کے جاں نثاروں کی تعداد صرف بہتر تھی۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے یہ تعداد یزداں کے برابر بتائی ہے۔ تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

"جب کہ آپ کے جانباز دوست صرف یزداں کے ہم عدد یعنی بہتر (۷۲)

نتیجے (یزداں = ی = ۱۰ ز = ۷ د = ۴ ا = ۱ ن = ۵۰ = ۷۲" (۸۵)

ڈاکٹر تقی عابدی نے حضرت علی کے متعلق ان اشعار کو بھی بیان کیا تھا جو حضرت اقبال نے حضرت علی کی تعریف میں لکھے:

آں امام عاشقاں پور بتولؓ سرو آزادے ز بستانِ رسولؐ
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر معنی ذبح عظیم آمد پسر (۸۶)

یعنی حضرت امام حسینؓ کے والد وہ تھے جو بسم اللہ کا نقطہ ہیں اور یہی نقطہ خلاصہ قرآن ہے۔ اسی طرح اقبال نے حضرت امام حسین کو اتنا ہی اہم قرار دیا ہے۔ جتنا کہ قل ھواللہ احد:

درمیان امت آں کیواں جناب
ہمچو حرف قل ھواللہ در کتاب (۸۷)

حضرت امام حسینؓ نے حق اور باطل میں فرق کو مٹانے کے لیے میدان کربلا میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا اور حق کو قیامت تک کے لیے صرف خدائے واحد کے آگے جھکنے کا درس دیا۔ اسی حق و باطل کی جنگ کو مٹانے کے لیے غزوہ بدر لڑی گئی۔ یہی جنگ موسیٰ اور فرعون کے درمیان جاری رہی مگر جیت ہمیشہ عشق کی ہوئی۔ اقبال نے حق و باطل کی پیکار کے متعلق یوں شعری اظہار کیا ہے۔

موسیٰ و فرعون و شبیرؓ و یزید
ایں دو قوت از حیات آید پدید

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی (۸۸)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مضمون میں کاملیت کے ساتھ حضرت امام حسینؓ کی شخصیت کو شعری انداز میں پیش کیا ہے۔ قرآن کا راز بھی شہادت امام حسین میں مضمر ہے۔

رمز قرآن از حسینؓ آموختم
ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم (۸۹)

حضرت امام حسینؓ نے دین کی سربلندی کے لیے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی قیمتی جانوں کا نذرانہ دے کر وہ عظمت اور فضیلت حاصل کی جس کی نظیر نہ پہلے ملی تھی نہ ملے گی۔

حقیقت ابدی ہے مقام شبیریؓ

بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی (۹۰)

علامہ اقبال تلاوت قرآن پاک بہت خوش الحانی سے کرتے تھے۔ اور روتے تھے۔ اسی طرح عشق رسولؐ میں بے حد آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ حضرت امام حسینؓ کی ذات سے اس قدر لگاؤ تھا کہ بادِ صبا سے گزارش کرتے ہیں کہ اس عشق دور افتادہ کے آنسوؤں کو حضرت کے مزار تک پہنچا دے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے حضرت امام حسینؓ سے اقبال کی وابستگی کا اختتام ارمغان حجاز کے اشعار سے کرتے ہیں۔

قلندر میل تقریری ندارد

بجز این نکتہ اکسیری ندارد

ازاں کشت خرابی حاصل نیست

کہ آب از خونِ شبیریؓ ندارد (۹۱)

منقبت حضرت فاطمہؓ (اقبال کی قلبی واردات)

حضرت فاطمہ الزہراؑ کو خاتون جنت کہا جاتا ہے۔ آپ نہایت مخلص، عبادت گزار زہد و تقوی کی پیکر تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے رموز بیخودی میں حضرت فاطمہ الزہراؑ کو تمام مسلمان عورتوں کے لیے اسوہ کاملہ قرار دیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے منقبت حضرت فاطمہ پر مشتمل یہ ۱۹۔ اشعار کی نظم پر بحث کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ چونکہ اقبال اہل بیت پر لکھتے ہوئے بہت ہی باریک بینی سے اور اساتذہ کے مشوروں سے کام لیا کرتے تھے۔ لہٰذا کئی ہفتے اس نظم پر غور و فکر کرنے کے لیے صرف کیے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے علامہ کے حضرت فاطمہؓ سے عشق کو مولانا گرامی کو لکھے گئے پانچ خطوط کے ذریعے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ان خطوط کو بیان کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ مولانا گرامی کا علامہ سے تعلق کو واضح کرسکیں۔ تحریر کرتے ہیں:

”مولانا عبدالقادر گرامی جالندھری سے علامہ اقبال کے تعلقات ۱۹۰۲ء سے برقرار تھے۔ وہ ۱۹۱۷ تک حیدر آباد دکن کے شاہی دربار سے

منسلک رہے اور ملک الشعراء قرار پائے۔ آخری عمر میں ہوشیار پور آ گئے۔
جہاں ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ محمد عبداللہ قریشی نے مکاتب اقبال
بنام گرامی کے عنوان سے ان کے (۹۰) خطوط شائع کیے ہیں" (۹۲)

مولانا گرامی سے اقبال کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ اس کے لیے ڈاکٹر تقی عابدی نے الگ سے ہی ایک مضمون "اقبال کے عرفانی زاویے" میں رکھا ہے۔ گرامی کا ذکر تو بارہا مضمون میں خطوط کے حوالے سے آیا ہے۔ انہوں نے اس جگہ پر اقبال اور گرامی کے تعلقات کو بھی بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے گرامی کے نام پہلا خط جو منقبت حضرت فاطمہ کے متعلق شامل کیا ہے وہ ۲۸ جون ۱۹۱۷ء کو لکھا گیا:

"کہ آج کل فاطمہ الزہراء کا مضمون زیرِ نظر ہے دو شعر لکھے تھے جو
ذیل میں عرض کرتا ہوں بہ نظر اصلاح اور رائے سے آگاہ کیجئے"۔ (۹۳)

بہر محتاجی دلش آنگو نہ سوخت با یہودی چادر خودرا فروخت

رانا غلام یٰسین بادہ ناب میں حضرت فاطمہ الزہراؓ کا ذکر ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

"حضرت فاطمہؓ کے اعزاز کے لیے اللہ تعالیٰ نے تین فضیلتیں پیدا
کیں پہلی کہ آپ حضور اکرمؐ کی محبوب صاحبزادی تھیں۔ دوم حضرت علیؓ کی
حرم تھیں۔ اور سوم کہ حضرت حسن اور حسین کی والدہ تھیں۔ اقبال وفور جذبات
وعقیدت میں یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر اسلام میں قبر پر جھکنا یا سجدہ تعظیم بجا
لانا ممنوع نہ ہوتا تو میں حضرت فاطمہؓ کے مزار کا طواف کرتا اور ان کی خدمت
میں اپنے سجدوں کا نذرانہ پیش کرتا۔" (۹۴)

حضرت فاطمہ الزہراءؓ صبر و رضا کی پیکر تھیں کیونکہ وہ ادب اور صبر و رضا کی آغوش میں پلی تھیں۔ حضرت فاطمہؓ کی عادت تھی کہ چکی پیستے ہوئے بھی قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول رہتی تھیں۔ حضرت فاطمہؓ کا لقب بتول بھی ان خصوصیات کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ مولانا محمد عبدالمعبود تذکرہ اہل بیت اطہار میں علامہ قسطلانی کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

"انہیں بتول کا لقب اس لیے دیا گیا کہ اپنے زمانہ کی عورتوں سے

حسن شرافت، فضل وکمال، حسب ونسب اور دین و دانش کے اعتبار سے بہت معزز تھیں (یعنی الگ تھیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سیّدہ نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے اپنے آپ کو لوگوں سے الگ کرلیا تھا اس لیے یہ لقب عطا ہوا۔" (۹۵)

حضرت فاطمہ الزہراء زہد وقناعت، ورع وتقویٰ اور روحانی فضل وکمال کے اس مرتبے پر فائز ہوئیں جہاں ان کے دور کی کوئی عورت نہ پہنچ سکی اور نہ آج کے دور کی کوئی عورت پہنچ سکتی ہے۔ انہوں نے سچائی کے پاکیزہ، مبارک اور مقدس مقام کو حاصل کیا۔ علامہ اقبال نے یکم جولائی ۱۹۱۷ء میں گرامی کو جو خط حضرت فاطمہ الزہراء کے متعلق لکھا اس میں حضرت مریم کا ذکر بھی کیا ہے۔ حضرت مریم حضرت عیسیٰ کی نسبت سے محترم تھیں مگر حضرت فاطمہؓ تین رشتوں سے محترم ہیں:

"مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز | از سہ نسبت حضرت زہراؓ عزیز
نور چشم رحمت اللعالمین | آن امام اولین و آخرین
آنکہ جان در پیکر گیتی دمید | روزگار تازہ آئین آفرید
بانوی آن تاجدار ہل اتی | مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا
بادشاہ و کلبہ ئی ایوان او | یک حسام و یک ذرہ ساماں او
مادر آں مرکز پرکار عشق | مادر آں کارواں سالارِ عشق" (۹۶)

پہلا رشتہ جس کی وجہ حضرت فاطمہ محترم ہیں وہ رحمت اللعالمین حضرت محمدؐ کی نورچشمی ہیں۔ اس ہستی کی لخت جگر تھیں جس کی خاطر یہ دنیا تخلیق کی گئی تھی۔ آپ کو اپنی صاحبزادی سے اس قدر عقیدت تھی کہ جب آپ تشریف لاتی تو آپ کھڑے ہوجاتے تھے۔ پھر حضرت فاطمہؓ کی شادی آپؐ نے حضرت علیؓ سے کردی یوں دوسرا رشتہ بھی بہت محترم ٹھہرا۔ حضرت فاطمہؓ کا حضرت علیؓ سے نکاح کے بعد کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد عبدالمعبود تحریر کرتے ہیں:

"اس کے بعد رسولؐ ان عورتوں کے پاس تشریف لے گئے اور اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا میں نے اپنی صاحبزادی اپنے چچا کے بیٹے کے نکاح میں دے دی ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ اس کا جو رتبہ میرے نزدیک ہے۔

آپ نے فرمایا میں اپنی لخت جگر کی رخصتی کرنے لگا ہوں" (۹۷)

ڈاکٹر تقی عابدی نے حضرت علی مرتضی کو مشکل کشا اور شیر خدا کہا ہے۔ جس کا چھوٹا سا گھر ان کا ایوان تھا اور تلوار اور ذرہ اس کا سامان تھا۔ تیسری نسبت جس کی وجہ سے حضرت فاطمہ بہت ہی محترم ہستی ہیں وہ حضرت امام حسینؓ ہیں جنہوں نے اپنے نانا حضرت محمدؐ کی طرح اسلام کو ہمیشہ کے لیے زندہ و جاوید رکھا جنہوں نے اپنے نانا کے دین کی حفاظت کے لیے اپنی اور اپنے خاندان کی جان تک قربان کر دی۔ مولانا گرامی کے کہنے پر ہی اقبال نے آخری شعر کے دونوں مصرعوں کو تبدیل کر کے یہ شکل دے دی

"مادر آں مرکز پرکار عشق

مادر آں کارواں سالار عشق (۹۸)

ڈاکٹر تقی عابدی نے مولانا گرامی کے نام ۳ جولائی ۱۹۱۷ء کا خط شامل کیا ہے:

"میں نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ میں فکر میں ہوں کہ حضرت سیدہ کے متعلق ایک ایسا شعر لکھا جائے جو معنی کے اعتبار سے ایک سو شعر کے برابر ہو آج صبح آنکھ کھلتے ہی وہ شعر ذہن میں آیا ابھی اسے خراد کی ضرورت ہے عرض کرتا ہوں"

گریہ شب ہائے آں بالانشین

ہم چوں شبنم ریخت برعرش بریں (۹۹)

یہاں بھی ڈاکٹر تقی عابدی نے قیاس ظاہر کیا ہے کہ اقبال نے مولانا گرامی کے مشورے سے ہی اس موضوع کو دو شعروں میں بیان کیا اور پہلے مصرع میں تبدیلی بھی کی تبدیلی کے بعد شعر جس حالت میں تھا اس شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

"اس کے بے نیاز گریہ میں جو آنسو گوہر کی طرح نماز کی حالت میں اس کے دامن اور زمین پر گرتے رہے اسے جبرائیل نے چنا اور شبنم کی مانند عرش پر بکھیر دیئے" (۱۰۰)

چوتھا خط جو مولانا گرامی کو حضرت فاطمہ الزہراء کے اشعار کے متعلق لکھا گیا وہ ۶ جولائی کو لکھا

گیا مگر تقی عابدی نے صرف تاریخ کا ذکر کیا ہے سن کا ذکر نہیں کیا ہے۔

"آپ نے جو ترمیم کی وہ بہت بلند ہے، بہر حال میں اسے سمجھتا ہوں اور چوں کہ آپ نے پیدا کیا ہے اس کی داد دیتا ہوں چونکہ حضرت فاطمہؓ کے متعلق اشعار نظم کر رہا ہوں کیا آپ کو کوئی عمدہ روایت اُن کی اطاعت گزاری یا تربیت اولاد کے متعلق یاد ہے۔ جس کو نظم کیا جائے معنی خیز گداز و روایت ہو تو نظم کرنے میں لطف آتا ہے۔" (۱۰۱)

اسی طرح ۱۶ جولائی ۱۹۱۷ء کے خط میں اقبال نے مولانا گرامی کو مخاطب کر کے حضرت فاطمہؓ کے متعلق خطوط و اشعار پیش کر دیے۔:

مادر آں مرکز پرکار عشق — مادر آں کاروان سالارِ عشق
آں یکی شمع شبستان حرم — حافظ جمعیت خیرالامم
تا نشیذ آتش پیکار و کین — پشت پا ذو بر سر تاج و نگین
در نوای زندگی سوز از حسین — اہل حق حریت آموز از حسین
سیرت فرزندھا از امہات — جوہر صدق و صفا از امہات
مزرع تسلیم حاصل بتول — مادران را اسوۂ کامل بتول (۱۰۲)

اقبال نے حضرت فاطمہ کی زندگی کو مادران کے لیے اسوۂ کامل قرار دیا ہے۔ جن کا بیٹا حسین تھا وہ حسین جس نے اہل حق کے لیے آزادی کا راستہ منتخب کیا۔ حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو پُرکار عشق اور کاروان سالار عشق قرار دیا ہے، جن کے بیٹے عشق رسولؐ اور عشق خدا کا منبع تھے ان کی ماں کیسی ہوگی کیونکہ مولانا گرامی نے اقبال کو ایک شعر میں دونوں مصرعوں میں "مادر" کے لفظ ہونے پر زور دیا تھا یہاں اقبال نے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ دونوں کا ذکر کر دیا۔ جن کی ماں نے ان کی تربیت اپنے باپ حضرت محمدؐ کے اسوہ حسنہ کو سامنے رکھ کر کی تھی آخر میں ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مضمون کا اختتام جن اشعار پر کیا ہے وہ اقبال کی نظم کے آخری دو اشعار ہیں۔ اقبال کا پورا فلسفہ جو عشق رسولؐ اور حضرت فاطمہؓ سے والہانہ عشق ان دو اشعار سے عیاں ہے۔

"رشتہ ای آئین حق زنجیر پا است
پاس فرماں جناب مصطفیٰ است
ورنہ گرد تربتش گردیدہ ے
سجدہ ہا برخاک او پاشیدہ ے" (۱۰۳)

ڈاکٹر تقی عابدی اقبال کے عشق کا ترجمہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"یعنی اسلام کے آئین کی زنجیر میرے پاؤں میں ہے اور شریعت محمدی کا خیال بھی ہے۔ ورنہ میں فاطمہؓ کی قبر کے طواف میں زندگی بسر کر دیتا اور ان کی قبر پر تمام عمر سجدے نچھاور کرتا رہتا۔" (۱۰۴)

اقبال اور عشق حضرت علیؓ

حضرت علی کا نام ابوالحسن تھا کنیت ابوتراب اور حیدر (شیر) لقب تھا۔ حضرت علی حضرت محمد کی بعثت سے دس برس پہلے پیدا ہوئے تھے۔ علامہ محمد اقبال سچے عاشق رسولؐ تھے مگر حضرت علیؓ کے متعلق بھی جانتے تھے کہ وہ نبی کریمؐ کے جان نثاروں میں سے تھے حضرت علیؓ نے حضور اکرم کی حفاظت کے لیے اپنی زندگی کے ہر لمحے کو قربان کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبالیات میں اسلام کا مرکز عشق محمدؐ کے ساتھ ساتھ عشق علیؓ کو قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

"اس خصوصی تحریر میں تمام تر کوشش یہی کی گئی کہ اقبال اور عشق علی کا موضوع انہی کے کلام کے ذریعے روشن ہو سکے تاکہ قارئین پر یہ واضح ہو سکے کہ اقبالیات میں اسلام کا مرکز اور ایمان کا محور عشق محمدؐ اور عشق علیؓ ہی تھا۔" (۱۰۵)

علامہ محمد اقبال کی مثنوی اسرار خودی میں (۵۹) اشعار کی نظم حضرت علیؓ کی عظمت پر لکھی ہے۔ جس میں حضرت علی کے ناموں کے بھیدوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اقبال نے حضرت علیؑ کے بارہ ناموں سے زیادہ خطابات اور القابات کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اقبال کے مطابق جس نے حضرت علیؓ کے نام کے راز کو جان لیا تو گویا اس نے زندگی کے راز

کو پہچان لیا۔

ہر کہ دانائے رموز زندگی یست
سرِ اسمائے علی داند کہ چیست (۱۰۶)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کا وہ شعر بھی بیان کر دیا ہے جس سے ان کے مضمون کو چار چاند لگ گئے ہیں جس میں حضرت علیؓ کی تین بڑی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں:

مسلم اول شہ مرداں علیؓ
عشق را سرمایہ ایماں علیؓ (۱۰۷)

حضرت علی کی پہلی فضیلت یہ ہے کہ وہ حضرت محمدؐ پر ایمان لانے والے پہلے مرد مسلمان تھے۔ مگر اس بات میں اختلاف موجود ہے۔ مولانا محمد عبدالمعبود تحریر کرتے ہیں

"اس معاملہ میں مختلف احادیث پائی جاتی ہیں کہ ام المومنین سیّدہ خدیجہ الکبریٰؓ کے بعد سب سے پہلے کون ایمان لایا۔ بعض روایات کے مطابق سیّدنا ابوبکر صدیقؓ اور بعض روایات میں سیّدنا علی المرتضیٰ کی اولیت ظاہر ہوتی ہے۔ اور بعض کے مطابق حضرت زید بن حارثہؓ کا ایمان سب پر مقدم ہے۔" (۱۰۸)

آزاد مردوں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور نوخیز جوانوں میں حضرت علیؓ ایمان لائے حضرت علیؓ چونکہ رسولؐ کے ساتھ رہتے تھے اس لیے ان کو اسلام کے مذہبی مناظر سب سے پہلے نظر آئے ہونگے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے چونکہ حضرت علیؓ کو اسلام لانے والے پہلے شخص قرار دیتے ہیں اس کے لیے انہوں نے ابو حازم اور زین بن ارقم کا حوالہ دیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ان دونوں حوالوں کے ساتھ اُس روایت کو یوں بیان کیا ہے۔

"علی اوّل من اسلم"

"یعنی علی نے سب سے پہلے دعوت اسلام پر لبیک کہا"

دوسری فضیلت بیان کرتے ہوئے اقبال حضرت علی کو مردوں کے شاہ قرار دیتے ہیں ہر غزوہ میں حضرت علیؓ حضرت محمدؐ کے بازو کی طرح ان کے ساتھ رہے۔ اور ان کی تلوار ذوالفقار نے کئی

دشمنان اسلام کو موت کے گھاٹ اتارا۔ غزوہ بدر میں تو مہاجرین کا علَم حضرت علی کے ہاتھ میں تھا۔ غزوہ احد میں بھی جب حضرت مصعب بن عمیرؓ نے جام شہادت نوش کیا تو حضرت علی نے پرچم سنبھالا اور داد شجاعت حاصل کی۔ اسی طرح غزوہ خندق میں بھی حضرت علی کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ مدینہ کی حفاظت کے لیے جب خندق کھودی گئی قبیلہ بن عامر کا عمرو بن عبدود جو مشہور شجاع تھا اس کی بہادری کا غرور بھی ذوالفقار حیدری نے توڑا تھا۔ مولانا محمد عبدالمعبود تحریر کرتے ہیں:

> ''۶ ھجری میں رسول کو معلوم ہوا کہ بنوسعد یہود خیبر کی امداد کے لیے جمع ہو رہے ہیں آپؐ نے ایک سو مجاہدین حضرت علیؓ کی سربراہی میں ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیے شعبان میں مجاہدین نے حملہ کر کے بنوسعد کو منتشر کر دیا اور پانچ اونٹ اور دو ہزار بکریاں مال غنیمت میں لائے۔'' (۱۰۹)

اقبال نے حضرت علی کے عشق کو اپنا سرمایہ زندگی قرار دیا ہے۔ اقبال کے مطابق حضرت علی پہلے مسلمان تھے اور مردان حق کے سردار تھے۔ رانا غلام یٰسین حضرت علی کی بہادری کو ان الفاظ میں اپنی کتاب بادہ ناب میں تحریر کرتے ہیں:

> ''خیبر میں حضرت علیؓ نے خداداد شجاعت اور شمشیر زنی کا عدیم المثال مظاہرہ کیا آپ حیدر کرار ہیں۔ کراری خودداری کی دلیل ہے۔ آپ حوض کوثر کے ساقی ہیں حضرت محمد علم کا شہر ہیں تو حضرت علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔ آپ ید اللہ کے مقام عظیم پر فائز ہیں۔ آپ عشق مصطفیٰ کا سرچشمہ ہیں اسی لیے اقبال اللہ تعالیٰ سے دل مرتضیٰ عطا فرمانے کی دعا کرتے ہیں تو کبھی حضرت علی کی تلوار کی خو طلب کرتے ہیں:'' (۱۱۰)

اسی طرح غزوہ خیبر میں قلعہ قموص مسلمانوں کے لیے ناقابل تسخیر ہو گیا تھا۔ سرور کائنات نے علم حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ کر لیا۔ غزوہ خیبر میں آپؐ نے جب علم کسی بہادر کو دینے کا حکم فرمایا تو بہت سے مجاہد متمنی تھے کہ علم ان کو دیا جائے گا۔ عبدالمعبود تحریر کرتے ہیں۔

> ''صبح ہوئی تو ہر ایک مجاہد متمنی تھا کہ کاش اس فخر و شرف کا تاج اس کے سر سجتا۔ لیکن یہ دولت گراں مایہ حیدر کرارؓ کے لیے مقدور ہو چکی تھی۔

بڑے بڑے جاں نثار اپنا نام سننے کے منتظر تھے کہ دفعتاً حضور اقدسؐ نے علی المرتضیٰ کا نام پکارا۔ یہ آواز غیر متوقع تھی کیونکہ حضرت علی آشوب چشم میں مبتلا تھے۔ رحمت عالمؐ نے اپنا لعاب دہن ان کی آنکھوں میں لگایا جس سے یہ شکایت کافور ہوگئی۔" (۱۱۱)

تیسری فضلیت جو حضرت علیؓ سے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے توسط سے ڈاکٹر تقی عابدی نے بیان کی ہے وہ حضرت علی کی محبت ہے وہ والہانہ محبت جو حضرت علیؓ کو رسول کریمؐ سے تھی۔ جس محبت کی خاطر حضرت علی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینہ پر اپنا خون بہانہ پسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہجرت کی رات آپؐ کے بستر مبارک پر سوئے رہے اور وہ بستر ان کے لیے فرشِ گل تھا۔

مرسَلِ حق کرد نامش بوترابؓ
حق یداللہ خواند در اُم لکتاب
مرتضیٰ کز تیغ او حق روشن است
بوترابؓ از فتح اقلیم تن است (۱۱۲)

حضرت علی کو حضرت محمدؐ نے ابوتراب مٹی کا باپ" کی کنیت سے نواز تھا حضرت علی نفس امارہ پر مکمل قابو کر کے نفس مطمینہ کی منزل پر پہنچ گئے تھے۔ سورۃ الفتح میں اللہ نے حضرت علیؓ کو خدا کا ہاتھ قرار دیا ہے۔ اس کی خوشی ہی حضرت علی کا مقصد زندگی تھا۔ حضرت محمدؐ علم کا شہر ہیں تو علیؓ اس شہر کا دروازہ۔ اقبال کو حضرت علی سے بے پناہ عقیدت تھی اس لیے کہتے ہیں:

ہے اقبال فیض یاد نام مرتضیٰ جس سے
نگاہ فکر بین خلوت سرائے لامکاں تک ہے

اسرارِ خودی میں بھی حضرت علیؓ اور ان کے خاندان سے عشق کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

از ولائے دود مانش زندہ ام
در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام (۱۱۳)

اقبال اپنی شہرت اپنی کامیابی کو حضرت علیؓ سے منسوب کرتے ہیں۔ بانگ درا میں "میں اور تو" کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوت حیدریؓ
نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللہ وہی مرحبی وہی عنتری

یعنی اگر انسان کے اندر جذبہ عشق موجود ہے تو اسے کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے دو وقت کی روٹی کھا کر بھی کوئی شیر بن سکتا ہے۔ نان شعیر سے حضرت علیؓ اتنے طاقت ور تھے کہ مرحب جیسے پہلوان کو بھی پچھاڑ دیا تھا۔ دنیا میں آج بھی وہی مرحب اور عنتری موجود ہیں۔ لیکن حیدری جیسا نان شعیر کھانے والا شیر میدان میں اتارنے کی ضرورت ہے اقبال ضرب کلیم میں ارشاد فرماتے ہیں

میرے لیے فقط زور حیدری کافی
تیرے نصیب فلاطوں کی تیزی ادراک
بے جرات رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق ید الہٰی
خدانے اس کو دیا ہے شکوہ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کرّاری

بال جبریل میں فرماتے ہیں:

کبھی تنہائی کوہ دمن عشق
کبھی سوز و سرورِ انجمن عشق
کبھی سرمایہ محراب و منبر
کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد الہٰی

ڈاکٹر تقی عابدی نے سپاس امیرؓ جو مجلہ مخزن میں ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی تھی سے چند شعر نقل کیے ہیں:

اے باب مدینہ محبت اے نوحؑ سفینہ محبت
اے سر خط و جوب امکاں تفسیر تو سورہائے قرآن
اے سر نبوت محمدؐ اے وصف تو مدحت محمدؐ
از ہوش شدم مگر بہ ہوشم گوئی کہ نصیریٔ خموشم
لماچہ کنم مے تولا تند است برون فتدز مینا
زاندیشہ عاقبت دمیدم جنس غم آل تو خریدم

ڈاکٹر تقی عابدی نے ان اشعار کو تشریح کا جامہ ان الفاظ میں پہنایا ہے۔

''اے شہر محبت کے دروازے اے محبت کے سفینے کے ناخدا اے معبود اور عبد کے درمیانی رشتے۔ اے قرآن سورتوں کی تفسیر۔ اے راز دار نبوت محمد جس کی روح، روح محمدؐ ہے تیرے بغیر (علیؓ) محمد تک نہیں جا سکتے اور اس کے (محمدؐ) کے بغیر (علیؓ) تک نہیں پہنچ سکتے میں ہوش کی زیادتی سے بے ہوش ہو گیا ہوں۔ یعنی یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک خاموش نصیری کی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں کیا کروں کہ تیری محبت کی شراب اتنی تیز اور دو آتشہ ہے کہ میرے دل کی صراحی سے چھلک کر گر رہی ہے۔ مجھے اپنی آخرت کی کوئی فکر نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے تیری (علی)ؓ اولاد کی محبت اور ان کی اطاعت کو آخرت کا اثاثہ سمجھ کر خرید رکھا ہے۔'' (۱۱۴)

اقبال مسلمانوں کو حضرت علیؓ کی طرح بہادر دیکھنا چاہتے تھے۔ بال جبریل میں دعا کرتے ہیں:

دلوں کو مرکز مہرو وفا کر
حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدری بھی عطا کر (۱۱۵)

ڈاکٹر تقی عابدی نے مضمون کا اختتام بہت ہی پیارے شعر پر کیا ہے

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ

سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ ونجف (۱۱۶)

اقبال کو حضرت علیؓ کی ذات سے اس قدر وابستگی تھی کہ ہر روز صبح کے وقت سپاس امیرؓ کی تلاوت بلاناغہ کیا کرتے تھے۔ یہ چونتیس اشعار کی نظم ہے جو بیرسٹر عبدالقادر نے مخزن میں ۱۹۰۴ء میں شائع کی تھی۔ یہ نظم باقیات اقبال کا حصہ ہے جس میں تیرہ (۱۳) اشعار عشق کے عنوان سے کلیات اقبال میں شامل ہیں۔ اقبال کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا۔ قرآن کی تلاوت، نماز کی پابندی اور نماز تہجد کا ذکر حوالوں میں ملتا ہے مگر ان تمام عقائد کے ساتھ ساتھ اقبال سپاس جناب امیر کی تلاوت بھی کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے عشق علیؓ کے علاوہ ایک مضمون سپاس جناب امیرؓ کے نام سے شامل کتاب کیا ہے جس میں یہ نظم مکمل ترجمے کے ساتھ پیش کی ہے۔

اے محو ثنائے تو زبان ھا
اے یوسف کارواں جان ہا
اے باب مدینہ محبت
اے نوحؑ سفینہ محبت

اے ماحی نقش باطل من
اے فاتح خیبر دِل من
اے مذہب عشق را نمازی
اے سینے تو امین رازی
اے سر نبوت محمدؐ
اے وصف تو مدحت محمدؐ

اے سر خط وجوب و امکاں
تفسیر تو سورہائے قرآں

ہشیام و مست بادہ تو
چوں سایہ زیا افتادہ تو
از ہوش شدم مگر بہ ہوشم
گوئی کہ نصیری خموشم
دائم کہ ادب بہ ضبط راز است
در پردہ خامشی نیاز است
اماچہ کنم مئے تولا
تنداست بیروں فتد زمینا
زاند بستہ عاقبت رہیدم
جنس غم آں تو خریدم

علامہ اقبال نے حضرت علیؓ کے کردار کی بلندی کو آسمان کی بلندی قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت علیؓ کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ آپ کے دربار کا ذرہ بھی کوہ طور پر نغمہ سرائی کرتا ہے۔ حضرت علیؓ کو پہچان کر ہی خدا کی معرفت حاصل کی جاسکتی ہے۔ جنت میں بہار حضرت علیؓ کی وجہ سے ہوگی۔ علامہ نے حضرت علی کی غلامی کو پسند کیا ہے بلکہ حضرت علیؓ کے غلام قنبر کی نسبت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ علامہ اقبال حضرت علی کے قدموں میں سایہ کی طرح پڑے ہوئے ہیں۔ حضرت علیؓ کے عشق میں ہوش کھو چکے ہیں۔ مگر پھر بھی ہوش وحواس میں ہیں اور نصیری کی طرح زندگی گزار رہے ہیں:

فکرم چو بہ جستجو قدم زد
درد پر شد و درحرم زد

دردشت طلب بسی دویدم
دامن چوں گرد باد چیدم
پویان بے خضر سوئے منزل
بردوش خیال بستہ محمل

عشق تو دلم ربود ناگاہ
ازکار گرہ کشود ناگاہ

اقبال کہتے ہیں کہ میری سوچ بچار نے مجھے در در بھٹکایا کبھی مندر تو کبھی کعبہ کے دروازے پر یہاں تک کہ میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ میرے راستے میں رکاوٹیں آتی گئیں اور میں گرد و غبار میں پھنستا گیا۔ خیال نے میرا پیچھا نہ چھوڑا اور محمل کے ساتھ خضرؑ کے پیچھے چلتا گیا۔ دریا کی موجوں کو آخرکار حضرت علیؓ کی محبت نے تھاما اور میرے کام کی گرہ کھول دی۔

آگاہ زہستی و عدم ساخت
بت خانہ عقل را حرم ساخت
چوں برق بجز متم گذر کرد
از لذت سوختن خبر کرد
سر مست شدم زپا فتادم
چوں عکس زخود جد افتادم
خاکم بہ فراز عرش تردی
زاں راز بادلم سپردی
واصل بہ کنار کشتی ام شد
طوفان جمال زشتم شد
جز عشق حکایتی ندارم
پروائے ملامتی ندارم
از جلوہ عام بے نیازم
سوزم گریم تپم گدازم (۱۱۷)

علامہ محمد اقبال نے حضرت علیؓ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ حضرت علیؓ نے ان کو منزل تک پہنچا دیا اور مختلف رازوں سے آگاہ کیا۔ یوں میری کشتی جو طوفان کے ہچکولے برداشت کر رہی تھی۔ وہ کنارے لگ گئی اب اقبال حسن کے جلوے سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ اب عشق کی بدولت اقبال دن

رات جلتے ہیں۔ روتے ہیں تڑپتے ہیں۔ اور گھلتے ہیں سپاس امیرؑ سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال حضرت علیؑ کی ذات سے کس قدر وابستہ تھے۔ اور اسی عشق کی بدولت اقبال کو ساری قدر و منزلت حاصل ہوئی۔

قصیدہ بردہ بوصیری اور علامہ محمد اقبال

چونکہ علامہ اقبال نے اپنے فارسی کلام میں کعب بن زہیر کا ایک دفعہ اور علامہ بوصیری کا دو بار ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی باریک بین شخصیت نے ان دو عظیم شخصیات کی علمی و مذہبی اہمیت کو سمجھا۔ اور ان کو اپنی کتاب اقبال کے عرفانی زاویے کا حصہ بنایا۔ سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کو لکھے گئے خطوط میں بھی ان شخصیات کا ذکر ملتا ہے۔ جناب کعب بن زہیر نے ''بانت سعاد لکھا جس کو قصیدہ بردہ یا قصیدہ چادر بھی کہتے ہیں کعب بن ذہیر کا تعارف کراتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> ''جناب کعب بن زہیر زمانہ جاہلیت کے ممتاز شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں جنہوں نے پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخانہ اور توہین آمیز اشعار کہے لیکن بعد میں اپنے کیے پر نادم ہو کر رحمت اللعالمین سے معافی طلب کر کے حضور کی شان میں نعتیہ قصیدہ بانت سعاد پڑھا۔ جس کے ایک شعر پر حضورؐ نے اصلاح کرتے ہوئے کعب کو اپنی ردائے مبارک عطا کی جس سے اُن کا لقب شاعر چادر رحمت ہو گیا'' (۱۱۸)

ڈاکٹر تقی عابدی نے بتایا ہے کہ آپؐ نے کعب بن زہیر کے لکھے گئے قصیدہ بانت سعاد میں سیف الہند کی جگہ ''سیف اللہ'' کی تصحیح فرمائی۔ سیف الہند کا مطلب تھا کہ رسولؐ ہند کی تلوار ہیں۔ جب کہ آپؐ نے تصحیح فرمائی جس کا مطلب حضورؐ خدا کی تلواروں میں سے ایک چمکدار اور آبدار تلوار ہیں۔ آپؐ وہ تلوار ہیں جو ہر کسی کو روشنی فراہم کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے جس دوسرے قصیدہ کا ذکر کیا ہے وہ بانت سعاد کے (۶۵۰) سال کے بعد لکھا گیا۔ اس کا پورا نام ''قصیدہ الکواکب السعدیہ فی مدح خیر البریہ'' ہے اس کو قصیدہ میمیہ بھی کہا جاتا ہے۔ جب کہ تاریخ میں اس کو قصیدہ بردہ شریف بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور اس کے لکھنے والے کا پورا نام شرف الدین ابو عبداللہ محمد بن سعید بوصیری بتایا جاتا ہے ڈاکٹر تقی عابدی نے علامہ بوصیری کی تاریخ پیدائش ۶۰۸ ہجری بتائی ہے۔ جو مصر

کے ایک گاؤں بوصیر میں پیدا ہوئے۔ سید بابر علی تحریر کرتے ہیں۔

''اس غیر فانی نعتیہ قصیدے کے خالق شرف الدین ابوعبداللہ محمد بن سعید حماد بن عبداللہ صینہاجی ہیں۔ ابوعبداللہ کنیت ہے۔ اور شرف الدین لقب ہے اس لیے ان کے اسم گرامی کی اصل ترتیب ابوعبداللہ شرف الدین محمد بن سعید بن حماد بن عبداللہ ہونا چاہیے۔ آپ کے والد بوصیر کے رہنے والے تھے۔ بوصیر مصر کا ایک گاؤں ہے بعض تذکرہ نگاروں نے انہیں دلاصی بھی لکھا ہے۔ کیونکہ آپ کی پیدائش اپنی والد کی جنم بومی دلاص میں یکم شوال ۶۰۸ھ/ ۷ مارچ ۱۲۱۳ کو ہوئی'' (۱۱۹)

دائرہ معارف اسلامیہ میں بوصیری کے متعلق درج ہے۔

''البوصیری نے لفظ قرآن کا ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی کھولا تھا۔ انہیں سیرت سے خاص شغف تھا اس کے ساتھ ہی عیسائیوں اور یہودیوں سے مناظرے کا بڑا شوق رکھتے تھے۔ اسی غرض سے انہوں نے انجیل اور تورات کا براہِ راست مطالعہ کیا جیسا کہ ان کے اشعار شاہد ہیں خطاطی میں بھی بڑی مہارت اور شہرت حاصل کی۔'' (۱۲۰)

علامہ بوصیری کو شعری حسن و لطافت سے بڑا شغف تھا علامہ بوصیری نے سفر حج سے پہلے جو قصیدہ لکھا اس کا نام الامیہ فی الرد علی النصاری والیہو دٔ ہے جب کہ دوسرا قصیدہ حج کے بعد لکھا۔ ''ذُخر المعاد فی لمعارضہ بانت سعادؔ'' یہ حضرت کعب بن زہیر کے بانت سعاد کے مقابلے کا ہے۔ دائرہ معارف اسلامیہ میں قصیدہ بردہ کے متعلق تحریر ہے۔

''دوسرے دور کا سب سے مشہور کارنامہ وہی قصیدہ بردہ ہے جس کا اصلی عنوان ''الکواکب الدریۃ فی مدح خیر البریۃ'' ہے۔'' (۱۲۱)

ڈاکٹر تقی عابدی نے علامہ بوصیری کی قصیدہ بردہ شریف لکھنے کی وجہ بھی بیان فرمائی ہے۔ قصیدہ بردہ شریف لکھنے کی وجہ فالج تھا اُسی رات کو حضورؐ کو خواب میں دیکھا جنہوں نے بدن پر خوش ہو کر ہاتھ پھیرا اور بوصیری پر اپنی چادر اوڑھائی۔

ڈاکٹر تقی عابدی اس واقعہ کو یوں تحریر کرتے ہیں:

''مختلف مستند حوالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ بوصیری فالج کے حملہ سے مفلوج ہو چکے تھے۔ چنانچہ برص اور جذام کی بیماری کی روایت ضعیف ہے۔ جب فالج کا کوئی علاج کارگر ثابت نہ ہوا تو بوصیری نے حضور اکرمؐ کی بارگاہ میں قصیدہ لکھا۔ اسی رات خواب میں حضورؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور حضورؐ کو یہ قصیدہ سنایا حضورؐ نے خوش ہو کر آپ کے بدن پر اپنا دست مبارک پھیرا اور بوصیری کو اپنی چادر اوڑھی۔ جب آنکھ کھلی تو بوصیری مکمل صحت یاب تھے۔'' (۱۲۲)

اس بات کا اعتراف دائرہ معارف اسلامیہ میں بھی درج ہے۔

''اس مشہور قصیدے کا پس منظر یہ ہے کہ البوصیری اتفاق سے بعارضہ فالج بیمار ہو گئے جس سے ان کے جسم کا نصف حصہ بالکل بے کار ہو گیا۔ البوصیری کہتے ہیں کہ میں نے بیماری کی حالت میں یہ قصیدہ ترتیب دینا شروع کیا جب یہ مکمل ہو گیا تو میں اسے بار بار پڑھتا۔ خدا کے حضورؐ میں رو رو کر گڑگڑاتا۔ عاجزی اور تضرع سے دعائیں مانگتا اور اللہ تعالیٰ سے اس قصیدے کی بدولت صحت کے لیے درخواست کرتا۔ اسی حالت میں ایک رات سو گیا۔ تو خواب میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آپؐ نے اپنا دست مبارک میرے مریض جسم پر پھیرا اور ایک چادر مجھ پر ڈال دی جب میں بیدار ہوا تو میں نے اپنے آپ کو صحت یاب پایا۔'' (۱۲۳)

علامہ بوصیری پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے جسم کا نصف حصہ مفلوج ہو چکا تھا۔ دماغ ٹھیک کام کر رہا تھا جسمانی طور پر لاچار تھے ان کے دکھی دل سے التجا نکلی اور عرضداشت کو رحمت اللعالمین نے شرف قبولیت بخشا۔ چنانچہ اس قصیدے کو بوصیری کے دکھی دل کی آواز بھی کہا جا سکتا ہے۔ سید بابر علی اس واقعے کو یوں تحریر کرتے ہیں:

''نعت گوئی میں کئی قصیدے تصنیف کیے ان میں سے کچھ زین

الدین یعقوب ابن الزبیری کو پڑھ کر سنائے جو درجہ وزارت پر متمکن تھے۔
پھر بدقسمتی سے فالج کا حملہ ہوا جس سے جسم کا نصف حصہ مفلوج ہونے کی وجہ سے بیکار ہو گیا۔ علاج معالجہ سے افاقہ نہ ہوا۔ بالآخر درِ محمد مصطفیٰ کو وسیلہ بنانے کی امنگ اٹھی کہ کیوں نہ حضور پاک ﷺ کی نعت کے حوالے سے موذی مرض سے چھٹکارا پانے کے لیے دربار رسالت ﷺ میں عرض کی جائے۔ چنانچہ قدرت کے فیضان اور آپ ﷺ کی محبت کی وجہ سے میرے جذبات قصیدے کے روپ میں ڈھلتے گئے۔ اسی تخلیق کو وسیلہ بنا کر گڑگڑا کر صحت کے لیے دعا مانگی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ اپنی بے بسی کا رونا اور عجز و لاچاری کا اظہار تھا نیند نے چادر تان دی خواب میں حضور اکرم ﷺ کی زیارت ہوئی آپ ﷺ نے اپنا دست مبارک میرے جسم کے مفلوج حصہ پر پھیرا۔ میرا جسم کا ہر بال جھوم اُٹھا کیونکہ دست مبارک کے چھونے سے میں قطعی طور پر صحت یاب ہو چکا تھا اور ایسا لگا کہ مجھے کوئی عارضہ لاحق ہی ہوا نہ ہو۔'' (۱۲۴)

کہا جاتا ہے جب علامہ بوصیری خواب سے بیدار ہوئے تو بے حد خوش تھے سجدہ شکر ادا کیا۔ صبح کی سیر کے لیے نکلے ابھی یہ واقعہ کسی کو بھی نہیں سنایا تھا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر ایک بزرگ مل گئے۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے قصیدے کی فرمائش کی۔ آپ نے ان سے استفسار کیا کہ میں نے کافی قصیدے لکھے ہیں آپ کو کونسا قصیدہ چاہیے سید بابر علی اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''سلام دعا کے بعد انہوں نے فرمایا کہ مجھے آپ کا قصیدہ چاہیے میں نے عرض کیا کہ میں نے تو کئی قصیدے لکھے ہیں آپ کو کون سا قصیدہ درکار ہے تو وہ گویا ہوئے کہ وہ قصیدہ جو آپ نے بیماری کی حالت میں تخلیق کیا اور اس کا پہلا مصرعہ: امن تذکرِ جیرانِ بذی سَلم'' مجھے حیرانی ہوئی کہ میں نے اس قصیدے کا کسی سے بھی ذکر نہیں کیا۔ ان بزرگوں کو کس طرح پتہ چل گیا جب ان سے تعجب اور حیرانی کا تذکرہ کیا تو وہ فرمانے لگے کہ رات جب بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں آپ قصیدہ پیش کر رہے تھے تو سامعین میں یہ فقیر

بھی حاضر تھا۔" (۱۲۵)

علامہ بوصیری کا یہ قصیدہ بہت مشہور ہوا اور بہت سے لوگوں کو اس قصیدے کی بدولت برکت اور صحت نصیب ہوئی اس کے اردو انگریزی لاطینی المانی فارسی ترکی اور بربری زبانوں میں تراجم ہوئے اس قصیدے کے ماننے والوں کا عقیدہ ہے کہ اس کے مختلف ابیات مختلف بیماریوں اور تکلیفوں سے نجات دلانے کی طاقت رکھتے ہیں

یہاں ڈاکٹر تقی عابدی نے واقعہ کو بیان کرنے سے پہلے مستند حوالے کا ذکر تو کیا ہے مگر اس حوالے کو بیان نہیں کیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے رموز بے خودی میں موجود ان اشعار کو بھی اس مضمون کا حصہ بنایا ہے جو کعب بن زہیر کے متعلق ہیں۔ یہ ۱۱۳۸ اشعار پر مشتمل ہیں۔ اس مثنوی کا نام ملت محمدیہؐ توحید اور رسالت ہے۔

پیش پیغمبر چو کعب پاک زاد　　هدئی آورد از بانت سعاد

در ثنایش گوهر شب تاب سفت　　سیف مسلول از سیوف الهند گفت

گفت سیف من سیوف الله گو　　حق پرستی جز براه حق مپو　　(۱۲۶)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

"کعب پاک ذات نے حضورؐ کی خدمت میں قصیدہ بانت سعاد کا تحفہ پیش کیا جو آپ کی ثنا میں موتیوں کے ہار کی مانند درخشاں تھا جس میں حضورؐ کو ہند کی شمشیر بتلایا۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ مجھے سیف خدا کہو اور ہمیشہ حق کی پرستش کرو اور غیر از حق کسی دوسری راہ پر قدم مت بڑھاؤ۔" (۱۲۷)

اسی طرح اقبال نے رموز بیخودی میں "عرض حال مصنف بحضور رحمت اللعالمین میں علامہ بوصیری کا ذکر کیا ہے۔

ای بصیری را ردا بخشنده ئی　　بربط سلما مرا بخشنده ئی

ذوق حق ده این خطا اندیش را　　اینکه نشناسد متاع خویش را　　(۱۲۸)

اقبال نے جن دنوں یہ مثنوی لکھی وہ بدنی کسالتوں سے دوچار تھے۔ اقبال نے اس مثنوی میں روح کی پاکیزگی کی دعا بھی مانگی تھی۔ وہ بدنی بیماریوں سے زیادہ روحانی شفا کو اہمیت دیتے تھے۔ اور

مسلمانوں کی شکستہ حالی کی وجہ سے روحانی کیفیت کی کمزوری قرار دیتے ہیں۔

جس طرح علامہ بوصیری نے خواب میں نبی اکرمؐ سے شفا طلب کی تھی اسی طرح اقبال نے بھی سرسید احمد خان کو خواب میں دیکھا جنھوں نے ان کو اپنی بیماری آپؐ کی ذات کے آگے بیان کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ اقبال نے خواب سے بیدار ہوتے ہی چند فارسی زبان میں شعر لکھے اوران کو ترتیب دے کران کا نام ''پس چہ باید کرد ای اقوام شرق'' رکھا تھا۔ یہاں ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کا ایک خط شامل کیا ہے۔ یہ خط ۲۹ جون ۱۹۳۶ء کو سرراس مسعود کو لکھا گیا۔ اسی مثنوی کے آخری (۶۲) اشعار بعنوان ''در حضور رسالت مآبؐ'' میں پانچ شعر میں اقبال نے اپنی بیماری کی شفا کے لیے حضورؐ سے بوصیری کا واسطہ دے کر شفا طلب کی ہے۔

یہاں تقی عابدی نے یہ بیان کیا ہے کہ اقبال تلخ دواؤں کو ناپسند کرتے تھے۔ مگر ڈاکٹر تقی عابدی نے یہ بات یہاں کیوں کی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ چونکہ اقبال تلخ دواؤں سے گھبراتے تھے اور عشق رسولؐ پر بے حد یقین تھا۔ وہ دواؤں کو چھوڑ کر صرف دعا پر انحصار کرنے لگے تھے۔ اگر وجہ یہ ہی ہے تو تقی عابدی کو یہ بات یہاں واضح کرنی چاہیے تھی۔ مگر انہوں نے تفصیل میں جانے سے گریز برتا ہے۔

مولانا ندوی سے علامہ نے کیا دریافت کیا

اقبال نے مولانا گرامی کے بعد جس شخصیت سے سب سے زیادہ سیکھا وہ سید سلیمان ندوی ہیں۔ علامہ محمد اقبال اور سید سلیمان ندوی کے تعلقات بہت پرانے تھے۔ اقبال دینی اور ادبی مسائل میں اکثر ان کے ساتھ بحث کیا کرتے تھے۔ سید سلیمان ندوی نے اقبال کے ساتھ مل کر افغانستان کا سفر بھی کیا تھا۔ انیلہ محمود علامہ اقبال کے تصورِ توحید میں سید سلیمان ندوی کا تعارف کراتے ہوئے تحریر کرتی ہیں:

> ''سید سلیمان ندوی کا شمار ہندوستان کے بیسویں صدی کے صف اول کے عالموں، دانشوروں، مورخوں، محققوں اور سوانح نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ ایک بلند پایہ مترجم اور شاعر تھے۔ شعر نگاری میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ شبلی نعمانی کے بعد سیرت نگاری میں آپ کو سند کا درجہ حاصل

ہے۔ علم قرآنیہ تفسیر حدیث، فن رجال تاریخ اسلام، افکار اسلامی، منطق و فلسفہ علم الکلام علم لغت غرض ماضی کے شاندار تہذیبی ورثے کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس میں سیّد سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی بصیرت اور گہری فراست کا بین ثبوت نہ دیا ہو۔ (۱۲۹)

رموز بے خودی کے ریویو کے سلسلے میں سید سلیمان ندوی نے جو غلطیاں نکالی ان کی اصلاح کا ذکر کرتے ہوئے اقبال ۱۵ مئی ۱۹۱۸ء کو لکھتے ہیں

''صحت الفاظ اور محاورات کے متعلق جو آپ نے لکھا ہے ضرور صحیح ہوگا۔ اگر آپ نے غلط الفاظ اور محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے ان سے آگاہ کیجئے دوسرے ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو جائے گی۔ اس تکلیف کو میں ایک احسان تصور کروں گا۔'' (۱۳۰)

زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''رموز بے خودی شائع ہوئی تو اقبال نے اس کا ایک نسخہ سید سلیمان ندوی کو بھی بھیجا اور فرمائش کی کہ اس کی لغزشوں سے آگاہ کریں سید سلیمان ندوی نے جو اعتراضات کیے وہ بقول غلام رسول مہر تقریباً سب کے سب نادرست تھے۔ اور ان میں سے بیشتر کے جوابات اقبال نے اساتذہ فارسی کے کلام کی اسناد کے ساتھ دے دیئے تھے۔'' (۱۳۱)

''سیر لفظ کی درستگی کے متعلق اقبال ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو سلیمان ندوی کو تحریر کرتے ہیں:

''سیر فارسی میں ان معنوں میں آتا ہے ''سیر کردن'' ''سیر زدن'' ''سیر داشتن بلکہ سیر دیدن۔''

رموز بیخودی کا یہ شعر ان الفاظ میں تھا

عمر یا صائب بہ شہر عقل بودم کوچہ بند
مدتی ہم با غزالاں سیر صحرا می زنم

اس کے بعد ڈاکٹر تقی عابدی نے رموز بیخودی کے وہ اشعار دیے ہیں جن میں ان کچھ لفظوں کے دو معنی نکلتے تھے۔ جیسے کہ از گل غربت زماں تم کردہ'' میں آپ نے سلیمان ندوی کو واضح کیا کہ یہاں از گل اچھے معنوں میں استعمال ہوا۔ برے معنوں میں نہیں۔ اقبال نے ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو سلیمان ندوی کو تحریر کیا۔

''میری خامیوں سے مجھے ضرور آگاہ کیجئے آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن مجھے فائدہ ہوگا بادہ نارسا کے لیے مجھے کوئی سند یاد نہیں۔ بادہ نارس یا میوہ نارس لکھتے ہیں۔ لفظ مینار غلط ہے صحیح لفظ منار ہے۔ یہ لفظ اس زمانے کی نظموں میں واقع ہوئے ہیں۔ جس زمانے میں میں سمجھتا ہوں کہ لٹریچر میں ہر طرح کی آزادی لے سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض نظموں میں میں نے اصول بحر کا بھی خیال نہیں کیا اور ''ارادۃً'' (۱۳۲)

اقبال کا مقصد اپنی شاعری کو فنی طور پر مستحکم کرنا نہیں تھا۔ بلکہ وہ اپنے خیالات کے انقلاب کو مسلمانوں کی سوچ کا محور بنانا چاہتے تھے۔ سید سلیمان ندوی نے ان کی فنی اصلاح کرنا چاہی تھی اس بات کی توضیح کرتے ہوئے اقبال ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو سید سلیمان ندوی کو تحریر کرتے ہیں:

''شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمع نظر نہیں رہا۔ کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مد نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں اس واسطے آرٹ (فن) غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لیے ممکن نہیں جرمنی کے دو بڑے شاعر بیرسٹر تھے یعنی گوئٹے اور اوھلنڈ۔ گوئٹے تھوڑے دن پریکٹس کر کے ویمر کی ریاست کا تعلیمی مشیر بن گیا اور اس طرح فن کی باریکیوں کی طرف توجہ دینے کا اسے پورا موقع مل گیا اوھلنڈی پوری عمر

مقدمات پر بحث کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑی نظمیں لکھ سکا۔ اور وہ کمال پورے طور پر نشو ونما نہ پاسکا۔ جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اگر احباب تبصرہ پر مصر ہیں تو یہی بہتر ہے کہ مجموعہ کا انتظار کیا جائے مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں۔ اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہوگا۔'' (۱۳۳)

اقبال نے سید سلیمان ندوی سے مرزا غالب کے ایک شعر پر بھی فلسفیانہ بحث کی ہے:

ہر کجا ہنگامہ عالم بود
رحمتہ اللعالمین ہم بود

ڈاکٹر تقی عابدی نے گاہے بگاہے خطوط کا سہارا لے کر اقبال اور سید سلیمان ندوی کے درمیان ہونے والی علمی وادبی گفتگو کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ علمی وادبی کے علاوہ مذہبی امور پر بھی کافی گفت وشنید ہوتی رہتی تھی اقبال ۱۲ اگست ۱۹۲۴ کو لکھتے ہیں:

''اگر صحابہ کے اجماع نے کوئی حکم نقص قرآنی کے خلاف نافذ کیا تو علامہ آمدی کے خیال کے مطابق ایسا کسی ناسخ حکم کی بنا پر ہوا ہے۔ وہ ناسخ حکم سوائے حدیث نبوی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث ناسخ قرآن ہوسکتی ہے۔ جس سے کم از کم مجھے تو انکار ہے اور غالباً آپ کو بھی ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ دوبارہ زحمت دینے پر مجبور ہوا۔'' (۱۳۴)

اقبال نے تصور زمان ومکان پر مفید بحث کی ہے اور اس مسئلے کو مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کے مترادف قرار دیا ہے۔ اقبال نے زمان کے مسئلے پر مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی گفتگو کی ہے۔ چنانچہ ۲۳ اگست ۱۹۳۳ کو لکھتے ہیں:

''حضرت محی الدین ابن عربی کے فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقت زمان کی بحث کس کس جگہ ہے حوالے مطلوب ہیں۔ حضرات

صوفیہ میں اگر کسی اور بزرگ نے اس مضمون پر بحث کی ہو تو اس کے حوالے سے بھی آگاہ فرمائیں۔'' (۱۳۵)

ان تمام خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید سلیمان ندوی صاحب علم شخص تھے۔ جن سے اقبال نے علمی وادبی اور مذہبی بحث پر خاطر خواہ گفتگو فرمائی ہے۔

سید سلیمان ندوی نے ان کی فنی نقطہ نظر سے بھی اصلاح کی اور ان کے تمام ادبی و مذہبی سوالات کے جوابات دینے کی بھی کوشش کی۔

علامہ اقبال اور حسن نظامی کی قلمی جنگ

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے پرانے دوست خواجہ حسن نظامی کے متعلق ایک مضمون تحریر کیا ہے۔ اقبال اور حسن نظامی کے مابین دیرینہ تعلقات تھے مگر یہ یارانہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ خواجہ حسن نظامی مجلّہ توحید اور صوفی کے مدیر تھے اردو ادب کے عظیم نثر نگار بھی تھے۔ یہ خواجہ حسن نظامی ہی تھے کہ جب اقبال نے ۱۹۰۴ء میں اپنی نظم نالہ یتیم پڑھی تو انہوں نے اپنا عمامہ اقبال کے سر پر رکھ دیا تھا۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

> ''خواجہ حسن نظامی اور مولانا غلام قادر گرامی سے اقبال کے دوستانہ مراسم انجمن کے اجلاسوں ہی میں قائم ہوئے۔ بعد میں گرامی جب بھی لاہور آئے اقبال کے ہاں ٹھہرتے تھے اس زمانے میں اقبال صرف اردو شعر کہتے تھے۔'' (۱۳۶)

ڈاکٹر تقی عابدی نے یہاں نالہ یتیم کا ذکر کیا ہے جو کہ ۱۹۰۱ء میں انجمن کے سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی تھی جب کہ ۱۹۰۴ء کو تصویر درد پڑھی۔ زندہ رود میں جسٹس جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

> ''۱۹۰۴ء کے اجلاس میں انہوں نے نظم ''تصویر درد'' پڑھی۔ اس موقع پر دیگر شخصیات کے علاوہ حالی، ارشد گورگانی، سر محمد شفیع، سر عبدالقادر، سر فضل حسین، مولانا ابوالکلام آزاد اور خواجہ حسن نظامی موجود تھے۔ نظم ترنم سے پڑھی گئی اور نہایت توجہ سے سنی گئی۔ ایک شعر سے متاثر ہو کر حالی نے

بے اختیار دس روپے کا نوٹ پیش کیا۔ جو انجمن کے چندہ میں جمع ہو گیا۔ نظم کے اختتام پر خواجہ حسن نظامی اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنا عمامہ اتار کر اقبال کے سر پر رکھ دیا۔" (۱۳۷)

اقبال کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ قیام یورپ کے دوران اقبال خواجہ حسن نظامی سے فلسفہ اور تصوف کے بارے میں مشورہ کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے تحریر کیا ہے کہ اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی کا نام بھی خواجہ حسن نظامی نے تجویز کیا تھا۔ اور اس کے چیدہ چیدہ اشعار بھی خواجہ نے اپنے ہفتہ وار "توحید" میں اگست ۱۹۱۳ء میں شائع کیے تھے۔ اگر زندہ رود کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کے نام کے لیے اقبال نے خواجہ حسن نظامی سے مشورہ ضرور کیا مگر نام خود تجویز کیا۔

"جب مثنوی ختم ہو گئی تو اس کے نام کے انتخاب کا مسئلہ باقی تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں اقبال نے خواجہ حسن نظامی کو تحریر کیا۔" (۱۳۹)

اب وہ خط ملاحظہ فرمایئے جو اقبال نے خواجہ حسن نظامی کو تحریر فرمایا:

"وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت و استحکام پر بحث کی ہے اب قریباً تیار ہے۔ اور پریس جانے کو ہے اس کے لیے کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمایئے شیخ عبدالقادر نے اس کا نام اسرارِ حیات، پیامِ سروش، پیامِ نو، آئینِ نو تجویز کیے ہیں آپ بھی طبع آزمائی فرمایئے اور نتائج سے مجھے مطلع فرمایئے تاکہ میں انتخاب کر سکوں۔" (۱۳۹)

لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب زندہ رود میں اسرارِ خودی کے نام کے سلسلے میں لکھا ہے۔

"بہر حال مثنوی کا نام اقبال نے خود ہی اسرارِ خودی منتخب کیا۔" (۱۴۰)

زندہ رود میں ہی جاوید اقبال نے خواجہ حسن نظامی کی زبانی اس بات کا اعتراف کروایا ہے کہ اسرارِ خودی کا نام خود انہوں نے تجویز کیا:

"اقبال کے تعلقات آخری دم تک ان سے قائم رہے۔ دہلی جاتے تو انہیں ضرور ملتے اور خطوط کے ذریعے خیالات کا تبادلہ بھی ہوتا رہا۔ ۱۹۱۵ء

میں خواجہ حسن نظامی نے اقبال کی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں سرالوصال کا خطاب دیا تھا۔اور اسی کے جواب میں اقبال نے خط میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمائش کی تھی کہ مثنوی کے لیے بھی کوئی نام یا خطاب تجویز کریں۔''(۱۴۱)

زندہ رود میں ہی خواجہ حسن نظامی کا بیان ملاحظہ ہو۔

''کہ مثنوی ''اسرار خودی'' کا نام میں نے تجویز کیا تھا۔اور بھی کئی نام تجویز کیے تھے مگر اقبال نے اس کو پسند کیا۔'' (۱۴۲)

اقبال نے اسرار خودی، عجمی تصوف میں موجود خامیوں کی نشاندہی کرنے کے لیے لکھی تھی۔ جو عجمی تصوف کے طلسم کو پاش پاش کر دے گی۔ عجمی تصوف نے مسلمانوں کو عمل کی قوت سے محروم کر کے ساکت و جامد کر رکھا تھا۔ مثنوی اسرار خودی کے دیباچہ میں حافظ شیرازی پر اعتراض کیے گئے تھے۔ پھر مثنوی کو سرعلی امام کے نام پر معنون کیا گیا تھا۔ اقبال نے مثنوی اسرار خودی میں جو اشعار حافظ کے خلاف لکھے اور جن پر اعتراض ہوا وہ یہ تھے۔

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
جامش از زہر اجل سرمایہ دار
رہن ساقی خرقہ پرہیز او
مے علاج ہول را پرہیز او
نیست غیر از بادہ در بازار او
از دو جام آشفتہ شد دستار او

چوں جرس صد نالہ رسوا کشید
عیش ہم در منزل جاناں ندید
آں فقیر ملت مے خوار گاں
آن امام امت بے چار گاں

گوسفند است ونوا آموخت است
عشوہ و ناز وادا آموخت است
دلربائی ہائے ار زہر است و بس
چشم او غارت گر شہراست و بس
ازبز یونان زمین زیرک براعت
پردہ عورش حجاب اکبر است
بگزر از جامش کہ درمینائے خویش
چوں مریدان حسن دارد حشیش
محفل اور درخود ابرار نیست
ساغر او قابل احرار نیست
بے نیاز از محفل حافظ گزر
الحذر از گوسفنداں الحذر

اب وہ دور شروع ہو چکا تھا جس میں اقبال اور خواجہ حسن نظامی کے درمیان قلمی جنگ شروع ہو گئی تھی۔ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''اس تنازع کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ بحث کے دوران خواجہ حسن نظامی جیسی معتبر ہستی نے اقبال کے فارسی اشعار کا اردو ترجمہ کرتے وقت انہیں خلاف حقیقت شکل دی یا دیباچے پر نکتہ چینی کرتے وقت ایسی تعبیرات شامل کر دیں جو اصل میں موجود نہ تھیں۔ اکبر الہ آبادی سمیت بعض بزرگوں نے مثنوی پڑھی ہی نہ تھی اور دوسروں کی ہنگامہ آرائی سے متاثر ہو گئے تھے۔ علاوہ اس کے کئی مخالفین نے علمی سطح سے اتر کر اقبال کی ذات پر بھی ناجائز حملے کیے۔ اور انہیں دہریہ، شغال خر، کتا، دشمن تصوف اسلام دین وملت فروش، رہزن ایمان شیطان وغیرہ کے القاب سے پکارا۔'' (۱۴۳)

حافظ شیرازی کو لوگ اپنا پیر ومرشد تصور کرتے تھے۔ کچھ ان کو ولی کامل سمجھتے تھے۔ پھر اس

مقدس بزرگ کے عجمی نظریے سے انحراف کرنا آسان کام نہ تھا۔ جب کہ اقبال کا مقصد حافظ کی ذات کو تنقید کا نشانہ نہ بنانا تھا بلکہ انہیں حافظ کے بے حرکت اور بے عمل نظریہ تصوف سے اختلاف تھا۔ جو مسلمانوں میں کاہلی پیدا کر رہا تھا۔ غلام رسول مہر تحریر کرتے ہیں:

"حیرت انگز امر یہ ہے کہ کسی کا بھی نقطہ نگاہ درست نہ تھا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم صرف خواجہ حافظ وحدت الوجود اور خودی کا نام لے کر خود بھی پریشان ہو رہے تھے اور دوسروں کو بھی پریشان کر رہے تھے۔ مولانا اکبرالہ آبادی نے سرے سے مثنوی پڑھی ہی نہ تھی اور دوسروں کی ہنگامہ آرائی سے متاثر ہو گئے تھے۔ بالکل یہی کیفیت باقی اصحاب کی تھی۔۔۔ سب کے اختلافات کی حیثیت سوال از آسمان و جواب از ریسماں کے مترادف تھی یعنی اقبال نے کچھ کہا تھا اور ان حضرات نے کچھ اور ہی فرمایا۔ سب کچھ شائع ہوا اور ناپید ہو گیا آج ان چیزوں کو تلاش کیا جائے تو ایک بھی شاید ہی مل سکے۔" (۱۴۴)

جنگ کی ابتداء خواجہ حسن نظامی نے کی تھی۔ انہوں نے اپنے ایک مرید ذوقی شاہ سے مضمون لکھوا کر ۳۰ نومبر ۱۹۱۵ء کو رسالہ خطیب میں شائع کروایا جو سرار اسرارِ خودی کی مخالفت میں تھا۔ ذوقی شاہ کے نزدیک اقبال نے تصوف کی مخالفت کر کے اسلام کی مخالفت کی تھی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال ذوقی شاہ کی تحریر کو کچھ یوں نقل کرتے ہیں:

"انہوں نے لکھا کہ اقبال کا نصب العین جیسے کہ مثنوی کی سرخیوں سے ظاہر ہے۔ نظام عالم کی تسخیر ہے حالانکہ مذہب ہمیں سکھاتا ہے اور تصوف ہمیں اس راستہ پر چلاتا ہے کہ ہمارا نصب العین اللہ ہونا چاہیے۔ او رہر وہ شے جو غیر اللہ کی فہرست میں شامل ہو۔ خواہ تسخیر عالم کی تمنا ہو خواہ پولٹیکل اقتدار کی خواہش حُب دنیا ہو۔ خواہ ہوائے نفس شہرت طلبی ہو۔ خواہ عزت کی آرزو ناکا بت ہو یا خودی کی مورت شیشے کے گنبد کی طرح اُن سب کو چکنا چور کر دینا چاہیے کیونکہ مردان خدا کا مقصود اللہ ہے۔" (۱۴۵)

اقبال نے ذوقی شاہ اور خواجہ حسن نظامی کی مخالفت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اور جانتے تھے کہ یہ سب کچھ خواجہ حسن نظامی کے ایما پر ہو رہا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے کلام حافظ پر پابندی لگا دی تھی۔ خواجہ حسن نظامی اقبال کی بہت عزت کرتے تھے۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے ان کا قول تحریر کیا ہے۔

''میں اقبال کی نیت پر حملہ نہیں کروں گا اس لیے نہیں کہ وہ میرے دوست ہیں اس لیے نہیں کہ وہ بڑے آدمی ہیں بلکہ اس لیے کہ سالہا سال میں ان کے خیال اور ارادے کو جانتا ہوں۔ انہوں نے تو یہ مثنوی اپنی دانست میں مسلمانوں کے فائدے کے لیے لکھی ہوگی۔ مگر اس سے سخت خطرے پیدا ہونگے اور مسلمانوں کے اصول و عقائد میں تزلزل پڑ جائے گا۔'' (۱۴۶)

خواجہ حسن نظامی نے مشائخ کے سامنے ایسے سوال رکھے جس پر انہوں نے سوچے سمجھے بغیر اقبال کے خلاف ایک محاذ کھول دیا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے زندہ رود میں تحریر کیا ہے۔

''کیا قرآن شریف عقیدہ وحدت الوجود کا مخالف تھا۔ کیا توحید اور وحدت الوجود جداگانہ اشیاء ہیں؟ کیا اسلام صرف انانیت مٹانے کو آیا ہے۔ تصوف کا انتہائی نتیجہ اور مقصود کیا ہے کیا صحابہ اکرام میں کسی میں بھی کیفیت سکر مثل خواجہ حافظ شیرازی کے نہ تھا۔ کیا کیفیت وحدت الوجود کسی مقام کا نام ہے اور اس مقام کے بعد کیا مقام ہے؟ حضرت ابن عربی نے اس کے بعد عدم محض تسلیم کیا ہے اور یہ مذہبی امور میں مفید ہے یا نہیں۔ کیا وحدت الوجود محض علمی مسئلہ ہے یا اس کا مذہب سے بھی کچھ تعلق ہے۔'' (۱۴۷)

کچھ لوگوں نے اقبال کی حمایت بھی کی یکم جنوری ۱۹۱۶ء کے ''وکیل'' میں اسرارِ خودی کی حمایت میں ایک مسلمان کے نام سے ایک مضمون تحریر کیا گیا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اقبال کا فلسفہ حرکت کا خواہش مند ہے۔ ہمت سے کام لینے کا درس دیتا ہے۔ اپنی حالت کو خود درست کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ شرم وحیا اور ہمت و استقلال کی تعلیم کا نام ہے۔ آپ کی ذات سے اقبال کو بے حد لگاؤ ہے۔ اور

اسی عشق کی بدولت وہ روحانیت کی اصل روح تک پہنچتا ہے۔ حمایت کے ساتھ ساتھ کسی اخبار نے کسر نہ چھوڑی تھی کہ اقبال کے خلاف کم لکھ سکے۔ بہت سے لکھنے والے ایسے تھے۔ جنہوں نے خود اعتراف کیا تھا کہ مثنوی کا مطالعہ انہوں نے خود نہیں کیا بلکہ بزرگوں کی تقلید میں ایسا کیا۔ سراج الاخبار (جہلم) میں ڈاکٹر صاحب کی کمزوریوں کے نام سے کالم لکھا گیا جس میں اقبال کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ ۲۰ جنوری ۱۹۱۴ء کے لائل گزٹ ''لمحات'' میں بھی مضامین شائع کئے گئے۔ مضامین اقبال کے خلاف تھے۔ خواجہ حسن نظامی نے اقبال کے خلاف دوسرا مضمون ''سرِ اسرار خودی'' ۳۰ جنوری ۱۹۱۶ء ''خطیب'' میں شائع کیا۔ اور حافظ کے متعلق کئی باتوں کو غلط رنگ دے کر غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی یہاں تک کہ خواجہ حسن نظامی نے اس نظریہ کو قرآن مجید سے بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ نظریہ وحدت الوجود قرآن مجید سے لیا گیا ہے۔ لیکن اکبر الہ آبادی اور شاہ سلیمان پھلواری نے ان کو ایسا کرنے سے روکا۔ پھر مظفر احمد فضلی نے ''اسرار خودی'' کے جواب میں ''رازِ بے خودی'' لکھ کر اقبال کی شخصیت پر ناجائز حملے کیے۔ حکیم فیروز الدین احمد طغرائی نے حافظ کی حمایت میں ایک رسالہ ''لسان الغیب'' لکھا اس رسالے میں انہوں نے حافظ کو کامل شخصیت کے طور پر پیش کیا۔ کہ حافظ کے کلام میں جوش ولولہ انگیزی تحریک عمل صبر و استقلال حزم و احتیاط اور فلسفہ اخلاق کی تعلیم ہے اور اقبال چونکہ حافظ کے مرید نہ تھے اس لیے حافظ کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ حافظ محمد اسلم جراجپوری نے غیر جانبدار طریقے سے بحث میں حصہ لیا۔ انہوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ اقبال حافظ کے متعلق نہ بھی لکھتے تو بھی بات موزوں تھی۔ کیونکہ حافظ کو پہلے بھی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب نے ان کے کلام پر پابندی لگا دی تھی۔ اور ایک جماعت نے ان کا جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان تمام لوگوں کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے اقبال نے پہلا مضمون بعنوان ''اسرارِ خودی اور تصوف ''وکیل' ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء کو شائع کیا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

> ''اس مضمون میں انہوں نے فرمایا کہ وہ تحریک تصوف کی ایک مفصل تاریخ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جس میں ان کا مقصد یہ دکھانا ہوگا کہ اس تحریک میں اسلامی عنصر کون کون سے ہیں اور غیر اسلامی کون کون سے؟

لیکن اس مرحلے پر یہ بتلا دینا کافی ہے کہ یہ تحریک غیر اسلامی عناصر سے خالی نہیں اور اگر وہ مخالف ہیں تو صرف صوفیہ کے اس گروہ کے جنہوں نے آنحضورؐ کے نام پر بیعت لے کر دانستہ یا نادانستہ ایسے مسائل کی تعلیم دی جو دین اسلام سے غیر متعلق تھے لیکن جو صوفیہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ پر قائم ہیں۔ اقبال ان کی خاک پا ہے اور ان کی محبت کو سعادت دارین کا سبب سمجھتا ہے۔'' (۱۴۸)

اقبال نے واضح کیا ہے کہ وہ حافظ کو محض ایک شاعر سمجھتے ہیں ان کے کلام سے لوگوں نے جو صوفیانہ حقائق اخذ کیے۔ ان کو صوفی اور مجذوب سمجھا گیا۔ صوفی کی حیثیت سے انہوں نے لوگوں میں حالت سکر پیدا کی۔ آنحضورؐ اور صحابہ کرام کی زندگی اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ مسلم قلب کی مستقل کیفیت بیداری ہے نہ کہ خواب یا سکر حافظ کے کلام میں چاشنی ضرور تھی۔ مگر زندگی سے گریز کی تعلیم بھی تھی۔ حافظ کے کلام کی چاشنی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال نے محمد دین فوق کی تصنیف ''وجدانی'' نشتر سے ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔

''اورنگ زیب نے ایک دفعہ فرمان جاری کیا کہ ایک مخصوص میعاد کے اندر اس کی مملکت میں ساری طوائفیں نکاح کر لیں ورنہ انہیں کشتیوں میں بٹھا کر دریا برد کر دیا جائے گا۔ سیکڑوں نکاح ہو گئے لیکن ایک بڑی تعداد رہ گئی جن کو ڈبونے کے لیے کشتیاں تیار کی گئیں۔ میعاد میں صرف ایک دن باقی رہ گیا۔ یہ زمانہ حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کا تھا۔ ایک جوان اور حسین طوائف ہر روز ان کے سلام کو آیا کرتی تھی۔ جب آپ درود وظائف سے فارغ ہوئے تو طوائف سامنے آ کر دست بستہ کھڑی ہو جاتی اور جب نظر اٹھاتے تو سلام کر کے چلی جاتی اب جو وہ آئی تو عرض کی کہ بندی کا آخری سلام قبول ہو۔ آپ نے حقیقت حال پوچھی (۱۴۹) تو طوائف نے تمام کیفیت بیان کر دی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ حافظ کا یہ شعر

در کوئے نیک نامی مارا گزر نہ دادند گر تو نمی پسندی بغیر کن قضارا

تم سب یاد کر لو اور جب دریا کی طرف چلیں تو بلند آواز اس شعر کو پڑھتی جاؤ۔ طوائفوں نے شعر کو ازبر کر لیا۔ جب روانہ ہونے لگیں تو خوش الحانی سے بڑے دردناک لہجے میں یہ شعر پڑھنا شروع کر دیا۔ جس جس نے سنا دل تھام کر رہ گیا۔ جب اورنگ زیب کے کان میں آواز پہنچی تو بے قرار ہو گیا اور حکم دیا کہ سب کو چھوڑ دو۔" (۱۴۹)

حافظ شیرازی کا تصوف رہبانیت تھا اور اقبال نے واضح کیا اسلام حقیقت میں رہبانیت کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے گستن عین اسلام اور پیوستن ایرانی تصوف سے جو کہ رہبانیت کی ہی شکل ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے جب اقبال کو سرالوصال کا خطاب دیا تھا تو اقبال نے سرالفراق خطاب لینے کی درخواست کی تھی۔ حالت سکر منشائے اسلام کے خلاف تھا۔ اور حالت محو قوانین اسلام اور قوانین حیات کے عین مطابق ہے۔ اقبال نے وحدت الوجود کو واضح کرتے ہوئے اپنی فلسفیانہ رائے یوں دی۔

"صوفیاء کو توحید اور وحدت الوجود کا مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوئی توحید کا مفہوم ذہنی ہے۔ اور وحدت الوجود کا مفہوم فلسفیانہ ہے۔ توحید کی ضد جیسا کہ صوفیاء نے تصور کیا کثرت نہیں بلکہ شرک ہے۔ حدت الوجود کی ضد کثرت ہے۔ اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے وحدت الوجود یا جدید فلسفہ یورپ کی اصطلاح میں توحید کو ثابت کیا۔ وہ موحد کہلائے۔ حالانکہ ان کے ثابت کردہ مسئلہ کا تعلق مذہب سے نہ تھا۔ بلکہ نظام عالم کی حقیقت سے تھا۔ اسلام کے نزدیک قابل عبادت ذات اللہ پاک یعنی خالق کی ہے باقی جو کچھ کثرت نظام عالم میں نظر آتی ہے۔ وہ سب کی سب مخلوق ہے۔" (۱۵۰)

مہاراجہ کشن پرشاد بھی خواجہ حسن نظامی کا اثر قبول کر کے مثنوی کی مخالفت کر رہے تھے اقبال نے ۱۳۔ اپریل ۱۹۱۴ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھا۔

"خواجہ حسن نظامی صاحب نے تنقید حافظ کی وجہ سے اس مثنوی کو مخالف تصوف سمجھا ہے اور اسی مفروضے پر ان کے مضامین کا دارومدار ہے

جس میں مجھے انہوں نے دشمن تصوف کہہ کر بدنام کیا ہے۔ ان کو تصوف کے لٹریچر سے واقفیت نہیں اور جس تصوف پر وہ قائم ہیں اس کا میں مخالف نہیں۔ ہاں اس کے بعض مسائل کو میں صحیح تسلیم نہیں کرتا اور جس مسئلہ میں میں نے اختلاف کیا ہے مجھ سے پہلے ہزاروں صوفی اس سے اختلاف کر چکے ہیں:'' (۱۵۱)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے مضمون علم ظاہر و علم باطن کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو وکیل میں ۲۸ جون ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں بھی اقبال نے تصوف کے سلسلے میں اپنا موقف واضح کرنے کی کوشش کی اور اصل تصوف کی روح کو اجاگر کیا۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''اقبال کے نزدیک معرفت کو علم پر ترجیح دینا مذہبی اعتبار سے ہر قسم کی رہبانیت کی 'جڑ' ہے' اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ علم منسوب کیا جاتا ہے نہ کہ معرفت لیکن صوفیہ کے اس گروہ کے خیال میں معرفت یا علم باطن ایک مرتب و منظم دستور العمل ہے۔ جو شریعت اسلامیہ سے مختلف ہے۔ اقبال کی رائے میں احادیث صحیحہ میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ آنحضورؐ نے علوم رسالت میں سے کوئی خاص علم بعض صحابہ کو سکھایا اور بعض سے اسے چھپایا تھا لہٰذا شریعت اسلامیہ کو ہر اعتبار سے فوقیت حاصل ہے اور صوفیہ کے معرفت یا علم باطن کے ایک علیحدہ دستور العمل ہونے کے متعلق تمام دعوے باطل ہیں۔'' (۱۵۲)

اس کے بعد اقبال نے دو تین مضمون تصوف وجودیہ کے متعلق لکھے۔ دوسرا مضمون ۱۳ دسمبر ۱۹۱ء کو ''وکیل'' میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں اقبال نے آپ کی پیش گوئی پر بحث کی کہ میری امت میں تین قرنوں کے بعد سمن کا ظہور ہوگا۔ انگریزی میں ایک مضمون ''اسلام اور تصوف'' کے عنوان سے تحریر کیا جو ''نیو ایرا'' کی جولائی ۱۹۱۷ کو شائع ہوا۔

علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی

اکبر الہ آبادی نے اقبال کے نظریے کو پڑھے بغیر ان پر اعتراضات کیے تھے۔ اکبر الہ آبادی نے جو خطوط مولانا عبدالماجد آبادی کو تحریر کیے ان میں اقبال کے خیالات پر بہت سختی سے نکتہ چینی کی گئی تھی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اکبر الہ آبادی کے الفاظ کو یوں تحریر کیا ہے۔

''مثلاً یہ کہ حضرت اقبال معلوم نہیں کیوں تصوف کے پیچھے پڑے ہیں یا اقبال کو آج کل تصوف پر حملے کا بڑا شوق ہے لکھتے ہیں کہ عجمی فلاسفی نے عالم کو خدا قرار دے رکھا ہے اور یہ بات غلط ہے خلاف اسلام ہے یا اقبال نے جب سے حافظ شیرازی کو اعلانیہ بُرا کہا ہے میری نظر میں کھٹک رہے ہیں۔ ان کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' آپ نے دیکھی ہوگی۔ اب رموز بے خودی شائع ہوئی ہے میں نے نہیں دیکھی دل نہیں چاہا۔'' (۱۵۳)

اکبر الہ آبادی نے مثنوی کا بغور مطالعہ نہ کیا تھا اور صرف وہی اشعار دیکھے تھے جو حافظ کے متعلق تھے۔ اور وہی اشعار پڑھ کر وہ اقبال سے بدظن ہو گئے تھے۔ اقبال نے حافظ پر الزام نہیں لگایا۔ ان کے دیوان میں مئے کشی اس قدر بڑھ گئی تھی جو حالت سکر پیدا کرنے کا سبب بن رہی تھی۔ اقبال نے اسرارِ خودی کی اشاعت ثانی میں حافظ کے خلاف اشعار کو حذف کر دیا۔ اور دیباچے کو بھی حذف کر دیا۔ اسرار خودی کا دیباچہ بہت مختصر تھا جس کی وجہ سے لوگ اس کو سمجھنے سے قاصر رہے اقبال کا مقصد کسی پرائیوٹ شخصیت کو ہدف بنانا نہیں تھا۔ مگر خواجہ حسن نظامی اقبال کے بنیادی اصول کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ اکبر الہ آبادی نے معاملہ کی نوعیت کو سمجھ لیا تھا۔ اور اشعار لکھ کر اقبال اور خواجہ حسن نظامی میں صلح کروادی۔

اے خواجہ حسن کرد نہ اقبال کورد
قومی رکنوں کے ہیں نگہباں وہ بھی
تم محو ہو حسن کی تجلی میں اگر
ہیں دشمن فتنہ رقیباں وہ بھی

پریوں کے لیے جنوں ہے تم کو اگر
دیووں کے لیے ہے سلیمان وہ بھی

علامہ اقبال اور ٹیپو سلطان

علامہ اقبال نے ساری زندگی مسلمانوں کو خودداری کی تعلیم دی تھی ایسی خودداری اور دلیری جو ٹیپو سلطان کے اندر موجود تھی۔ علامہ اقبال ٹیپو سلطان کی قبر پر حاضری کے لیے بطور خاص تشریف لے گئے۔ ٹیپو سلطان کے متعلق ذکر اقبال میں عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں:

"حضرت علامہ ٹیپو سلطان کے عاشق تھے اور متعدد بار ان کی تعریف میں اشعار بھی لکھ چکے تھے۔ اب سفر دکن پیش آیا تو حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے مزاروں پر بھی پہنچے۔" (۱۵۴)

اقبال نے ۱۰ جنوری ۱۹۲۹ء کو میسور کا دورہ کیا۔ میسور یونیورسٹی میں بہت بڑے مجمع میں علمی لیکچر دیا۔ مسلمانان میسور کی طرف سے سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ ٹیپو سلطان کے مقبرے پر حاضری کے متعلق ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

"۱۱ جنوری ۱۹۲۹ء گیارہ بجے دن علامہ اقبال نے ٹیپو سلطان کے مقبرے گنبد سلطانی پر حاضری دی جو سری رنگ پٹن میسور میں واقع ہے گنبد سلطانی پر مہاراجہ میسور کرشنا ڈیر کے حکم سے روزانہ نوبت بجائی جاتی تھی۔ گنبد سلطانی سنگ مرمر سنگ سل اور سنگ یشب سے بنائی گئی ہے اس میں موجود تین قبریں اپنی شان و شوکت کی داستانیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ قبریں ٹیپو سلطان شہید ان کے والد حیدر علی خان اور ان کی والدہ فاطمہ کی ہیں۔" (۱۵۵)

اقبال نے جب ٹیپو سلطان کے مقبرے پر حاضری دی اور روضہ میں داخل ہوئے تو پہلا قدم رکھتے ہی قرآن مجید کی آیت تلاوت فرمائی جس میں شہیدوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ زندہ ہیں ان کو مردہ مت کہو مگر تم لوگوں کو اس بات کا شعور نہیں ہے۔

حیدر علی کی قبر سیاہ غلاف میں ملفوف ہے دائیں طرف موجود دو قبروں میں ایک قبر جو سنہری

غلاف میں ملفوف ہے وہ والدہ سلطان ٹیپو کی ہے۔ اور دوسری قبر پر سرخ رنگ کا غلاف چڑھایا گیا ہے۔ سلطان ٹیپو کی ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں۔

''سرخ رنگ دراصل شہید کی نشانی ہے سلطان ٹیپو نے خود اپنے والدین کو یہاں دفن کیا اور یہ مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ مزار کے اندر کی فضا ایسی ہے کہ انسان پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔'' (۱۵۶)

علامہ اقبال نے بہت ہی عقیدت سے مزار کے اندر تلاوت فرمائی تھی کچھ وقت گزارنے کے بعد باقی لوگ روضے سے باہر آ گئے۔ لیکن تنہا اقبال سلطان شہید کی تربت کے قریب آنکھیں بند کیے دیر تک کھڑے رہے اور سب سے آخر میں باہر نکلے۔ روضے سے نکلنے کے بعد مسجد کے صحن میں اقبال کی کیفیات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''روضے کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد ہے اس کے باہر صحن میں سب لوگ جا کر بیٹھ گئے اور علی جان نے نہایت سوز کے عالم میں اقبال کا اردو اور فارسی کلام گانا شروع کر دیا۔ اقبال کے آنسوؤں کا سلسلہ نہ تھمتا تھا اور حاضرین پر بھی رقت طاری تھی۔ علی جان یہ کیفیت دیکھ کر گھبرا گئے اور گاتے گاتے رک گئے اقبال نے بڑے اضطراب کے عالم میں کہا رُک کیوں گئے جاری رکھو۔ سو علی جان گاتے رہے اور اقبال آنسو بہاتے رہے۔'' (۱۵۷)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کا روضہ ٹیپو سلطان پر دو گھنٹے یا اڑھائی گھنٹے کا دورانیہ بتایا ہے۔ جب اقبال روضہ سلطان سے باہر آئے تو ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھی۔ پھر علی جاں کی پرسوز آواز نے اقبال کے اضطراب میں اور اضافہ کیا میسور کے مشہور تاجر سیٹھ محمد عباس نے اقبال سے سوال کیا کہ سلطان شہید نے آپ کو کوئی پیغام دیا۔ اقبال نے پیغام کو اس شعر میں ڈھال دیا۔

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست   ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست   (۱۵۸)

ڈاکٹر تقی عابدی اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر دنیا میں مردانہ طور زندگی میسر نہ ہو تو مردانہ وار موت کو آغوش

میں لینا خود زندگی ہے۔" (۱۵۹)

اس شعر میں اس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں ٹیپو سلطان کو شہادت سے قبل کسی مشیر نے رائے دی تھی کہ انگریزوں سے مصالحت کر لی جائے۔ تو جواب میں سلطان ٹیپو نے بہت ہی خوبصورت بات کہی تھی کہ گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔ اقبال نے بعد میں اس میں مزید چار اشعار کا اضافہ بھی کیا تھا۔ جو اقبال کے انتہائی ذاتی تاثرات پر مبنی تھے۔ لیکن یہ کلام کسی بھی مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہے۔

آتشی در دِل دگر بُر کردہ ام
داستانی از دکن آوردہ ام
در کنارم خنجر آئینہ فام
می کشم اورا بتدریج از نیام
درجہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زند گیست (۱۶۰)

زندہ رود میں جاوید اقبال اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یعنی میں دکن سے ایک داستان ساتھ لایا ہوں جس نے میرے دل میں نئی حرارت پیدا کر دی ہے میرے پہلو میں آئینے جیسا ایک چمکدار خنجر ہے جسے میں آہستہ آہستہ نیام سے باہر نکل رہا ہوں۔ سلطان شہید کی طرف سے مجھے ایک نکتہ ملا ہے جسے بیان کیے دیتا ہوں۔ گو مجھے خوف ہے کہ اسے سن کر کہیں تیری عید کی خوشیوں میں تلخی کا رنگ نہ بھر جائے۔ میں جب ان کی خاک کو بوسہ دینے کی غرض سے وہاں تک پہنچا تو مزار پاک سے ندا آئی اگر جہاں میں مردوں کی طرح زندہ رہنا ممکن نہ ہو تو مردانہ وار جان قربان کر دینے میں زندگی ہے۔" (۱۶۱)

حضرت علامہ اقبال ٹیپو سلطان کے عاشق تھے اور متعدد بار ان کی تعریف میں اپنے جذبات کا اظہار اشعار کی زبانی کر چکے تھے۔ سلطان شہید کے مزار پر میسوری شاعر نے صرف ایک نظم سنائی تو

اشکوں کے موتی سب کے سامنے چھلک پڑے۔ اور اقبال اوّل سے آخر تک آبدیدہ رہے عبد المجید سالک کے حوالے سے ذکر اقبال میں علامہ اقبال فرماتے ہیں:

''میسور میں جہاں کہیں بھی گیا، لوگوں کی زبانوں پر ایک ہی نام تھا یعنی سلطان شہید کا نام جہاں دو تین آدمیوں کی محفل گرم ہوتی ایک ہی قصہ تھا ایک ہی رنگین داستان تھی جسے ہر کوئی بیان کرتا اور سب لوگ ادب سے سر جھکائے سنتے اور وہ سلطان شہید کی زندگی کا ماجرا تھا بازاروں میں دکان داروں کا موضوع سخن بھی یہ ہی تھا دو تین مجلسوں میں جہاں جانے کا مجھے اتفاق ہوا یہ ہی باتیں ہوتی رہیں میں نے عمداً کئی مرتبہ گفتگو کا رخ دوسری باتوں کی طرف پھیرا لیکن ہر بار پھر ٹیپو سلطان کا تذکرہ آجاتا۔ (۱۶۲)

علامہ محمد اقبال سلطان ٹیپو کے بہت بڑے مداح تھے اور روز گار فقیر میں سید وحید الدین ایک واقعہ تحریر کرتے ہیں جب ایک بڑے انگریز افسر نے اپنے کتے کا نام ٹیپو رکھ لیا تھا اور ہمیشہ اس کتے کو اسی نام سے پکارتا تھا۔ اقبال کو یہ بات بہت ہی ناگوار گزرتی تھی۔ اقبال کو انگریزوں کے اس رویے پر حد درجہ افسوس تھا مگر انگریزوں کے علاوہ مسلمان بھی اس جرم میں برابر کے شریک ہو رہے تھے فقیر سید وحید الدین تحریر کرتے ہیں:

''میں اس وقت ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں موجود تھا اور ان کے یہ الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے کہ ٹیپو سلطان کی عظمت کو تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ وہ مذہب وملت اور آزادی کے لیے آخری دم تک جنگ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اسی نیک مقصد میں شہید ہو گیا۔'' (۱۶۳)

درمیان کار زار کفر و دیں
ترکش مارا خدنگ آخریں (۱۶۴)

اقبال مولانا روم کو اپنا پیرومرشد تصور کرتے تھے۔ مولانا روم کے بعد ٹیپو سلطان ہی وہ شخصیت ہیں جن کے متعلق اقبال نے اشعار لکھے ہیں جن کی تعداد زیادہ ہے۔ اور ان اشعار کو جاوید نامہ کا حصہ بنا دیا ہے۔ جاوید نامہ اقبال کی زندگی کا ماحصل تھی اسی۔ لیے اس کتاب میں ان تمام شخصیات کو

شعروں کی زینت بنایا جن کے ذریعے اقبال اپنی فکر کو واضح کرنا چاہتے۔ تھے ٹیپو سلطان شہید کے حالات زندگی کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

''میسور کی سلطنت کا بانی حیدر علی خان کا بڑا بیٹا فتح علی خان جس کو ٹیپو سلطان اولیا کے نام پر ٹیپو سلطان کا نام دیا گیا۔ ۱۵ نومبر ۱۷۵۰ء میں کولار بنگلور میں پیدا ہوا اور ۱۷۸۲ میں اپنے باپ کے انتقال پر تخت نشین ہوا ٹیپو سلطان کا تمام دور حکومت انگریزوں، فرانسیسیوں مرہٹوں اور ان کی ہمدرد سلطنتوں سے لڑائی اور جنگ میں گزرا۔ جب ان تمام قوتوں کو جداگانہ فتح نصیب نہ ہوئی تو سب نے مل کر ٹیپو کے خلاف حملہ آوری شروع کر دی۔ انگریزی فوجیں ٹیپو کے فوجی سپہ سالار میر صادق کی غداری سے قلعہ میں داخل ہوگئی اور ٹیپو قلعہ کی مسجد میں لڑتا ہوا ۴ مئی ۱۸۹۹ء کو شہید ہو گیا۔'' (۱۶۵)

ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق ٹیپو سلطان کی شہادت کا تاریخ کا قطعہ ''شمشیر گمشدہ'' سے نکلتی ہے۔ دکن کے ایک نامعلوم شاعر نے اس واقعہ شہادت کی تاریخ ۱۲۱۳ ھجری مطابق ۱۷۹۹ء نکالی جس میں نظام حیدر آباد اور ان کے وزیر اعظم ارسطو جاہ اور ان کے سپہ سالار میر عالم کے ناموں کے ساتھ انگریزوں کے آلہ کار ہونے کی وجہ سے مسٹر کے عنوان سے لکھا

مسٹر نظام و مسٹر اعظم یزید شد
شمر العین چہ مسٹر عالم پدید شد
تاریخ از شہادت سلطان حیدری
ٹیپو بہ وجہ دین محمد شہید شد

ڈاکٹر تقی عابدی اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسٹر نظام اور ان کے وزیر اعظم یزید بن گئے ان کے سپہ سالار مسٹر عالم شمر لعین بن کر ظاہر ہوئے اس واقعہ کی تاریخ اس مصرع سے نکلتی ہے کہ ٹیپو سلطان دین محمد کی خاطر شہید ہو گیا۔'' (۱۶۶)

اقبال نے بنگلور کے دورے کے دوران آثار سلطانی کی بھی سیر کی۔ اقبال نے سلطان کا قلعہ

وہ اعلیٰ قلعہ کی مسجد جس میں ٹیپو سلطان شہید ہوا تھا سلطان کا قصر دریا و دولت باغ میر صادق کی مفروضہ قبر اور غدار لنگڑے غلام علی کی قبر کا بھی دیدار کیا اور جب کسی نے غدار غلام علی کی قبر پر اس کی تاریخ وفات کا شعر سنایا تو اقبال پھڑک اٹھے۔

ہیچ می دونی چہ دیدا زدست اواہل شہید
آں چہ اولاد محمدؐ دیدازدست یزید

ڈاکٹر تقی عابدی اس کی تشریح کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں

''یعنی جانتے ہو ٹیپو کے خاندان کا حال اس غدار کے ہاتھ سے وہی ہوا جو خاندان محمد کا حال یزید کے ہاتھ سے ہوا'' (۱۶۷)

علامہ اقبال نے ٹیپو سلطان کا تذکرہ جاوید نامہ میں زندہ رود کی شکل میں کیا ہے جاوید نامہ اردو اور فارسی ادب میں جدید اور بالکل نئی کاوش ہے جس کو اقبال نے ابن عربی کے معراج نامے فتوحات مکیہ ابوالعلا المصری کے رسالہ زعفران اور اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے کی ''ڈیواین کامیڈی'' کو مدِ نظر رکھ کر لکھا ہے۔ جاوید نامہ ایک تخیلی خلائی سفر ہے جو اقبال نے مولانا روم کی قیادت میں کیا تھا۔ اور چھ افلاک کی سیر کرتے ہوئے فردوس بریں تک جا پہنچے۔ عبدالمجید سالک ذکر اقبال میں تحریر کرتے ہیں:

''یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی اٹلی کے مشہور شاعر دانتے نے اسلام کے عقیدہ معراج اور نظریہ جنت دُوزخ کا مطالعہ کر کے ایک طویل نظم ''ڈیوائن کامیڈی'' کے نام سے لکھی تھی علامہ نے اس کا جواب لکھا ہے اور مولانا روم کی رہنمائی میں سیر افلاک کر کے مختلف منازل وطواسین طے کرتے ہوئے علامہ جمال الدین افغانی سعید حکیم پاشا مہدی سوڈانی منصور حلاج مرزا غالب قراۃ العین نطشے سید علی ہمدانی غنی کاشمیری بھرتری ہری نادر شاہ ٹیپو سلطان وغیرہ سے ملاقات اور گفتگو کی ہے۔'' (۱۶۸)

اقبال نے جب افلاک پر ان تمام شخصیات سے ملاقات کی تو ان کی ملاقات ٹیپو سلطان سے بھی ہوئی جو کہ اس تخیلی سفر کا نقطہ عروج تھی۔ رومی کے بعد ٹیپو سلطان پر سب سے زیادہ لکھے گئے اشعار کی تعداد اسی (۸۰) ہے۔ اس سفر میں سب سے آخر میں علامہ کی ملاقات سلطان ٹیپو سے ہوتی

ہے۔ اقبال نے میسور کے دریا کاویری کو زندہ رود کہا۔ اور ٹیپو کو بھی زندہ نامزد کیا۔ اس سے پہلے بھی اقبال جاوید نامہ میں حرکت بہ کاخ سلاطین مشرق میں بھی ٹیپو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

آں شہیداں محبت را امام (۱۶۹)

کیا بات ہے سلطان ٹیپو کی! کہ وہ محبت کے شہیدوں کا امام تھا۔

آبروئے ہند و چین و روم و شام (۱۷۰)

وہ ہند روم چین اور شام کی آبرو تھا۔

نامش از خورشید و مہ تابندہ تر

خاک قبرش از من و تو زندہ تر (۱۷۱)

اس کا نام سورج اور چاند سے زیادہ روشن ہے اس کی قبر کی مٹی مجھ سے اور تجھ سے زیادہ زندہ ہے۔

از نگاہ خواجۂ بدر و حنین

فقرِ سلطان وارث جذب حسین (۱۷۲)

جنگ بدر و حنین کے خواجہ یعنی حضرت محمدؐ کی نگاہ میں سلطان ٹیپو شہید کا فقر جذبہ حسین کا وارث تھا اقبال نے جاوید نامہ میں سلطان ٹیپو کی عظمت کا اظہار کرنے کے لیے سلطان شہید کے نام سے عنوان کو شامل کیا ہے۔

باز گو از ہند و از ہندوستان

آنکہ با کاش پر زد بوستان!

غلام احمد پرویز اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"سلطان ٹیپو شہید (۱۷۹۹ـ۱۷۴۹ء) کہنے لگا کہ اے زندہ رود (اقبال) ہندوستان کے متعلق کچھ اور بات کر یہ وہ ہندوستان ہے جس کے ایک تنکے کے برابر بوستان کی اہمیت نہیں (۱۷۳)

آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مرد

آنکہ از دیرش او آتش فسرد

آنکہ دل از بہراو خوں کردہ ایم

آنکہ یادش را بجاں پروردہ ایم (۱۷۴)

ہندوستان کی بات ہے جس کی مسجدوں میں ہنگامے مر گئے۔ وہ ہندوستان جس کے مندروں کے اندر آگ بجھ گئی نہ ہندو کا فرانہ انداز زیست میں رہا۔ اور نہ مسلمان مومنانہ فراست۔ دونوں ہی انگریز کے گرویدہ بن چکے ہیں۔ یہ وہ ہندوستان ہے جس کے لیے ہم نے اپنا دِل خون کیا ہے۔ یہ وہ ہندوستان ہے جس کی یاد کو ہم نے اپنی جان میں پالا ہے۔ (۱۷۵)

زائر شہر و دیارم بودہ ای

چشم خود را برمزارم سودہ ای

اے شناسائے حدود کائنات

در دکن دیدی زا آثار حیات (۱۷۶)

یہاں سلطان ٹیپو زندہ رود یعنی اقبال سے اپنے شہر کے حالات پوچھنا چاہتے ہیں۔ جنوبی ہند میں زندگی کے آثار ہیں یا وہ انگریزوں کے قبضے میں ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی اس شعر کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''تم نے میرے شہر اور سلطنت کی سیر و سیاحت کی ہے اور میری قبر پر گریہ وزاری بھی کی ہے بتاؤ اے دُور اندیش دانشمند کیا تم نے وہاں کچھ زندگی کے آثار بھی دیکھے۔'' (۱۷۷)

یہاں اقبال نے سلطان ٹیپو کے سوال کا جواب بھی دیا

تخم اشکے ریختم اندر دکن

لالہ ہا روید زخاکِ آں چمن

رود کاویری مدام اندر سفر

دیدہ ام درجان اوشورے دِگر (۱۷۸)

سن! میں نے اپنی آنکھوں کے بیج دکن میں بو دیئے ہیں اب اس چمن کی مٹی سے لالے کے پھول اُگتے ہیں۔ آزادی کے عاشق میرے دیئے گئے پیغام کی وجہ سے بیدار ہونے لگے ہیں۔ دریائے کاویری پہلے کی طرح ہمیشہ سفر میں ہے۔ میں نے اس کی جان میں ایک نیا شور دیکھا ہے۔ وہاں کے لوگ اب بیدار ہو رہے ہیں۔ اب انہیں اپنی آزادی کے سلب ہونے کا احساس ہونے لگا ہے۔ یہ تمام باتیں سننے کے بعد ٹیپو سلطان شہید نے علامہ اقبال کو کہا:

اے ترا دادند حرف دِل فروز
از تپ اشک تو می سوزم ہنوز

کاوِ کاوِ ناخن مردان راز
جوئے خوں بکشاد از رگہائے ساز

آں نوا کز جانِ تو آید بروں
می دہد ہر سینہ را سوزِ دروں

بودہ ام در حضرت مولائے کل
آنکہ بے اوطے نمی گردد سُبل (۱۷۹)

غلام احمد پرویز اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اے کہ خدا نے تجھے دلوں کو چمکا دینے والا کلام عطا کیا ہے۔ میں تیرے آنسوؤں کی تپش سے ابھی تک جل رہا ہوں تیرے پرسوز کلام اور پردرد شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ راز جاننے والے مردوں کے ناخن نے محنت کاوش سے ساز کی رگوں سے جوئے خوں نکالی ہے۔ جو کلام تو کہتا ہے وہ ہر سینے کو سوز دروں عطا کرتا ہے۔ میں مولائے کل حضرت محمدؐ کے حضور رہا ہوں یہاں مولائے کل رسولؐ ہیں۔'' (۱۸۰)

مزید سلطان شہید علامہ اقبال نے بیان کرتے ہیں:

گرچہ آنجا جرأت گفتار نیست
روح را کارے بجز دیدار نیست!
سوختم از گرمی اشعار تو
برزبانم رفت از افکار تو!
گفت ایں بیتے کہ برخواندی زکسیت
اندر او ہنگامہ ہائے زندگی است!
باہماں سوزے کہ درسازو بجاں
یک دو حرف ازما بہ کاویری رساں

درجہاں تو زندہ رور او زندہ رود
خوشترک آید سرود اندر سرود(۱۸۱)

غلام احمد پرویز ان اشعار کی شرح کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''اگرچہ وہاں کسی کو بات کرنے کی جرأت نہیں اور وہاں روح کو سوائے ان کا دیدار کرتے رہنے کے اور کوئی کام نہیں ہے۔ میں چونکہ تیرے اشعار کی گرمی سے جلا ہوا تھا میری زبان پر اچانک اور بے ساختہ تیرے افکار آگئے اور میں نے سنا دیئے۔ مجھ سے حضورؐ نے پوچھا کہ یہ اشعار جو تو نے پڑھے ہیں کس کے ہیں۔ ان کے اندر زندگی کے ہنگامے ہیں۔ اب تُو اسی سوز سے جو جاں سے موافقت رکھتا ہے۔ میری طرف سے ایک دو باتیں دریائے کاویری یعنی وہاں کے رہنے والوں کو پہنچادے۔ کائنات میں تو بھی زندہ رود ہے اور وہ بھی زندہ رود۔ سرود کے اندر سرود بہت خوب رہے گا تو بھی گا رہا ہوگا، وہ بھی مترنم ہوگی کیا سماں بندھے گا۔'' (۱۸۲)

اقبال نے جاوید نامہ میں پیغام سلطان شہید کی رود کاویری کے عنوان سے ایک نظم شامل کی ہے۔ جس میں سلطان شہید کا پیغام کاویری ندی کے نام ہے۔ وہ اس پیغام کے ذریعے زندگی موت

اور شہادت کی حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

رود کاویری یکے نرمک خرام
خستہ شاید کہ ارہ سرِ دوام !
در کہستاں عمر ہا نالیدہ
راہِ خور را با مژہ کا ویدہ
اے مرا خوشترز جیحوں وفرات
اے دکن را آب تو آب حیات
آہ شہری کہ در آغوشِ تو بود
حسن نوشیں جلوہ از نوشِ تو بود
کہنہ گردیدی شباب تو ہماں
پیچ و تاب و رنگ و آب توہماں
موج تو جز دانہ گوہر نزاد
طرہ تو تا ابد شوریدہ باد (۱۸۳)

غلام محمد پرویز اس کی شرح کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

''اے کاویری ندی' ذرا آہستہ چل شاید تو مسلسل چلنے سے تھک گئی ہے۔ تو پہاڑوں میں ایک عمر سے شور مچاتی ہوئی چل رہی ہے۔ تو نے اپنی راہ کو اپنی مژگاں سے کھودا ہے۔ اپنے زور سے اپنا راستہ بنایا ہے۔ اے کہ تو مجھ کو جیحوں اور فرات سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔ اے کہ دکن کے لیے تیرا پانی زندگی کا پانی ہے''(۱۸۴)

یہاں آہ شہری کو در آغوش سے مراد شہر سرنگا پٹم ہے۔ اقبال نے بہت خوبصورتی سے یہاں، نوشین، زہر کے مقابل کے طور پر استعمال کیا ہے۔

''آہ وہ شہر جو کبھی تیرے پہلو میں یعنی تیرے کنارے پر تھا۔ اس شہر کا شیریں جلووں والا حسن تیرے پانی کی وجہ سے زندگی عطا کرتا ہے۔ تو اے

کاویری! اگرچہ پرانی ہوگئی ہے لیکن تیرا شباب اسی طرح ہے۔ تیرا پیچ وتاب اور تیرا رنگ آب اسی طرح ہے۔ تیری موج نے موتی کے ایک دانہ کے سوا کچھ نہیں پیدا کیا۔ یعنی سلطان ٹیپو جیسا گوہر پیدا نہیں کیا۔ خدا کرے تیرا طرہ ابد تک شوریدہ رہے۔" (۱۸۵)

اے ترا سازے کہ سوزِ زندگی است
ہیچ می دانی کہ ایں پیغام کیست
آنکہ می گردی طواف سطوتش
بودہ آئینہ دارِ دولتش
آنکہ صحرا ہا ز تدبیرش بہشت
آنکہ نقش خود بخونِ خود نوشت
آنکہ خاکش مرجع صد آرزوست
اضطراب موج تو از خونِ اوست
آنکہ گفتارش ہمہ کردار بود
مشرق از خواب و او بیدار بود (۱۸۶)

"اے کاویری تیری لہروں کا ترنم زندگی کا سوز پیدا کر رہا ہے۔ کیا تو جانتی ہے کہ یہ پیغام کس کا ہے۔؛ تجھے پتہ ہے کہ یہ وہ ہستی ہے جس کی سطوت کا تو طواف کرتی رہی ہے جس کے دارالحکومت یا سلطنت کی تو آئینہ داری کر رہی ہے۔ وہ کہ جس کی تدبیر سے صحرا بہشت بن گئے۔ وہ کہ جس نے اپنے خون سے اپنا نقش لکھا جس نے شہادت کو گلے لگایا۔ مشرق جس وقت خواب میں تھا وہ بیدار تھا یعنی جب مشرق کے لوگ پوری اقوام کی یلغار کے سامنے بے بس ہو کر غلامی کی زندگی پر قناعت کر رہے تھے اس نے آزادی کے لیے انگریز سے وہ جنگ لڑی کہ وہ خود شہید ہو گیا لیکن غلامی قبول نہیں کی۔" (۱۸۷)

اے من و تو موج از دِور حیات
ہر نفس دیگر شود ایں کائنات
زندگانی انقلاب ہر دمے ست
زانکہ او اندر سراغ عالمے ست
در چمن گل میہماں یک نفس
رنگ و آتش امتحان یک نفس
موسم گل ؟ ماتم وہم نامی و نوش
غنچہ در آغوش و نقش گل بدوش
سینہ داری اگر در خوردِ تیر
در جہاں شاہین بزی شاہین بمیز

اے کہ میں اور تُو دونوں زندگی کے دریا کی موجیں ہیں۔ یہ کائنات ہر لحہ ایک نیا رُخ اختیار کر لیتی ہے ہم دریائے حیات میں ابھرتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں یہی حال کائنات کی دوسری اشیاء کا ہے۔ کوئی چیز ایک جگہ نہیں رہتی زندگی ہر لحہ کے انقلاب کا نام ہے زندگی ہر لحہ ایک نئے عالم کے سراغ میں لگی رہتی ہے۔ یہاں تو ہر وقت نیا اضطراب اور نیا نقش ہے۔ (۱۸۸)

چونکہ اقبال کا نظریہ بھی تغیر ہی تھا۔ اس کائنات میں ہر چیز کو تغیر ہے۔ ثبات کسی کو بھی نہیں ہے۔ تغیر کی بدولت ہی ہر چیز میں ذوق نمود ہے۔

علامہ اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے دوست مہاراجہ کشن پرشاد کے یارانہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک مضمون رقم کیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی مہاراجہ کشن کا تعارف کرواتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''مہاراجہ کشن پرشاد مہاراجہ نریندر بہادر کے فرزند اور مہاراجہ چند ولال کے پوترے تھے جن کے جد راجہ نورٹل شہنشاہ اکبر کے وزیر مالگزاری

تھے جن کا اصلی وطن لاہور تھا۔ مہاراجہ خوش اخلاق ادب نواز اور گنگا جمنی
تہذیب کے علم بردار تھے۔ آپ کہنہ مشق صاحب دیوان شاعر تھے اور شاد
تخلص کرتے تھے۔ اردو اور فارسی میں نعتیہ اشعار بھی کہتے تھے آپ کی نعتوں
کا مجموعہ آپ کی زندگی ہی میں شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا تھا۔'' (۱۸۹)

مہاراجہ کو مختلف مقامی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ جن میں انگریزی بھی شامل تھی۔ علم رمل، علم نجوم، خطاطی، نقاشی کے علاوہ موسیقی کے بھی دلدادہ تھے۔ مہاراجہ نے چار شادیاں مسلمان گھرانے میں کیں اور تین ہندو گھرانے میں۔ مسلمان اولاد کی تعلیم و تربیت مسلمانوں کے طریقے کے مطابق کی۔ اور ہندو اولاد کی ہندو رسومات کے مطابق کی۔ خود مسجد میں جا کر تلاوت بھی فرماتے اور مندر بھی جایا کرتے تھے۔ ان کی وفات پر ان کی آخری رسومات ہندوانہ طریقے کے مطابق کی گئی تھی۔ کیونکہ کسی نے افواہ اڑائی تھی کہ مہاراجہ مسلمان ہو گئے ہیں مگر یہ بات غلط ثابت ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے یہ بھی بتایا کہ مہاراجہ کی وفات کے بعد ان کے ہندو بیٹے خواجہ پرشاد جو ہندو بیوی کے بطن سے تھے ان کو جانشین قرار دیا گیا جس کو بعد میں ایک انگریز نے چھت سے نیچے گرا کر قتل کر ڈالا تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی علامہ اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد کے تعلق کی مختلف وجوہات بیان کی ہیں:

''مہاراجہ کے جد کا تعلق پنجاب کی سرزمین سے ہونے کے علاوہ
مہاراجہ اقبال کی طرح فقیرانہ عادت اور درویش صفت اوصاف اور صوفیانہ
خیالات سے ہمکنار تھے۔ اقبال کی طرح مہاراجہ بھی داغ دہلوی کے ان
شاگردوں میں شامل تھے۔ جن پر داغ کو فخر تھا۔ اقبال کی طرح مہاراجہ بھی
اردو اور فارسی میں اشعار کہتے اور مہاراجہ کو بھی حضور اکرمؐ سے بے نہایت محبت
اور عقیدت حاصل تھی جو ان کے مجموعہ گلبن نعت سے ظاہر ہے۔'' (۱۹۰)

مہاراجہ نے اقبال کو اس وقت سہارا دیا تھا جب اقبال پر ہر طرف سے مخالفین حملہ کر رہے تھے۔ مولوی دیدار علی خطیب مسجد وزیر خان نے اقبال پر کفر کا فتویٰ دیا۔ برق ملسانی ار جوش ملسانی نے مستعار نام حضرت جراح کے نام کے ساتھ اقبال کی زبان دانی اور ان کے کلام کی فنی غلطیوں پر لاہور کے اخبار ''پارس'' میں مضمون لکھے۔ اقبال نے جب اسرار خودی لکھنے کا کام شروع کیا تو ان کو

رفتہ رفتہ احساس ہونے لگا تھا کہ یہ مثنوی وہ خود نہیں لکھ رہے بلکہ ان سے لکھوائی جا رہی ہے۔ چنانچہ مہاراجہ کشن پرشاد کو ۱۴ اپریل ۱۹۱۶ء میں تحریر کرتے ہیں:

''یہ مثنوی جس کا نام ''اسرار خودی'' ہے ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر و مستی بیخودی کی طرف ہے مگر قسم ہے اس خدائے واحد کی جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے اور میں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کے لیے کیوں کر انتخاب کیا گیا۔'' (۱۹۱)

اسی طرح ۱۹۱۶ء میں جب اقبال نے تاریخ تصوف لکھنا شروع کی تو آپ کو مطلب کا مسالہ نہیں مل رہا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جب رامائن کو اردو قالب میں ڈھالنے کا قصد کیا تب بھی مہاراجہ کشن پرشاد کو کہا کہ اگر سعد اللہ مسیحا پانی پتی کی مثنوی (رامائن کا فارسی قصہ جو نظم کی صورت میں تھا) اگر ان کے کتب خانہ میں ہو تو اقبال کو ارسال کی جائے مگر یہ مثنوی مہاراجہ کے کتب خانہ میں موجود نہ تھی۔ چنانچہ اقبال یہ خواب پورا نہ کر سکے اور پھر بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ کرنے کا سوچا ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''مہاراجہ کشن پرشاد کے کتب خانہ میں متذکرہ مثنوی موجود نہ تھی اس لیے یہ ارادہ تشنہ تکمیل رہا۔ پھر ۱۹۲۱ میں بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ کرنے کا خیال آیا۔'' (۱۹۲)

یہاں تک کہ اردو معلیٰ میں حسرت موہانی اور برج نارئین چکبست لکھنوی کے علاوہ اودھ پنچ اردو اخبار میں اقبال کے کلام کو غلط اعتراضات کا نشانہ بنایا۔ شادی لعل بھی اقبال کے راستے میں رکاوٹ بننے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

''بہر حال ان حالات میں مہاراجہ کی مکمل ہمدردی علامہ اقبال کے ساتھ تھی اور اسی لیے یہ دوستانہ تعلقات اتنے گہرے ہو گئے تھے کہ مراسلاتی تحریروں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مہاراجہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیوں

میں بھی علامہ اقبال سے مشورے کیا کرتے تھے۔'' (۱۹۳)

مہاراجہ کی لاہور میں آمد پر معلوم ہوا کہ اقبال تنگ دستی کا شکار ہیں۔ تین بیویاں اور دو بچے اقبال کے لیے معاشی طور پر ٹھیک طریقے سے کنٹرول کرنا قدرے مشکل ہو رہا تھا۔ چنانچہ واپس جا کر فوراً اقبال اکی معاشی حالت بہتر کرنے کے لیے اقدامات کیے۔ مگر اقبال نے یہ وظیفہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہاں ڈاکٹر تقی عابدی نے ایک خط بھی حوالے کے طور پر پیش کیا مگر اس خط کی کوئی تاریخ نہیں دی ہے۔

''مجھے معلوم نہیں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ دوست نوازی اور غریب پروری آپ کا خاندانی وطیرہ ہے۔ آپ کا یہ فیض مجھے ایک لمحے میں ثروت مند کر دے گا۔ لیکن میری طبیعت اور میری ذہانت داری کا یہ تقاضا نہیں کہ اجرت تو آپ سے حاصل کروں اور اس کے مقابل آپ کا کوئی کام نہ کر سکوں۔ ہمیشہ کی طرح آپ کا اقبال معنوی دوست ہے۔ اور رہے گا۔ آپ نے جو اپنے صمیم قلب سے محبت کی ہے وہ ہمیشہ دوستی کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔'' (۱۹۴)

اقبال نے اپنا دکھ درد مہاراجہ کشن پرشاد کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ یہاں ڈاکٹر تقی عابدی مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اقبال کے دو خط شامل کیے ہیں پہلا خط اقبال نے ۱۹۲۳ء میں سَر کا خطاب ملنے پر (حکومت انگلستان کی طرف سے) مہاراجہ کو لکھا یہ مہاراجہ کے خط کا جواب تھا۔

''یہ خطاب مجھے حکومت انگلستان نے اسرارِ خودی کے اشعار سے متاثر ہو کر دیا ہے۔ جس پر انگریزی زبان میں ترجمہ ہونے کے باعث یورپ اور امریکہ میں کئی تبصرے شائع ہوئے ہیں۔''(۱۹۵)

اقبال ہندوؤں اور مسلمانوں کے تنازعات سے بہت غمگین رہتے تھے۔ اقبال نے ۱۹ مارچ ۱۹۲۳ء کو مہاراجہ کو لکھا:

''افسوس کی یہ بات ہے کہ پنجاب میں بھی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور عداوت اپنی عروج پر پہنچ چکی ہے اور اگر یہی حال جاری

رہے تو آئندہ ۳۰ سالوں میں ان ملتوں کا مل کر زندگی کرنا (گزارنا) دشوار ہوگا۔" (۱۹۶)

اقبال کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی اور اس یادداشت کے کوئی (۲۵) سال بعد برصغیر میں پاکستان کا وجود عمل میں آیا۔

اقبال اور ڈاکٹر راس مسعود

ڈاکٹر تقی عابدی نے ڈاکٹر راس مسعود اور اقبال کے دیرینہ تعلقات کو بھی اپنی کتاب اقبال کے عرفانی زاویے میں جگہ دی ہے۔ دونوں کے تعلقات کے علاوہ ڈاکٹر تقی عابدی نے ڈاکٹر راس مسعود کا تعارف بھی کروایا۔

"ڈاکٹر راس مسعود ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ میں پیدا ہوئے وہ جسٹس سید محمود کے بیٹے اور سر سید احمد خان کے پوتے تھے۔ ڈاکٹر راس مسعود نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ پٹنہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر ہوئے اور بعد میں کنگ کالج میں تاریخ کے پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۱۵ء میں حیدر آباد دکن میں ناظم تعلیمات مقرر ہوئے ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ پھر ۱۹۳۴ء میں وائس چانسلری سے استعفیٰ دے کر ریاست بھوپال میں وزیر تعلیم بنے" (۱۹۷)

ڈاکٹر تقی عابدی نے بیان کیا ہے کہ اقبال کا ڈاکٹر راس مسعود کے نام پہلا خط ستمبر ۱۹۳۳ء کا ہے۔ جو افغانستان کی دعوت کے متعلق ہے۔ اقبال جن دنوں علی گڑھ میں تھے تو آپ کا قیام عبداللہ چغتائی کے ہاں تھا۔ آپ نے چھ مقالات پڑھے تھے۔ پہلے ہی جلسے میں ڈاکٹر راس مسعود نے اقبال کو ان الفاظ میں عزت واحترام سے بلایا۔

"جب میں یورپ میں بیماری کی وجہ سے بیمارستان میں داخل ہوا تو صرف اقبال کے اشعار مجھے تسکین قلب دیتے تھے۔ اسی زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی نے علامہ کو ادبیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔" (۱۹۸) -

ڈاکٹر راس مسعود اقبال کے مزاج سے اس قدر واقف تھے کہ ان کو اقبال کی بات چیت سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ اب علامہ اقبال بھوپال آنا چاہتے ہیں۔ روزگار فقیر میں سید فقیر وحید الدین تحریر کرتے ہیں:

"وہ جب بھی لاہور میں رہتے رہتے اکتا جاتے تو سر راس مسعود کو لکھتے کہ ان دنوں روحانی اور جسمانی سکون کی تلاش میں ہوں سر راس مسعود ڈاکٹر صاحب کے مزاج شناس بھی تھے وہ ان کے لکھنے کا یہ مفہوم لیتے کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت بھوپال آنے کو چاہتی ہے سر راس مسعود انہیں لکھتے کہ آپ بھوپال تشریف لے کر غریب خانہ کو رونق بخشیں تو دو مانوس روحیں اور شناسا دل یک جا ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب اس کے جواب میں اپنی آمد کی تاریخ سے سر راس مسعود کو مطلع فرماتے:" (۱۹۹)

اقبال سر راس مسعود کے ساتھ قوم کے حوالے سے بہت ہی پر سوز لہجہ میں گفتگو کرتے تھے۔ بلکہ زار و قطار رونے کی نوبت آجاتی۔ ان کے اندر قوم کے لیے اس قدر سوز تھا جو انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ اقبال نے جب گلے میں زیادہ تکلیف محسوس کی تھی تو ڈاکٹر راس مسعود نے ہی بھوپال میں ان کے علاج کا انتظام کیا تھا۔ یہاں تک کہ سر راس مسعود کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تو اس کا نام اقبال نے ہی رکھا تھا۔ روزگار فقیر میں فقیر سید وحید الدین تحریر کرتے ہیں:

"سر راس مسعود کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو ڈاکٹر صاحب سے کہا گیا کہ آپ اس نومولود کا نام رکھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے "نادرہ مسعود" نام تجویز کیا اور اسی نام کو سب نے پسند کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے لڑکے کا نام "جاوید" اپنی لڑکی کا نام "منیرہ" اور راس مسعود کی صاحب زادی کا نام نادرہ رکھا ان ناموں میں کتنی پاکیزگی شعریت اور ندرت پائی جاتی ہے۔" (۲۰۰)

علامہ اقبال سر راس مسعود کو دماغی لحاظ سے انگریز کہتے تھے اور دلی لحاظ سے سچا مسلمان تصور کرتے تھے جبکہ ڈاکٹر راس مسعود اس بات کی تردید جن الفاظ میں کرتے تھے فقیر سید وحید الدین نے ان الفاظ کو یوں نقل کیا ہے۔

''اقبال غنیمت ہے کہ میرا دماغ مسلمان کا اور دل انگریز کا نہیں ہے'' (۲۰۱)

اقبال کے شعر خود ان کو اس طرح یاد نہ تھے جس طرح ڈاکٹر راس مسعود کو یاد تھے۔ اقبال ڈاکٹر راس مسعود کی حاضر جوابی۔ برجستہ گوئی اور اقبال شناسی کے آگے سپر انداختہ ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر راس مسعود کے علاوہ ان کی بیگم زیادہ حاضر جواب اور ادب کی قدر کرنے والی تھیں۔ اقبال ڈاکٹر راس مسعود کے ہاں طویل قیام فرماتے تھے۔ بیگم راس مسعود ان کی میزبانی اور خاطر مدارت میں لگی رہتی تھیں وہ اقبال کی عادت مشاغل اور رجحانات کے مطالعہ کے مواقع ان کو میسر آتے رہے اور وہ علامہ کے مزاج کو خوب سمجھتی تھیں۔ فقیر سید وحید الدین تحریر کرتے ہیں۔

''ڈاکٹر صاحب کے یوں تو بہت سے احباب تھے مگر راس مسعود کی محبت اور لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ہر وقت سوچتے رہتے جب ڈاکٹر صاحب کی علالت طویل سے طویل تر ہوتی چلی جارہی تھی۔ ان کے مالی حالات بھی اچھے نہیں تھے آخر کار ڈاکٹر صاحب کے حالات پر بہت کچھ غور کرنے کے بعد نواب سر حمید اللہ خان فرمانروائے بھوپال اور سر آغا خان سے سلسلہ جنبانی کی اور بڑے عزت وقار کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے معاملہ کو پیش کیا۔'' (۲۰۲)

اسی طرح ان کی کوشش سے نواب بھوپال نے پانچ پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔ کیونکہ اقبال نے سر راس مسعود سے یہ بات خواہش کی صورت میں ظاہر کی تھی کہ حضرت بھوپال اگر مجھے تاحیات وظیفہ دیں تو وہ اطمینان کے ساتھ قرآن مجید کے متعلق ایسی کتاب لکھیں گے جس کی نظیر نہیں ملتی اور وہ ان کو زندہ جاوید رکھے گی۔ سر راس مسعود نے دوسری ریاستوں جن میں حیدر آباد دکن اور بہاول پور شامل تھے۔ اقبال کی مدد کے لئے خطوط لکھے مگر اقبال نے وظیفہ لینے سے انکار کر دیا اور نواب بھوپال کی امداد کو کافی جانا۔ اقبال کی زندگی امیرانہ نہ تھی وہ درویشانہ زندگی گزراتے تھے۔ اقبال نے جب سر راس مسعود کو ان کے دادا کے متعلق خواب سُنایا جو اس بات کی دلیل ہے کہ اقبال کو سر سید احمد خاں سے خاص عقیدت تھی۔ ڈاکٹر تقی عابدی اس واقعے کو یوں تحریر کرتے ہیں:

''تین اپریل کو رات جب شیش محل بھوپال میں سو رہا تھا میں نے

خواب میں آپ کے دادا سر سید احمد خان کو دیکھا تو انہوں نے کہا اپنی بیماری کی حضور رسالت مآب سے شفا طلب کروں چنانچہ اسی حالت میں بیدار ہو کر چند اشعار نظم کیے تھے اور لاہور پہنچ کر ان اشعار کو تکمیل کیا جو فارسی مثنوی

''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' کا حصہ ہوں گے۔'' (۲۰۳)

ڈاکٹر تقی عابدی نے بیان کیا ہے کہ مثنوی کا عنوان در حضور رسالتؐ ہے جو (۶۲) اشعار پر مشتمل ہے اس کے ایک شعر پر ہی ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مضمون کا اختتام کیا تھا۔

با پرستاران شب دارم ستیز

باز روغن در چراغ من بریز

(میں تاریکی پھیلانے والوں سے لڑ رہا ہوں کچھ اور تیل میرے چراغ میں ڈال دے۔ (۲۰۴)

اقبال کو ڈاکٹر راس مسعود پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ انھیں دونوں صغیر بچوں جاوید اور منیرہ کا سرپرست اور ولی بنانا چاہتے تھے۔ مگر راس مسعود بعض وجوہات کی بنا، پر ولی نہیں بننا چاہتے تھے۔ بہر حال راس مسعود ڈاکٹر علامہ اقبال سے نو مہینے قبل فوت ہو گئے۔ شیخ اعجاز احمد کو بدل کر اقبال سر راس مسعود کو گارڈین مقرر کرنا چاہتے تھے چنانچہ اقبال نے ۱۰ جون ۱۹۳۷ء کو سر راس مسعود کو لکھا:

''شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود بہت عیال دار تھے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو گارڈین مقرر کروں مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔'' (۲۰۵)

مگر ڈاکٹر راس مسعود علامہ اقبال سے پہلے ہی فوت ہو گئے اقبال کے لیے ڈاکٹر راس مسعود کی موت کسی سانحہ سے کم نہ تھی۔ یہ صدمہ اقبال کے لیے ناقابل برداشت تھا اقبال کو سر راس مسعود کی موت کا یقین نہ آتا تھا۔ مفصل حالات سے آگاہی کے لیے ڈاکٹر راس مسعود کے سیکرٹری ممنون حسن خان کا تار اور خط ارسال کیے اور خبر کی تصدیق کروائی۔ پھر خط کے ذریعے لیڈی امت المسعود کو مرحوم دوست کی

وفات پر ڈھارس بندھائی۔ اقبال نے ڈاکٹر مسعود کے کتبے کے لیے رباعی بھی لکھی رباعی کے علاوہ شعر کا ایک مصرعہ بھی ارسال کیا کہ اگر ایک مطلع ان کے سنگ مزار پر لکھنا ہو تو مندرجہ ذیل لکھیے گا۔

اے برادر من ! تیرا از زندگی دوام نشان

خواب را مرگ سبک داں مرگ را خواب گراں (۲۰۶)

ڈاکٹر جاوید اقبال نے ڈاکٹر راس مسعود کے غم کو اقبال کی زبانی ان جذبات کے ساتھ نقل کیا ہے۔

''مسعود کا غم باقی رہے گا جب تک میں باقی ہوں'' (۲۰۷)

علامہ اقبال اور آفتاب اقبال

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے اس مضمون میں علامہ اقبال اور ان کے بیٹے آفتاب اقبال کے کشیدہ تعلقات کی داستان کو قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن وجوہات کو بھی بیان کیا ہے جو باپ اور بیٹے کے درمیان رنجش کا سبب ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مضمون میں آفتاب اقبال کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۹ بیان کی ہے جب کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مضمون علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی میں آفتاب اقبال کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۸ء بتائی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی اپنے مضمون علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی میں لکھتے ہیں:

''کریم بی بی کے بطن سے پہلی بیٹی معراج بیگم ۱۸۹۴ء اور دوسرا بیٹا آفتاب اقبال ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے'' (۲۰۸)

اب ڈاکٹر تقی عابدی کا مضمون علامہ اقبال اور آفتاب اقبال (باپ اور بیٹے کے کشیدہ تعلقات کی داستان) میں آفتاب اقبال کی پیدائش یوں بیان کرتے ہیں

''آفتاب اقبال علامہ اقبال کے بڑے بیٹے تھے جو ۱۸۹۹ء میں پنڈ دادن خان ضلع شاہ پور میں پیدا ہوئے'' (۲۰۹)

اگر زندہ رود کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں بھی جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے آفتاب اقبال کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۸ء ہی بتائی ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال زندہ رود میں لکھتے ہیں:

"۱۸۹۸ء میں آفتاب اقبال پیدا ہوئے" (۲۱۰)

زندہ رود میں ہی ڈاکٹر جاوید اقبال نے آفتاب اقبال کی تاریخ پیدائش کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ حواشی میں ۱۸۹۹ء کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ۱۸۹۹ء شیخ اعجاز احمد کی تاریخ پیدائش بتائی ہے۔

"آفتاب اقبال شیخ اعجاز احمد سے سات یا آٹھ ماہ بڑے ہیں شیخ اعجاز احمد کی تاریخ پیدائش ان کے بیان کے مطابق ۱۲ جنوری ۱۸۹۹ء ہے۔" (۲۱۱)

ڈاکٹر تقی عابدی نے آفتاب اقبال کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۹ء کے ساتھ ساتھ پنڈ دادن خان ضلع شاہ پور لکھی ہے۔ آفتاب اقبال، اقبال کی پہلی بیوی کریم بی کے بطن سے پیدا ہوئے کریم بی علامہ اقبال کی پہلی بیوی تھی جن سے علامہ کی شادی ۱۸۹۳ء میں ہوئی زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

"۴ مئی ۱۸۹۳ کو جب میٹرک کے نتیجے کی خبر اقبال کو ملی تو اقبال نے سہرا باندھ رکھا تھا۔ اور ان کی بارات سیالکوٹ سے گجرات روانہ ہونے والی تھی اسی روز ان کی شادی گجرات کے ایک متمول کشمیری گھرانہ میں ہوگئی۔ ان کی بیوی کا نام کریم بی تھا شادی کے وقت اقبال کی عمر سولہ اور کریم بی کی انیس برس تھی۔" (۲۱۲)

کریم بی کے بطن سے علامہ اقبال کی دو اولادیں پیدا ہوئیں۔ معراج بیگم ۱۸۹۴ میں پیدا ہوئیں۔ جو بعد میں خنازیر کے عارضے سے فوت ہوگئیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

"کریم بی سے اقبال کے ہاں دو بچے ہوئے ۱۸۹۶ء میں معراج بیگم پیدا ہوئیں۔ خدا نے انہیں سیرت وصورت سے نوازا تھا مگر انہیں خنازیر کا مرض لاحق ہوگیا۔ بہت علاج کرائے گئے لیکن وہ جانبر نہ ہوسکیں۔ ان کا انتقال ۱۹۱۵ء میں سیالکوٹ میں بعمر انیس برس ہوا۔" (۲۱۳)

ڈاکٹر تقی عابدی نے معراج بیگم کی جائے پیدائش کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جب کہ جاوید اقبال نے ان کی جائے پیدائش سیالکوٹ تحریر کی ہے۔ جاوید اقبال کا بیان زندہ رود میں اس نوعیت کا ہے۔

"ان کا انتقال ۱۹۱۵ء میں سیالکوٹ میں بعمر انیس برس ہوا۔ امام

صاحب کے قبرستان میں اپنے دادا اور دادی کی قبروں کے قریب دفن ہوئیں۔" (۲۱۴)

ذکر اقبال میں عبدالمجید سالک نے معراج بیگم کا نام مریم بتایا ہے۔

"اقبال کی یہ پہلی شادی ناکام ہوئی۔ اگرچہ انہوں نے نباہ کی بے حد کوشش کی اور اس بیوی سے ایک لڑکی مریم (مرحومہ) اور ایک فرزند آفتاب اقبال پیدا ہوئے۔ مریم کا انتقال علامہ کی والدہ محترمہ کی وفات سے بھی پہلے ہو گیا تھا۔ امام صاحب کی (سیالکوٹ) کے مقبرے کے پاس قبر ہے۔ وہیں علامہ کے والدین کی قبریں بھی ہیں:" (۲۱۵)

مگر حیات جاوداں میں محمد عبداللہ قریشی کے مطابق معراج بیگم کا انتقال ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو اٹھارہ برس کی عمر میں ہوا۔

"اس بیوی کے بطن سے ایک بیٹی معراج بیگم اور ایک فرزند ڈاکٹر آفتاب اقبال پیدا ہوئے معراج بیگم تو ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو اٹھارہ برس کی عمر میں انتقال کر گئی۔ مگر آفتاب اقبال بیرسٹرایٹ لا نے ۱۴ اگست ۱۹۷۹ء کو لندن میں انتقال کیا اور کراچی میں دفن ہوئے۔" (۲۱۶)

کریم بی اور علامہ اقبال میں اختلاف کی وجہ سے کریم بی بی گجرات میں اپنے والدین کے پاس ہی رہا کرتی تھی۔ علامہ اقبال کو آفتاب اقبال کی تعلیم و تربیت کی فکر تھی اسی لیے انہوں نے آفتاب اقبال کو سکاچ مشن ہائی سکول میں داخل کروایا جہاں انہوں نے ۱۹۱۶ کو میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کر لیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے آفتاب اقبال کی تعلیم کے مدارج کو یوں بیان کیا ہے۔

"پھر سینٹ پال دہلی سے بی۔ اے (BA) کا امتحان بھی فلسفہ میں آنرز کے ساتھ پاس کیا اور ۱۹۲۱ء میں ایم۔ اے (MA) کی ڈگری فلسفہ میں حاصل کی۔ آفتاب کے ماموں کیپٹن غلام محمد اور نانا ڈاکٹر عطا محمد نے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان روانہ کیا۔ جہاں آفتاب نے ۱۹۲۲ء میں اسی یونیورسٹی سے ایم۔ اے (MA) کر کے دو سال کے لیے ہندوستان آئے اور

پھر انگلستان جا کر تین سال تک وہاں School of Oriental Studies میں ملازم ہوئے۔ اسی دوران Lincoin Inn میں داخلہ لے کر بار ایٹ لا میں کامیابی حاصل کی۔'' (۲۱۷)

۱۹۴۱ء میں بار ایٹ لا کی پریکٹس شروع کی۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں آخری عمر تک وکالت کے شعبے سے منسلک رہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۷۹ء کو کراچی میں دفن کیا گیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے آفتاب اقبال اور علامہ اقبال کے تعلقات کی کشیدگی کی وجہ ازدواجی زندگی کے مسائل کو قرار دیا ہے۔ کریم بی بی اور علامہ اقبال کے تعلقات کی کشیدگی کا اثر ان کی اولاد پر پڑا۔ ایک تو والد کی شفقت سے محرومی تھی اور دوسری طرف آفتاب اقبال کا ذہنی رویہ۔ آفتاب اقبال اپنے والد کو قصور وار سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں

''عطیہ فیضی نے اس شادی کی شکست کی وجہ دونوں کی فکری صلاحیتوں میں شدید فرق اور طبیعتوں میں اختلاف بتایا ہے۔ اس شادی کے اختلافات اور دوری کی وجہ سے آفتاب اقبال علامہ کی محبت اور شفقت سے محروم ہوئے۔ اور جو کہ وہ اپنی ماں کے ہم خیال تھے اور اس شادی کی شکست کے پورے ذمہ دار علامہ کو سمجھتے تھے اس لیے روز بروز ان کے اور علامہ کے درمیان تعلقات خراب ہوتے گئے۔'' (۲۱۸)

کریم بی بی سے کشیدگی کی ایک وجہ مالی حیثیت کا کم ہونا بھی تھا۔ جب اقبال سے کریم بی بی کی شادی ہوئی تو اقبال ابھی طالب علم ہی تھے۔ اور مالی اعتبار سے بڑے بھائی اور باپ کے دست نگر تھے۔ کریم بی کا تعلق ایک امیر گھرانے سے تھا۔ وہ ایک متوسط الحال خاندان کے چھوٹے سے مکاں میں خوش نہیں رہ سکتی تھی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کریم بی بی کی خاندانی شہرت کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

''ان کے والد ڈاکٹر عطا محمد نے اس زمانے میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے اولین سند یافتہ طلبہ میں سے تھے۔ بعد میں سرکاری ملازمت اختیار کی اور ترقی کرتے کرتے بلند

عہدوں پر جا پہنچے۔ جدے میں حکومت برطانیہ کی طرف سے وائس قونصل رہ
چکے تھے۔ ۱۸۷۹ء میں انہیں خاں بہادر کا خطاب ملا۔ پنجاب کے مختلف
اضلاع میں سول سرجن تعینات رہے اور جہاں کہیں بھی رہے بڑی شان
وشوکت سے رہے۔'' (۲۱۹)

گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم مکمل کی تو اقبال نے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے لیے ملازمت اختیار کرلی۔ مگر پھر بھی کریم بی علامہ کے ساتھ لاہور میں رہنے کے لیے آمادہ نہ ہوئی کیونکہ اقبال کو تنخواہ بہتر روپے اور چودہ آنے ماہوار تھی۔ اس زمانے میں شیخ نور محمد اور اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے کریم بی اور اقبال کو قریب لانے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کی ذہنی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے ان کا ایک خط جو محررہ ۱۹ اپریل ۱۹۰۹ء کو عطیہ فیضی کو لکھا گیا شامل عنوان کیا ہے:

''میں کوئی ملازمت نہیں کرنا چاہتا میری خواہش یہ ہے کہ جلد سے
جلد اس ملک سے بھاگ جاؤں اس کی وجہ آپ کو معلوم ہے میں اپنے بھائی
کا قسم کا اخلاقی قرضدار ہوں اور صرف اسی چیز نے مجھے روک رکھا ہے میری
زندگی نہایت مصیبت ناک ہے۔ یہ لوگ میری بیوی کو زبردستی مجھ پر منڈھ
دینا چاہتے ہیں میں نے اپنے والد کو لکھ دیا ہے کہ انہیں میری شادی کر دینے
کا کوئی حق نہ تھا بالخصوص جب کہ میں نے اس قسم کے تعلق میں پڑنے سے
انکار کر دیا تھا۔ میں اس کی کفالت کرنے پر آمادہ ہوں لیکن اسے اپنے پاس
رکھ کر اپنی زندگی کو عذاب بنانے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔۔۔۔'' (۲۲۰)

آخری عمر تک علامہ اقبال بذریعہ منی آرڈر معقول رقم کریم بی کو بھجواتے رہے۔ دانائے راز میں سید نذیر نیازی اس شادی کی ناکامی کی وجہ بتاتے ہیں:

''محمد اقبال کی اس شادی کے بارے میں طرح طرح کی افسانہ
طرازیاں کی گئیں۔ جو سب کی سب غلط ہیں بیشک یہ شادی ناکام رہی لیکن
اس کی وجہ ایک ہی تھی اور وہ طبائع کی عدم مناسبت علیٰ ہذا خاندانی حالات

میں تفاوت میں سمجھتا ہوں رشتہ عجلت میں طے ہوا۔ طرفین نے اس معاملے میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ محمد اقبال نے لاکھ کوشش کی کہ نباہ کی کوئی صورت نکل آئے مگر بات نہ بنی۔ ایک تو والدہ آفتاب کا انداز طبیعت دوسرے اقبال کی روش حالات بگڑتے چلے گئے۔" (۲۲۱)

آفتاب اقبال کا رویہ بیان کرتے ہوئے دانائے راز میں مزید سید نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں:

"آفتاب اقبال بھی بہک گئے۔ باپ کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ الزام تراشیوں سے کام لیا گیا" (۲۲۲))

ڈاکٹر تقی عابدی نے آفتاب اقبال کی ان مالی مشکلات کا بھی ذکر کیا ہے جوان کو قیام انگلستان کے درمیان درپے ہوئیں۔ علامہ اقبال ہی کی نسبت سے سر اکبر حیدری نے آفتاب اقبال کی مالی اعانت کی قیام انگلستان کے دوران یونیورسٹی کی امتحانی فیس ادا نہ ہونے کی وجہ سے ان کو ڈگری نہ ملی تھی۔ چنانچہ اکبر حیدری نے ایک سو نوے پونڈ کا قرض دلوایا۔ بعد میں مہاراجہ کشن پرشاد نے اس قرض کو عطیہ میں تبدیل کر دیا۔ سر اکبر حیدری نے ایک سفارشی خط کے ذریعے فخر یار جنگ کو ۱۹۳۱ء میں خط لکھا کہ جامعہ عثمانیہ میں آفتاب اقبال کو ملازمت دے دی جائے لیکن کوئی مناسب جگہ خالی نہ تھی۔ انگلستان سے واپسی پر آفتاب اقبال نے سر اکبر حیدری کو ایک خط میں علامہ اقبال کی عدم التفات اور جائیداد سے محرومی کا شکوہ کیا۔ چنانچہ اکبر حیدری نے آفتاب اقبال کی حمایت میں علامہ اقبال کو ۱۱ اپریل ۱۹۳۱ء کو ایک خط لکھا

"اگرچہ مجھے آفتاب پر آپ کی خفگی کی وجہ معلوم نہیں لیکن میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ آپ اس کی بحالی پر غور کریں۔"

اقبال کی زندگی میں ہی آفتاب اقبال کے ساتھ قطع تعلقی ہو چکی تھی۔ زندہ رود میں جسٹس جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

"اقبال کی اس شادی کی ناکامی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان کے دونوں بچے شفقت پدری سے محروم رہ گئے۔ ایسی صورت مس بچوں کی ہمدردیاں عموماً ماں کے ساتھ ہوتی ہیں معراج بیگم اور آفتاب اقبال کے بچپن

اور جوانی کا بیشتر زمانہ ماں کے ساتھ ننھیال میں گزرا جب دونوں کچھ بڑے ہو گئے تو دادا اور دادی کے پاس سیالکوٹ میں رہنے لگے۔ باپ کے ساتھ تو ان کی ملاقات شاذ و نادر ہی ہوتی تھی۔'' (۲۲۳)

آفتاب اقبال باپ سے زیادہ خوش نہ تھے لیکن شیخ نور محمد سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے اور اپنے دادا کے منظور نظر بھی تھے۔ دادا نے ہی ان کا نام رکھا جاوید اقبال مزید تحریر کرتے ہیں:

''لیکن شفقت پدری کی عدم موجودگی میں اپنے تایا جی کی سخت طبیعت کو انہوں نے کبھی قبول نہ کیا جوں جوں وقت گزرتا گیا آفتاب اقبال کے دِل میں یہ بات ہمیشہ کے لیے بیٹھ گئی کہ ان کی ماں کے ساتھ باپ نے ناانصافی کی ہے نتیجتاً باپ بیٹے کے اختلافات بڑھتے چلے گئے۔ اقبال کے بعض احباب کی کوششوں کے باوجود ان کی آپس کی غلط فہمیاں دور نہ ہو سکیں۔ تا آنکہ اقبال کی زندگی میں باپ بیٹے میں قطع تعلقی ہو گئی۔'' (۲۲۴)

سر اکبر حیدری نے آفتاب اقبال کے متعلق اقبال کو جو خط لکھا اقبال نے ۲ مئی ۱۹۳۱ء کو اکبر حیدری کو جواب میں لکھا:

''یہ قصہ طوالانی اور اس کا بیان اذیت ناک ہے دراصل میں دہلی میں آپ سے ملاقات کرنے سے بھی اس لیے کترایا کہ میں نے سوچا وہ ہماری گفتگو کا موضوع بن سکتا ہے۔ اور اس سے کچھ دیر کے لیے میرا ذہنی سکون برباد ہو گا میں پہلے ہی اپنی بساط سے زیادہ مدد کر چکا ہوں اس طرز عمل کے باوجود وہ میرے ساتھ اور خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ جو کرتا رہا ہے کوئی باپ تحمل کے ساتھ وہ شرارت آمیز خطوط نہیں پڑھ سکتا۔ جو اس نے مجھے لکھے ہیں اب جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ صرف بلیک میلنگ کے منصوبے کا ایک حصّہ ہے۔ جو کچھ وہ عرصے سے کرتا آ رہا ہے بہر حال یہ میرے لیے ممکن نہیں کہ میں اس کی مدد کر سکوں۔ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں جس کی صحت بھی ڈانوڈول رہتی ہے۔ کسی طرف سے کوئی امید نہیں دو چھوٹے بچے

ہیں جن کی پرورش کرتا ہے۔ اگر میں کوئی مالدار آدمی ہوتا تو شاید اس کی کچھ اور مدد کر دیتا اگر وہ اس کا مستحق نہیں میں سمجھتا ہوں میرے حالات کے بارے میں آپ کو کچھ علم نہیں۔ فطرت نے مجھ کو کچھ چیزیں دی ہیں اور کچھ نہیں دیں میں پوری طرح قانع ہوں اور میرے لبوں پر کبھی حرف شکایت نہیں آیا۔ شاید آپ پہلے آدمی ہیں جسے میں نے یہ باتیں لکھی ہیں۔ میں جانتا ہوں آپ نے اس کی مدد کی ہے کچھ اس لیے کہ میں نے آپ کو بہت متاثر کیا ہے اور کچھ میرے تعلق سے آپ کو فیاض فطرت اس کے سوا اور کچھ نہ کر سکتی تھی مگر مجھے یقین ہے آپ کا اس پر اور مجھ پر بڑا کرم ہوتا اگر اس کو کوئی موزوں ملازمت جامعہ عثمانیہ میں دلا سکتے۔" (۲۲۵)

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال اپنے بیٹے کے ہاتھوں بلیک میل بھی ہوئے۔ یہاں چند شرارت آمیز خطوط کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ لیکن یہ خطوط کس نوعیت کے تھے اس کا ذکر اقبال نے نہیں کیا۔ سر اکبر حیدری نے آفتاب اقبال کو جامعہ عثمانیہ میں موزوں جگہ دلوانے کی بھرپور کوشش کی مگر ملازمت نہ دلوا سکے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے علامہ اقبال کے اس خط کو بھی شامل کیا ہے۔ جو ۱۶ مئی ۱۹۳۱ء کو لکھا جس میں سر اکبر حیدری کو واضح کیا کہ وہ نوجوان پر کس قدر خرچ کر چکے ہیں:

"یہ نوجوان اب تک ستر ہزار روپے اپنے اوپر خرچ کر چکا ہے اس میں سے خود اپنے بقول اس نے ۵۰ ہزار روپے انگلستان میں قرض لیے ہیں میں نے اس کی ماں کو دس ہزار روپے دیئے تھے جو اس نے سب کے سب اس پر خرچ کر دیئے اور یہ رقم بھی اس کے علاوہ ہے جو اس نے اور اس کے باپ نے اس لڑکے کو دیئے۔ اس کی انگلستان سے واپسی کے صرف ایک دو ماہ قبل مجھے ایک ہزار روپے دینے پر مجبور کیا گیا اس کے باوجود وہ اکثر و بیشتر بلیک میلنگ پر مبنی خطوط بھیجتا رہتا ہے میں اس کے تازہ ترین خط کی نقل آپ کو ارسال کرنا چاہتا تھا مگر میں ایسا نہیں کرتا بالخصوص اس واسطے کے میں نے

سوچا اس کے بعد آپ اس کے ساتھ ہمدردی کرنا ترک فرمادیں گے فارسی کا یہ شعر میری موجودہ کیفیت ذہنی کے مطابق ہے۔

آن جگر گوشہ ہماں کہ من اول گفتم

کہ چوشویدلیش از شیر جگر خوارہ شود (۲۲۶)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے اس مضمون کا اختتام آفتاب اقبال کا رویہ اقبال کی وفات کے بعد کرتے ہوئے کیا ہے۔ آفتاب اقبال علامہ کی وفات کے ۲۰ سال بعد تک زندہ رہے لیکن بعد میں وہ ہمیشہ اپنے والد کی تعریف کرتے رہتے۔ اور اپنے والد کے محاسن پر گفتگو کرتے تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں

''جن افراد نے کراچی کے یوم اقبال کے جلسات میں شرکت کی ہے وہ جانتے ہیں کہ آفتاب اقبال ہر سال ان جلسات میں دلنشیں اور فلسفیانہ تقریر کرتے اور علامہ کے کلام پر تبصرے کرتے تھے۔'' (۲۲۷)

کیا داغ دہلوی کے علاوہ علامہ کسی اور کے شاگرد رہے:

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے عرفانی زاویے میں اقبال کے اساتذہ کے متعلق اک سوال اٹھایا ہے کہ اقبال نے فن شاعری میں کن کن اساتذہ سے کسب فیض حاصل کیا۔ وہ اپنے اشعار کی نوک پلک سنوارنے کے لیے جن جن اساتذہ کے شاگرد ہوئے ان میں کون سی شخصیات شامل ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے یہاں صرف داغ دہلوی کا ذکر کیا ہے کہ اقبال نے اپنے کلام میں اصلاح کے لیے صرف داغ دہلوی سے استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

''اقبال کے طالب علم اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ علامہ نے اپنی فکر اور علم کی وسعت کے لیے اپنے اشعار کی نوک پلک سنوارنے اپنی زبان کی صحت اور فن شاعری کی باریکیوں سے واقف ہونے کے واسطے اس زمانے منتخب چند عالموں سے فیض حاصل کیا لیکن سوائے داغ دہلوی کسی اور کو اپنا استاد نامزد نہیں کیا۔'' (۲۲۸)

اقبال جن دنوں گورنمنٹ کالج میں تھے تو اپنی پہلی غزل اسی مشاعرے میں پڑھی لیکن اقبال شعروشاعری کا آغاز زمانہ سیالکوٹ میں کر چکے تھے۔ اوراسی زمانے میں اقبال نے داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ شعر اقبال میں سید عابد علی عابد تحریر کرتے ہیں:

"ارشد گورگانی اور ناظم لکھنوی کے حلقہ سخن میں بیٹھ کر انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ جو شعری تربیت میں نے حاصل کی ہے اس کی تکمیل ضروری ہے غالباً یہی بات مدنظر رکھ کر وہ داغ کے شاگرد ہوئے کہ ان دنوں اردو زبان کی باریکیوں کو سمجھنے والا داغ سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔" (۲۲۹)

اپنی واردات و کیفیات کو تغزل کے روپ ڈھالتے ہوئے دیکھ کر اقبال نے محسوس کیا کہ ان کو کسی ایسے استاد کی ضرورت ہے جو اردو محاورے سے واقف ہو بلکہ اردو کی شعری روایت کے تمام رموز سے بھی آگاہ ہو اور ایسا شخص اس زمانے میں ایک ہی تھا اور وہ داغ تھا۔ سید عابد علی عابد تحریر کرتے ہیں:

"صداقت احساس کی اور شعور تخلیق کی اس صفت نے غالباً اقبال کو زیادہ متاثر کیا ہوگا۔ بہر حال وہ داغ کے شاگرد ہوئے داغ نے انہیں شعری روایات کے رموز واسرار سے آگاہ کیا۔ اقبال نے داغ کا مرثیہ لکھا ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کی وہ استاد کی کن صفات سے زیادہ متاثر تھے۔" (۲۳۰)

اقبال چاہتے تھے کہ اُردو کی شعری روایت بالخصوص تغزل کی شعری روایت کو ہر قسم کے سیاسی قومی اور فلسفیانہ افکار کو واضح کرنے کے لیے استفادہ کریں۔ اقبال نے داغ کے کلام کی وہ تمام رموز سیکھے جوان کو اپنے کلام کے لیے موزوں معلوم ہوئیں۔ ذکر اقبال میں عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں:

"اقبال کی طالب علمی کے زمانے میں سیالکوٹ میں بھی ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوا کرتا تھا اس کے لیے اقبال نے کبھی کبھی غزل لکھنی شروع کر دی۔ اس زمانے میں اقبال نے خط و کتابت کے ذریعے فصیح الملک مرزا داغ سے چند غزلوں میں اصلاح لی اور اس طرح اقبال کو اردو زبان دانی کے لیے بھی ایسے استاد سے نسبت پیدا ہوئی جو اپنے وقت میں زبان کی خوبی کے لحاظ

سے فن غزل میں یکتا سمجھا جاتا تھا۔ جناب داغ نے جلد ہی کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے اور یہ تلمذ کا سلسلہ بہت دیر تک قائم نہیں رہا۔" (۲۳۱)

اردو شاعری میں اقبال کا نام بلند پایہ حیثیت رکھتا تھا اقبال کو اس غائبانہ تعلق پر ساری زندگی فخر رہا اور داغ مرحوم کو بھی اس بات پر فخر حاصل تھا کہ اقبال ان لوگوں میں شامل ہیں جن کے کلام کی انہوں نے اصلاح کی داغ ایک ایسا استاد تھا جس کی واردات تو ادنی درجے کی تھی لیکن ابلاغ واظہار میں داغ نے صنعت گری کے کمال کا ثبوت دیا ہے۔ سید عابد علی عابد تحریر کرتے ہیں:

"کبھی رمز و ایما سے کبھی اشارے اور کنائے سے کبھی مترادف الفاظ کے استعمال سے بہر حال کسی نہ کسی طرح وہ اپنے مفہوم کے اہم ترین اور نازک ترین پہلو سننے والے کے ذہن تک منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔" (۱۳۲)

اقبال نے مرزا داغ سے وہ تمام راز سیکھ لیے جو لفظ و معنی کے نازک رشتے کے لیے ضروری ہوتے ہیں اقبال کے شعر و سخن میں استاد تو صرف داغ دہلوی تھے۔ لیکن اقبال نے اپنی شاعری میں اصلاح کے لیے داغ کے ہم عصر شعراء سے بھی استفادہ کیا۔ امیر مینائی کا کلام اقبال نے غور سے پڑھا تا کہ زبان اور محاورے کی باریکیوں سے آگاہ ہو سکیں اس سلسلے میں سید عابد علی عابد تحریر کرتے ہیں:

"اگر چہ اقبال کے لیے داغ کا شعر اور اس کی زبان سند ہے۔ لیکن معترض کو چپ کرنے کے لیے اقبال اپنے استاد کے کلام کے علاوہ اس کے دبستان کے دوسرے اشعرا اور امیر مینائی کے کلام سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ پھر یہ کہ اعتراضات کا جواب دیتے ہیں تو پڑھنے والے پر یہ بات بخوبی روشن ہوتی ہے۔ کہ اقبال کو معانی بیان بدیع محسنات شعر صرف ونحو اردو روزمرہ محاورہ ان سب چیزوں پر قدرت حاصل تھی۔" (۲۳۳)

سید عابد علی عابد نے ایک اور جگہ میر داغ کے ساتھ امیر مینائی کا ذکر کیا ہے۔

"اب اقبال کے نثری اقتباسات ملاحظہ فرمائیے جس سے ثابت ہوگا

کہ انہیں استاد سے کتنی عقیدت ہے داغ اور امیر کے کلام کے مطالعے سے انہوں نے کیا کچھ سیکھا ہے۔" (۲۳۷)

ڈاکٹر تقی عابدی نے شعر اقبال کے حوالے سے لکھا ہے کہ اقبال نے مرزا داغ کے علاوہ ارشد گورگانی کا بھی ذکر کیا ہے:

"شعر اقبال" میں عابد علی عابد نے لکھا ہے کہ اقبال نے ارشد گورگانی کو اپنا ابتدائی کلام دکھایا ہے لیکن دوسرے محققین نے اس بات کی تصدیق نہیں کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہزادہ ارشد گورگانی اقبال کے مداح تھے۔ چنانچہ لاہور کے ایک مشاعرے میں جب اقبال نے یہ خوبصورت شعر پڑھا

موتی سمجھ کر شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

تو آپ تعریف کر کے کہنے لگے اقبال! اس عمر میں یہ شعر!! " (۲۳۴)

زندہ رود میں جسٹس جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

"۱۹۰۹ء میں فوق نے اقبال کے جو مختصر حالات زندگی تحریر کیے ہیں ان میں درج ہے کہ اقبال نے ایف اے کی طالب علمی کے دنوں میں داغ سے اصلاح لینی شروع کی۔ سری رام نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ اقبال نے ابتداء میں چند غزلیں مرزا ارشد گورگانی کو دکھائیں اور پھر داغ سے بذریعہ خط و کتابت تلمذ اختیار کیا۔ مگر یہ درست نہیں کیونکہ ارشد گورگانی سے اقبال کی پہلی ملاقات بھاٹی دروازہ لاہور کے ایک مشاعرہ میں 1895ء کے بعد ہوئی۔" (۲۳۵)

ارشد گورگانی کے علاوہ ڈاکٹر تقی عابدی نے حبیب الرحمان شیروانی کا بھی ذکر کیا ہے۔ کیونکہ ان کے نام اقبال نے تین خط لکھے ہیں اور شیروانی صاحب نے کچھ اشعار پر داد دی تھی ثبوت کے طور پر ڈاکٹر تقی عابدی نے ایک خط پیش کیا ہے۔

"آج مجھے اپنے ٹوٹے پھوٹے اشعار کی داد مل گئی۔ بعض جگہ جو تنقید

آپ نے فرمائی ہے بالکل درست ہے بالخصوص لفظ ''چبھ'' کے متعلق مجھے
آپ سے کلی اتفاق ہے کیوں کہ یہ بات میرے خیال میں مطلق نہ تھی۔ آپ
لوگ نہ ہوں تو ہم شعر کہنا ہی ترک کر دیں۔''

اسی طرح کا ایک اور خط بھی ڈاکٹر تقی عابدی نے شیروانی صاحب کے نام نقل کیا ہے۔ جو مئی ۱۹۰۳ء کو لکھا گیا ہے۔

''آپ کا خط حفاظت سے صندوق میں بند کر دیا ہے۔ نظر ثانی کے و
قت آپ کی تنقیدوں سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ اگر میری ہر نظم کے متعلق آپ
اس قسم کا خط لکھ دیا کریں تو آپ کا نہایت ممنون ہوں گا۔'' (۲۳۶)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اکبر الہ آبادی، خواجہ حسن نظامی، مولانا سلیمان ندوی اور غلام قادر گرامی کا بھی ذکر کیا ہے۔ کہ اقبال نے ان سے استفادہ ضرور کیا ہے مگر کسی کو اپنا استاد سخن نہیں کیا۔ ان لوگوں کی عزت و احترام اپنی جگہ تھی۔ ان ہستیوں میں اکبر الہ آبادی سے اقبال کے تعلقات بہت ہی دوستانہ تھے۔ یہاں تقی عابدی نے اکبر الہ آبادی کے اقبال کے نام خطوط کا ذکر کیا ہے۔ جو اقبال کے پاس موجود تھے۔ لیکن کسی وجہ سے شائع نہ ہو سکے۔ اکبر الہ آبادی کے پانچ خطوط جو اقبال کے نام ہیں ان میں سے دو خط ''اقبال نامہ'' اور تین خطوط اقبال کے انتقال کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلّہ ''راوی'' کے خصوصی اقبال نمبر میں شائع ہوئے تھے۔ اقبال ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو اکبر الہ آبادی کے نام تحریر کرتے ہیں:

''آپ کے خطوط سے مجھے نہایت فائدہ ہوتا ہے اور مزید غور و فکر کی راہ
کھلتی ہے اسی واسطے میں ان خطوط کو محفوظ رکھتا ہوں کہ یہ تحریریں نہایت پیش
قیمت ہیں اور بہت لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔'' (۲۳۷)

بانگ درا کے دیباچے میں بھی اقبال کے متعلق سر عبد القادر نے لکھا ہے کہ وہ داغ کے شاگرد رہے کیونکہ شعرائے اردو میں ان دنوں نواب میرزا خاں صاحب داغ دہلی کا بہت شہرہ تھا۔ اور نظام دکن کے استاد ہونے سے ان کی شہرت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ لوگ ان کے پاس جا نہیں سکتے تھے۔ خط و کتابت کے ذریعہ دور ہی سے ان سے شاگردی کی نسبت پیدا کرتے تھے۔ غزلیں ڈاک میں ان

کے پاس جاتی تھی اور وہ اصلاح کے بعد واپس بھیجتے تھے جسٹس جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

"اس تحریر سے ظاہر ہے کہ اقبال نویں یا دسویں جماعت سے باقاعدہ غزلیں لکھنے لگے تھے اور مشاعرہ میں شریک بھی ہوتے تھے۔ داغ کا شہرہ سن کر ان کو خط لکھا کچھ غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں اور یوں ایف اے کے سال اول میں ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ اقبال کی لاہور آمد تک یا بقول فوق قیام لاہور کے ابتدائی ایام تک وہ گاہے بگاہے خط و کتابت کے ذریعہ کلام پر اصلاح لیتے رہے۔ اقبال کی داغ کے ساتھ بالمشافہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔" (۲۳۸)

داغ سے اقبال کی ملاقات کبھی نہ ہوئی صرف خط و کتابت کے ذریعے ہی یہ سلسلہ جاری رہا۔

یہی ہے جو شوق ملاقات حضرت
تو دیکھیں گے اک بار ملک دکن بھی

اسی طرح اقبال ۲۰ اپریل ۱۹۱۹ء میں اکبر کو لکھتے ہیں:

"چند روز ہوئے ایک مصرع ذہن میں آیا تھا دوسرا مصرع نہیں ہو سکا۔ این سر خلیل است با آزر نتوان گفت غور فرمائیے کچھ ذہن میں آئے تو مطلع کیجیے۔" (۲۳۹)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے اس مضمون میں اکبر الہ آبادی کی بے شمار خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ اکبر الہ آبادی کے علاوہ ڈاکٹر تقی عابدی نے خواجہ حسن نظامی کا بھی ذکر کیا ہے۔ کہ اقبال انگلستان کے قیام کے دوران خواجہ حسن نظامی کی نثر نگاری اور صحت زبان پر بہت اعتماد کا اظہار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ خود حسن نظامی کا قول ہے کہ اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی کا نام خود خواجہ حسن نظامی نے تجویز کیا تھا۔ جب کہ زندہ رود میں جسٹس جاوید اقبال نے اقبال کا ۱۹۱۰ء کا بیان نقل کیا ہے۔

"میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ہیگل گوئٹے میرزا غالب عبدالقادر بیدل اور ورڈز ورتھ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ ہیگل اور گوئٹے نے اشیاء کی باطنی معنویت تک پہنچنے میں میری رہنمائی کی۔ بیدل اور غالب

نے مجھے سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبہ اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں اور ورڈ زورتھ نے طالب علمی کے زمانے میں مجھے دہریت سے بچالیا۔" (۲۴۰)

معلم اقبال شمس العلماء مولوی میر حسن

ڈاکٹر تقی عابدی نے معلم اقبال مولوی میر حسن کو بھی اپنی کتاب عرفانی زاویے کا حصہ بنایا ہے۔ مولوی میر حسن اقبال کے بہت شفیق استاد تھے۔ اقبال سے مولوی میر حسن کی ملاقات کے متعلق عبدالمجید سالک ذکر اقبال میں لکھتے ہیں:

> "چونکہ علامہ اقبال کے والد محترم اکثر مولانا غلام حسن کے ہاں معارف دین کی سماعت کے لیے جایا کرتے تھے۔ اور ان کا رجحان بھی زیادہ تر یہی تھا کہ اپنے بچے کو صرف دینی تعلیم دلوائیں اس لیے انہوں نے اقبال کو مولانا ہی کے ہاں پڑھنے بٹھا دیا۔ مولانا سید میر حسن بھی اکثر مولانا غلام حسن کے ہاں جایا کرتے تھے۔" (۲۴۱)

یاں ہی سے اقبال کی قسمت کا ستارہ جگمگانا شروع ہوا جب مولوی میر حسن نے اقبال کے اندر چھپے ہوئے گہر کو پہچان لیا۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

> "چنانچہ جس روز اقبال چار سال چار ماہ کی عمر کو پہنچے شیخ نور محمد انہیں مسجد میں مولانا غلام حسن کے پاس لے گئے۔ اقبال نے اسی مسجد میں درس قرآن سے تعلیم کی ابتداء کی۔۔ ایک دن مولانا سید میر حسن درسِ گاہ میں آئے اور اقبال کو وہاں درس لیتے دیکھا۔ وہ ان کی کشادہ پیشانی متین صورت اور بھورے بالوں سے بے حد متاثر ہوئے۔" (۲۴۲)

جب مولوی میر حسن کو معلوم ہوا کہ یہ شیخ نور محمد کا بیٹا ہے اور گھر جا کر ان کو سمجھایا کہ اس بچے کو مخصوص دینی تعلیم دلوانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اسے جدید تعلیم سے آراستہ کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا اسے درس گاہ سے اٹھوا کر ان کی تحویل میں دے دیا جائے۔ یہاں سے اقبال نے میر حسام الدین کے سید

میر حسن کے مکتب میں اردو فارسی اور عربی ادب پڑھنا شروع کیا دانائے راز میں سید نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں:

"میر حسن کے درس میں آئے تو کہنے کو ان کی تعلیم عربی فارسی سے شروع ہوئی۔ درحقیقت اسلام اور اسلامی علوم و معارف کی تحصیل سے۔ جس میں میر حسن کی رہنمائی جیسے انہیں ماضی کی طرف لے گئی اسی دعوت کے خدوخال اُبھرنے لگے جس نے نوع انسانی کا رُخ اس کی تقدیر اور مستقبل کی طرف پھیر دیا۔" (۲۴۳)

دانائے راز میں سید نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں:

"ایک روز ان کے گھر کا سودا لینے جا رہے تھے میر حسن نے دیکھ لیا۔ روک کر کہنے لگے میں نے تمہیں بارہا کہا ہے تم میرے شاگرد ہو نوکر نہیں ہو۔ یہ سودا کیوں لیے جا رہے ہو۔ محمد اقبال نے برجستہ جواب دیا۔ میں آپ کا شاگرد و نوکر ہوں۔" (۲۴۴)

جب اقبال مولوی میر حسن کی معیت میں چلے گئے تو ایک ایسا تعلق پیدا ہو گیا جو مدت العمر قائم رہا۔ اقبال بہت ہی ذہین اور ہونہار تھے۔ اس لیے سید میر حسن نے ان کو پوری توجہ کے ساتھ پڑھانا شروع کر دیا۔ اب اقبال کی اگلی منزل اسکاچ مشن ہائی سکول تھا اقبال سکول کے بعد سید میر حسن کے گھر میں بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ مولوی میر حسن اگر گھر سے باہر سودا سلف لینے جاتے تو اقبال ان کے پیچھے پیچھے رہتے تھے۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر فرماتے ہیں:

"اقبال کی ابتدائی طالبانہ زندگی پر سید میر حسن کی شخصیت حاوی ہے سید میر حسن ایک روشن فکر اہل علم تھے جو مصالح دین اور مصالح دنیا کو ایک ساتھ پیش نظر رکھ کر شاگردوں کی تربیت کرتے تھے وہ نہ صرف علوم اسلامی اور عرفانی و تصوف سے آگاہ تھے بلکہ علوم جدید ادبیات، لسانیات اور ریاضیات کے بھی ماہر تھے۔ ان کے پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ اپنے شاگردوں میں اُردو فارسی اور عربی کا صحیح لسانی ذوق پیدا کر دیتے۔" (۲۴۵)

شمس العلماء مولوی میر حسن کا تاریخی نام رونق بخش تھا ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے دانائے راز میں سید نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں:

”اپنے ننھیال فیروز والہ ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے سید محمد شاہ طیب کے بیٹے تھے کم سنی ہی میں باپ کے زیر تربیت قرآن مجید حفظ کیا۔۔۔ علم وفضل کی دولت خداداد تھی۔۔۔ مسجد سے مشن سکول کا رُخ کیا۔ ۱۶ برس کی عمر تھی۔ ملازم ہو گئے۔ چھوٹی جماعتوں کو پڑھانے لگے۔“(۲۴۶)

ان کے اندر اس قدر قابلیت تھی کہ جلد ہی پروفیسری کے درجے تک پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ مرے کالج تعمیر ہوا تو اس میں ایک ہال میر حسن ہال کے نام سے تعمیر کیا گیا۔

مولوی میر حسن کو بیسوں شعر زبانی یاد ہوتے تھے وہ حافظ قرآن تھے اور قرآن مجید سے بیحد لگاؤ تھا۔ انہیں ان کے شاگرد شاہ صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ دن بھر اسکول میں پڑھاتے تھے اور شام کو گھر پر بھی تدریس کا یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ تمام عمر اسکاچ مشن سکول سے وابستہ رہے۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

”سید میر حسن نے اقبال کو عربی فارسی اور اُردو ادبیات علم وحکمت تصوف وغیرہ کی تعلیم دے کر ان کے دل میں علوم تدعیہ اور اسلامیہ کے لیے شغفتگی پیدا کر دی تھی۔ اقبال کی اپنی طبیعت کی سادگی قناعت استغنا ظرافت اور نکتہ سنجی سب کچھ میر حسن کے مزاج کا عکس تھیں۔“ (۲۴۷)

اقبال مولوی حسن کے پاس خود کو بہت بے فکر اور مطمئن محسوس کرتے تھے اقبال ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اور ان کے سامنے شعر سنانے کی کبھی جرأت نہیں کرتے تھے اقبال ۱۹۰۵ء میں جب یورپ کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو دہلی میں جو نظم التجائے مسافر کے نام سے خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر پڑھی تھی اس میں سید مولوی میر حسن کے متعلق جو اشعار تھے وہ یوں ہیں:

وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمین
کرے پھر اس کی زیارت سے شاد ماں مجھ کو (۲۴۸)

زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے علامہ اقبال اور مولوی حسن کے ذہنی روابط کے متعلق ایک واقعہ تحریر کیا ہے جو اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ اقبال اپنے استاد کو بہت محترم گردانتے تھے۔

''اقبال کو ۱۹۲۳ء میں ''سر'' کے خطاب کی پیش کش کی گئی تو انہوں نے گورنر پنجاب سے کہا کہ جب تک ان کے استاد میر حسن کی علمی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے وہ خطاب قبول نہ کریں گے۔ گورنر نے پوچھا کہ کیا سید میر حسن کی کوئی تصانیف ہے تو اقبال نے جواب دیا میں خود ان کی زندہ تصنیف ہوں'' (۲۴۹)

یوں مولوی میر حسن کو بھی شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔ ایک اور جگہ پر اقبال نے سید میر حسن کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

اقبال جب بھی اپنے شفیق استاد کا ذکر کرتے تو ان کی آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں۔ اقبال کا کہنا تھا کہ اگر اسوہ رسولؐ پر صحیح معنوں میں اگر کسی شخص کا عمل ہے تو وہ مولوی سید میر حسن ہیں سید وحید الدین روزگارِ فقیر میں تحریر کرتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب اپنے استاد کا جس قدر احترام کرتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ انہیں مولوی صاحب کو اپنا کلام سنانے کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی۔ ایک دفعہ کہنے لگے زندگی بھر میں ان کے سامنے صرف ایک مرتبہ میری زبان سے ایک مصرع نکل گیا وہ بھی اتفاقی طور پر مولوی صاحب کسی کام کے لیے گھر سے نکلے ایک بچہ جو ان کے عزیزوں

میں تھا اور جس کا نام احسان تھا ان کے ساتھ تھا۔ مولوی صاحب کہنے لگے اسے گود میں اٹھالو میں نے اسے گود میں اٹھالیا کچھ دور جانے کے بعد میں تھک گیا۔ چنانچہ میں نے بچے کو ایک دکان کے تختوں پر کھڑا کر دیا اور خود ستانے لگا۔ مولوی صاحب اتنے میں بہت آگے نکل گئے تھے ہمیں اپنے ساتھ نہ پایا تو الٹے پاؤں لوٹے اور میرے قریب آ کے فرمایا اقبال! اس کی برداشت بھی دشواری ہے تو میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ ''تیرا احسان بہت بھاری ہے'' (۲۵۰)

روزگار فقیر میں ہی سید وحید الدین نے مولوی میر حسن کے روزانہ قبرستان جانے کی وجہ بیان کرتے ہوئے ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔ کہ مولوی میر حسن کی بہن کا انتقال ہو گیا تھا۔ مولوی میر حسن کو اپنی کمسن بہن سے بے حد لگاؤ تھا۔ مرنے سے قبل چھوٹی بہن سے وعدہ کیا تھا کہ میں آپ سے روز ملنے آیا کروں گا۔ جس طرح آپ کے زندہ ہوتے ہوئے آپ سے ملتا ہوں۔ اس دن کے بعد عالم ضعیفی تک مولوی میر حسن کا یہ ہی معمول رہا کہ قبرستان ان کی قبر پر ضرور حاضری دیتے تھے عبدالمجید سالک ذکر اقبال میں تحریر کرتے ہیں:

> ''مولانا میر حسن کے فیض تربیت سے اقبال برابر بہرہ اندوز ہوتے رہے اور فاضل وشفیق استاد نے اس جوہر قابل کو علم وحکمت، شعروادب، فارسی وعربی زبان دانی اور فکر صحیح کے محاسن سے مالا مال کر دیا۔ علامہ اقبال بھی مولانا کے عزم واحترام میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔'' (۲۵۱)

محمد اقبال سے بڑھ کر شاید ہی کسی شاگرد نے استاد کی عزت کی ہو اور میر حسن سے بڑھ کر شاید ہی کسی استاد نے شاگرد کا خیال رکھا ہو دانائے راز میں سید نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں:

> ''محمد اقبال کے دِل میں استاد کے احترام کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ ان کے پیچھے پیچھے چلتے ایک روز گھر سے باہر کسی دکان پر بیٹھے تھے کہ میر حسن کو آتے دیکھا دیکھتے ہی تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے مگر جلدی میں جوتا نہ پہن سکے۔ اب ایک پاؤں پیر میں ہے اور دوسرا جہاں بیٹھے تھے وہیں۔ اسی

حالت میں گھر تک ساتھ گئے۔ واپس آکر دوسرا پیر پہنا لیکن اس تعظیم و تکریم ادب اور احترام کے باوجود استاد اور شاگرد میں کچھ ایسی مفاہمت تھی کہ بے تکلفی تک نوبت آجاتی۔" (۲۵۲)

میر حسن جیسے استاد اور اقبال جیسے شاگرد کی مثالیں ملنا بہت مشکل ہے۔ جہاں محمد اقبال آتے ہیں میر حسن کہتے ہیں اقبال دیر سے آئے ہو۔ اقبال بے ساختہ جواب دیتے ہیں اقبال دیر سے ہی آتا ہے میر حسن جی ہی جی میں خوش ہو کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ اقبال کے بہت ہی قریبی ساتھی سر راس مسعود بھی مولوی میر حسن کی وساطت سے ملے تھے۔ جو سر سید احمد خاں کے پوتے تھے۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

"اقبال کو سر سید اور علی گڑھ تحریک کا احساس سید میر حسن کی وساطت سے ہوا تھا۔ اسی نسبت کی بنا پر بعد میں جب اقبال کی ملاقات سر سید کے پوتے سر راس مسعود سے ہوئی تو ان کے گہرے دوست بن گئے اور ان سے والہانہ محبت کرنے لگے۔" (۲۵۳)

روایات اقبال میں ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی تحریر کرتے ہیں:

"ڈاکٹر صاحب کو گردے کا درد ہو جاتا تھا ایک مرتبہ دورہ لمبا ہو گیا ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپریشن کرائیے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک طرف تو آپریشن کی تیاری شروع کی اور دوسری طرف حالات میرے والد کو لکھ بھیجے۔ آپریشن سے کچھ دیر پہلے والد صاحب کا خط پہنچا کہ آپریشن نہ کراؤ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ کر لیا کہ اب قطعاً آپریشن نہ کراؤں گا۔ ماہر ڈاکٹر بہت کہتے رہے کہ استاد کے کہنے پر اپنی بیماری کا علاج نہ روکو لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہی جواب دیا کہ میں شاہ صاحب کے ارشاد کے خلاف کوئی کام نہ کروں گا۔" (۲۵۴)

میر حسن کے کہنے پر ہی سر سید کی محمد اقبال نے تاریخ وفات بھی کہی

"ما ارسلنک الا رحمتہ للعالمین"

روزگارفقیر میں سرسید کی تاریخ وفات کا مادہ نکالنے کے متعلق فقیر سید وحید الدین تحریر کرتے ہیں

"استاد اور شاگرد دونوں نے تاریخیں نکالیں۔ اور مادہ ہائے تاریخ کے انتخاب کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس کمیٹی نے مولوی میر حسن اور ڈاکٹر اقبال کی تاریخوں کو بہترین قرار دیا۔۔۔ سید میر حسن کی نکالی ہوئی تاریخ وفات غفرلہ ۱۹۱۵ھ (اس کی مغفرت کی گئی) ڈاکٹر صاحب نے قرآن پاک کی آیت سے تاریخ نکالی۔" (۲۵۵)

یہاں تک کہ جب سرسید احمد خان کی وفات ہوئی تو مولوی حسن اسکول جارہے تھے۔ ان کی ملاقات اقبال سے بھی ہوگئی سید میر حسن نے سرسید کی رحلت کی تاریخ نکالنے کے لیے اقبال کو ہی کہا تھا۔ تو اقبال نے یہ مادہ تاریخ نکال دیا۔

"انی متوفیک ورافعک اِلی مَطہرک" ۔ یہاں تک کہ جب اقبال کو ۱۹۲۸ء میں درد گردہ نے شدت اختیار کر لی تو ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ آپریشن کرنے میں بہت خطرہ ہے تو اس وقت بھی اقبال کو مولوی میر حسن کی یاد آئی اور ان سے مشورہ کرنے کا سوچا۔ اقبال نے مولوی میر حسن سے مشورہ کیا تو انہوں نے طبی علاج کروانے کا مشورہ دیا۔ مولوی میر حسن کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:

"۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو جب میر حسن کا انتقال ہوا تو شہر ماتم کدہ بن گیا ہندو سکھ اور عیسائی سب نوحہ کناں تھے۔ محمد اقبال سیالکوٹ روانہ ہوگئے ریل کا وقت گزر گیا تھا ایک مال گاڑی وزیر آباد جارہی تھی اسی میں بیٹھ گئے وزیر آباد سے سیالکوٹ پہنچے میر حسن کے عزاء اقربا شاگرد اور عقیدت مند منتظر تھے کہ محمد اقبال آئے باچشم نم آگے بڑھے۔ استاد کے چہرے کی آخری مرتبہ زیارت کی نہ معلوم اس وقت ان کے دِل پر کیا گزر رہی تھی۔" (۲۵۶)

مولانا گرامی اور علامہ اقبال

ڈاکٹر تقی عابدی نے مولانا گرامی کے حوالے سے دو مضمون اپنی کتاب اقبال کے عرفانی زاویے میں شامل کیے ہیں۔ جس میں ایک کا نام مولانا گرامی اور علامہ اقبال ہے اور دوسرے کا نام ''کیا مولانا گرامی علامہ اقبال کے استاد رہیں'' ہے اپنے پہلے مضمون مولانا گرامی اور اقبال میں ڈاکٹر تقی عابدی نے زیادہ زور مولانا گرامی کا تعارف کرانے میں دیا ہے۔ جب کہ اقبال کے ساتھ روابط کا تذکرہ کم کیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی مولانا گرامی کا تعارف کراتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> ''مولانا غلام قادر گرامی ۱۸۵۶ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۹۲۷ء کو ہوشیار پور کے قبرستان کندن شاہ بخاری میں دفن ہوئے۔ غلام قادر گرامی فارسی کے بڑے عالم اور مشہور شاعر تھے۔'' (۲۵۷)

اقبال مولانا گرامی کے بہت پرانے دوست تھے۔ یہ تعلقات ۱۹۰۲ء سے لے کر گرامی کی رحلت ۱۹۲۷ء تک برقرار رہے گرامی سے علامہ کی ملاقات انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں ہوئی تھی۔ ذکر اقبال میں عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں:

> ''۱۹۱۴ میں انجمن حمایت اسلام کا جو سالانہ اجلاس ہوا۔ اس میں علامہ اقبال مولانا گرامی اور نواب ذوالفقار علی خاں اکٹھے داخل اجلاس ہوئے۔ مولانا گرامی کا تعارف کراتے ہوئے علامہ نے فرمایا کہ گرامی اکابر شعرائے فارسی میں سے ہے آج گرامی کو سن لو۔ کل فخر کرو گے تم نے گرامی کو سنا ہے۔ مولانا نے اپنا کلام سنایا۔ اسی اجلاس میں علامہ اقبال نے اپنا فلسفہ خودی سادہ زبان اور سلیس انداز بیاں میں پیش کیا۔ اور مثنوی اسرار خودی کے چند اشعار بھی سنائے'' (۲۵۸)

اقبال نے مولانا گرامی کے نام تقریباً (۹۰) نوے خطوط لکھے جن میں معمولات زندگی کے ہر میدان کے متعلق گفتگو کی ہے۔ جن میں بے تکلفی، شوخی بہت نظر آتی ہے۔ مسائل خانگی، مقدمات دیوانی بیماری اور نجی گفتگو کے دائرے وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی مولانا گرامی کا مزید تعارف

ان الفاظ میں کرواتے ہیں:

''غلام قادر گرامی محلہ کی مسجد میں قرآن پڑھنے کے بعد خلیفہ ابراہیم کے مکتب میں شریک ہوئے۔ جہاں فارسی کے متبادل درسی کتابیں بوستان، گلستان اور سکندر نامہ پڑھیں۔'' (۲۵۹)

اقبال کے تعلقات غلام قادر گرامی سے ان دنوں سے تھے جب انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں اقبال نے اپنی ملی شاعری کی ابتداء کی تھی۔ یہ مخزن کے اجراء کے ایام تھے۔ گرامی عمر میں اقبال سے بڑے تھے پھر بھی دونوں میں بہت ہی بے تکلفانہ مراسم تھے۔ گرامی کو فارسی کلام میں ملکہ حاصل تھا اسی وجہ سے اقبال ان سے فارسی کلام کے سلسلے میں صلاح مشورہ کیا کرتے تھے۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''گرامی ہوشیار پور میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد جب بھی لاہور آتے تو اقبال کے ہاں قیام کرتے بعض اوقات اقبال گرامی کو ہوشیار پور سے لاہور لانے کے لیے علی بخش کو بھجواتے اور دنوں نہیں بلکہ ہفتوں ان کی مہمانداری کرتے ان سے دن رات علمی گفتگو ہوتی اشعار کی باریکیوں پر بحث کی جاتی اقبال ان کا کلام سنتے اپنی شعری الجھنیں انہیں بیان کر کے رہنمائی حاصل کرتے یا اپنا کلام سناتے گرامی بھی اقبال کے دیوانے تھے۔'' (۲۶۰)

گرامی کی طبیعت میں ظرافت کا عنصر بھی قدرے موجود تھا ایک دفعہ اقبال نے علی بخش کو بھیجا کہ گرامی کو ساتھ لے کر آئیں۔ علی بخش کئی روز تک انتظار کرتے رہے۔ مگر گرامی ٹال مٹول سے کام لیتے رہے۔ آخر کار لاہور جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ کچھ سامان تانگے میں رکھا۔ باقی لینے کے لیے اندر گئے۔ زنانہ میں بیگم سے باتوں میں مصروف ہو گئے تانگہ دھوپ میں کھڑا تھا۔ نشست تپ گئی۔ جب سوار ہوئے تو پھر نیچے اتر آئے۔ علی بخش سے کہنے لگے اقبال سے کہہ دینا کہ تانگہ گرم ہو گیا ہے اب سردیوں میں آئیں گے مگر اقبال کے ہاں اگر آجاتے تھے تو واپس جانے کا نام نہ لیتے تھے ایک دفعہ بیگم نے تنگ آ کر بیماری کا تار دیا۔ تار پڑھ کر واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اقبال کو معلوم تھا کہ

سردیوں کے ۹ بجے کوئی ٹرین جالندھر نہیں جاتی۔ ان کو دھیان لگانے کے لیے بولا کہ ایک شعر کے تین مصرعہ لگالیے ہیں ایک لگانے والا رہتا ہے۔ گرامی کو سنائے وہ چوتھے مصرعے کی فکر میں مشغول ہوگئے۔ جب چوتھا مصرعہ اقبال کو سنایا تو اقبال نے مصرعہ کے کچھ حصے کو مزید توجہ کا طالب قرار دیا۔ گرامی رات کے تین بجے تک اس مصرعہ کو موزوں بناتے رہے۔ اقبال اوپر جا کر سو چکے تھے۔ ان کو علی بخش سے کہہ کر نیچے بلوایا۔ اقبال نے مصرعہ سنا۔ واقعی بہت نادر مصرعہ تھا۔ گرامی کی فرمائش پر رات کے تین بجے بازار سے علی بخش سنگترے لے کر آیا۔ یوں گرامی بیگم کے تار کو مکمل طور پر بھول چکے تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے گرامی کی سست طبیعت کے متعلق بھی ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ کیونکہ گرامی نے کبھی اپنا کلام جمع کرنے کی فکر نہ کی تھی۔ علامہ نے ان کو بہت دفعہ دیوان مرتب کرنے کی تجویز پیش کی۔ مگر گرامی نے اپنی رباعیات اور غزلیات کو دیوان کی شکل نہ دی۔ ان کی وفات کے بعد ان رباعیات اور غزلیات کو جدا جدا دیوان کی شکل دے دی گئی۔

ایک دفعہ گرامی نے نظام حیدر آباد کو ایک خوبصورت غزل سنائی جس سے متاثر ہو کر نظام نے انہیں دو سیر سونا انعام میں دیا اور کچھ اور سنانے کی فرمائش کی۔ گرامی نے غزل سنائی اور نظام حیدر آباد نے مزید غزل سنانے کی فرمائش کی مگر گرامی نے بے ساختہ پنجابی میں کہا چھڈ یار، میں تھک گیا واں۔

گرامی کی وفات پر ان کے شاگرد نے ان کی تاریخ وفات لکھی۔

غالب پنجاب مرد (۱۳۴۵ ہجری)

علامہ اقبال کا ابتدائی کلام

ڈاکٹر تقی عابدی نے عرفانی زاویے میں علامہ اقبال کے ابتدائی کلام کو بھی شامل کیا ہے۔ ان سے پہلے بھی اس موضوع پر کافی تحقیق کی جا چکی ہے کہ آخر علامہ اقبال نے شعر و شاعری کی ابتداء کس عمر اور کس کلاس میں کی۔ لیکن کسی کے پاس اس کا خاطر خواہ جواب موجود نہیں ہے سر عبدالقادر نے بانگ درا کے دیباچے میں لکھا ہے:

''اقبال ابھی اسکول میں ہی پڑھتے تھے کہ کلام موزوں زبان سے نکلنے لگا پنجاب میں اردو کا رواج اس قدر ہو گیا تھا کہ ہر شہر میں زبان دانی اور

شعر و شاعری کا چرچا کم و بیش موجود تھا سیالکوٹ میں بھی شیخ محمد اقبال کی طالب علمی کے دنوں میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوتا تھا اس کے لیے اقبال نے کبھی کبھی غزل لکھنی شروع کر دی۔'' (۲۶۱)

ذکر اقبال میں بھی ایسا ہی بیان ملتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے اسکول کے زمانے میں شعر و شاعری شروع کر دی تھی عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں

''اس زمانے میں اقبال شعر گوئی کا مشغلہ اختیار کر چکے تھے۔ خان بہادر محمد مسیح پال کا بیان ہے کہ اقبال کالج کی کلاسوں میں پڑھتے تھے اور میں سکول میں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ وہ سکول کے ایک جلسے میں شریک ہوئے اور اپنی نظم پڑھی۔'' (۲۶۲)

ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق اقبال کی پہلی غزل مجلہ زبان میں ۱۸۹۳ میں چھپی تھی۔ اور اس وقت اقبال کی عمر ۱۲ یا ۱۷ سال تھی۔ اور وہ سیالکوٹ میں گیارھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے۔ مگر کالج کی سطح پر شعر گوئی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اچھی غزلیں کہنے کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی اس سطح پر اقبال قدرے اچھی غزلیں کہنے لگے تھے۔

''اقبال کی چند پرانی غزلوں سے جو رسالہ ''زبان'' دہلی کے شمارہ نومبر ۱۸۹۳ء اور بعد کے شماروں میں شائع ہوئیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف سولہ سترہ سال کی عمر میں اچھی غزلیں کہنے لگے تھے ان کی غزلیں دہلی کے رسالوں کی زینت بھی بنتی تھیں۔'' (۲۶۳)

لیکن جاوید اقبال کی ہی رائے میں اس بات کا جواب وثوق سے نہیں دیا جا سکتا۔ کہ اقبال نے شعر گوئی کی ابتداء کب کی۔ اقبال کو شعروں سے ابتدائی عمر سے ہی شغف تھا۔ اور وہ چھوٹی غزلیں لکھنے کے بعد پھاڑ دیا کرتے تھے زندہ رود میں یکتا حقانی امروہوی ''سیرت اقبال سے جاوید اقبال'' کے توسط سے بیان کرتے ہیں:

''اقبال کی طبیعت کا رجحان نوعمری ہی سے شعر و شاعری کی طرف

تھا۔ بچپن میں وہ اکثر فقرے بول جاتے جو کسی نہ کسی بحر یا وزن میں ہوتے تھے۔ اس کے بعد جوں جوں ان کی سید میر حسن سے وابستگی بڑھی تو باقاعدہ شاعری کی تحریک سید میر حسن ہی کے فیضان صحت سے ہوئی اور انہوں نے ابتدائی زمانہ میں ان ہی سے اصلاح لی۔'' (۲۶۴)

زندہ رود میں بھی ڈاکٹر جاوید اقبال نے داغ دہلوی کو ہی اقبال کا پہلا استاد گردانا ہے۔

''مگر یہ کہنا درست نہیں کہ سید میر حسن فن شعر گوئی میں اقبال کے استاد اوّل تھے اگر اقبال ابتدائی مراحل میں ان سے اصلاح لیتے تھے تو پھر انہی مراحل میں داغ کی شاگردی اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ اقبال نے سید میر حسن کے مشورے سے داغ کی شاگردی اختیار کی۔'' (۲۶۵)

ڈاکٹر تقی عابدی کے مطابق علامہ اقبال کی پہلی غزل یہ ہے جو گلدستہ ''زبان'' دہلی کے شمارے تمبر ۱۹۸۳ میں شائع ہوئی

آب تیغ یا تھوڑا سا نہ لے کر رکھ دیا
باغ جنت میں خدا نے آب کوثر رکھ دیا

۱۸۹۲ء میں ہی ایک اور غزل کا تذکرہ ڈاکٹر تقی عابدی نے کیا ہے مگر غزل نہیں بتائی کہ کونسی تھی ۱۸۹۴ء میں جو غزل اقبال کی منظرِ عام پر آئی اس کا مقطع یہ ہے۔

گرم ہم پر جو کبھی ہوتا ہے وہ بت اقبال
حضرت داغ کے اشعار سنا دیتے ہیں

یہ وہ غزلیں تھیں جن میں اقبال نے پرانی روایت کو ہی استعمال کیا تھا اور اسی فرسودہ خیال کو عملی جامہ پہنچایا تھا۔ یہ بے لطف خیالات تھے جو ابتدائی مشق اور نوجوانی کے اثرات سے پاک نہ تھے۔ ان غزلیات سے اقبال قارئین کو متاثر نہ کر سکے تھے۔ مگر اقبال نے ۱۸۹۴ء میں جو غزل پڑھی وہ دادِ تحسین کے قابل تھی۔

تم آزماؤ ہاں کو زباں سے نکال کے
یہ صدقہ ہوگی مرے سوال وصال کے
موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے میرے عرق انفعال کے

غلام حسین ذوالفقار اقبال کا ذہنی وفکری ارتقاء میں بیان کرتے ہیں

''اقبال نے اسکول کے عرصہ تعلیم میں اردو میں شعر کہنے شروع کر دیئے تھے وہ سیالکوٹ کے مقامی مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگے تھے انہوں نے اپنی کچھ غزلیں بھی داغ دہلوی اس عہد کے مشہور شاعر کی خدمت میں ارسال کی۔'' (۲۶۶)

طالب عالمی کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار تحریر کرتے ہیں:

''طالب علمی کے اس رسمی کیریئر کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اقبال نے اس عرصے کے دوران بعض نظمیں اور غزلیں تخلیق کی۔ ۱۸۹۶ء میں انہوں نے انجمن کشمیری مسلمان کے ایک جلسے میں اپنی نظم ''فلاح قوم'' پڑھی۔ اندرون بھاٹی دروازہ کے ایک مشاعرے میں اقبال نے ایک غزل پڑھی جس کے اس شعر پر اس دور کے مشہور شاعر مرزا ارشد گورگانی نے پرزور داد دی۔'' (۲۶۷)

اور یہ وہی غزل تھی جس کا ذکر ڈاکٹر تقی عابدی نے اوپر کیا تھا کہ یہ روایت سے ہٹ کر تھی۔ سید عابد علی عابد شعر اقبال میں اس غزل کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ سر محمد اقبال نے جو اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ اپنی پہلی غزل اسی مشاعرے میں پڑھی۔ اسی مشاعرے میں اقبال نے وہ شعر پڑھا جس کا چرچا بہت دیر تک ارباب ذوق کے حلقوں میں رہا۔ ان کا یہ شعر اب تک پرانے لوگوں کی زبان پر جاری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اقبال نے شعروشاعری کی اصلاح کے لیے داغ دہلوی سے کب شرف حاصل کیا۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''اقبال نویں یا دسویں جماعت سے باقاعدہ غزلیں لکھنے لگے تھے۔

اور مشاعرہ میں شریک بھی ہوتے تھے۔ داغ کا شہرہ سن کر ان کو خط لکھا کچھ غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں اور یوں ایف۔ اے کے سال اول میں ان کی شاگردی اختیار کر لی۔۔۔ وہ گاہے بگاہے خط و کتابت کے ذریعہ کلام پر اصلاح لیتے رہے۔ اقبال کی داغ کے ساتھ بالمشافہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔" (۲۶۸)

اقبال نے ایک شعر ایسا لکھا جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ان کی بالمشافہ ملاقات داغ سے نہیں ہوئی۔

یہی ہے جو شوق ملاقات حضرت
تو دیکھیں گے ایک بار ملک دکن بھی

لیکن کچھ عرصے کے بعد اقبال نے داغ دہلوی سے اصلاح لینی ترک کر دی تھی۔ کیونکہ داغ دہلوی کے مطابق اقبال کو اب اصلاح کی ضرورت نہ تھی۔ ۱۸۹۶ء دسمبر کے مجلّہ "شورِ محشر" میں ایک بیس اشعار کی غزل لکھی جس کے مقطع میں داغ کی شاگردی پر فخر کیا۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغ سخن داں کا

اس کے بعد غزلوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور یوں اقبال کا طوطی پورے ہندوستان میں بولنے لگا۔ اقبال نے لاہور کے ایک مشاعرے میں یہ شعر پڑھا

شعر کہنا نہیں اقبال کو آتا لیکن
آپ کہتے ہیں سخنور تو سخنور ہی سہی

اقبال کی اس سخنور ہی سہی کی بے ساختگی سے لوگ بہت متاثر ہوئے۔ اسی مشاعرے میں اقبال نے ایک اور شعر پڑھا۔

خوب سوجھی ہے نہ دام پھڑک جاؤں گا
میں چمن میں نہ رہوں گا تو مرے پر ہی سہی

یوں اقبال کی شہرت بڑھتی چلی گئی۔ مشاعروں میں سامعین کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی

تھی۔ غلام محبوب سبحانی کی زیر صدارت ادبی انجمن میں طرحی غزلوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اسی انجمن میں یہ طرح دی گئی۔

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا

اب اس طرح مصرعے پر غزل لکھ کر لانی تھی چنانچہ اقبال نے بھی اس طرح مصرعے کی طرح غزل لکھی جس میں داغ کی شاگردی پر فخر کیا ہے:

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغ سخنداں کا

اسی انجمن کے کسی مشاعرے میں اقبال نے اپنی نظم ہمالہ بھی پڑھی تھی۔ یہ نئے رنگ کی نظم ہے جس میں مغربی خیالات کے ساتھ ساتھ فارسی ہندسوں کا استعمال بھی بطور احسن برتا گیا تھا پھر موضوع حب وطن کی چاشنی میں جھلک رہا تھا۔

اقبال چند ہی روز میں اس ادبی انجمن کے رکن بن گئے تھے احباب کے اس گروہ نے جو رفتہ رفتہ اقبال کا حلقہ بگوش ہوگیا تھا اقبال کو انجمن حمایت اسلام کے لیے نظمیں لکھنے پر آمادہ کرلیا تھا۔ اقبال ایک طرف مشاعروں میں غزلیں روایتی لحاظ سے پڑھ رہے تھے اور دوسری طرف انجمن کے جلسوں میں نظموں پر جدت طرازی کے جوہر دکھا رہے تھے۔ یوں اقبال انجمن حمایت اسلام کے بڑے مجموں اور جلسوں میں شریک ہوکر ایک ملی اور عوامی شاعر کی حیثیت سے مقبول عام ہونے لگے تھے۔ غلام حسین ذوالفقار تحریر کرتے ہیں:

"نالہ یتیم (مسدس ۳۴ بند) انجمن حمایت اسلام کے ۱۵ ویں سالانہ اجلاس میں ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کو ڈپٹی نذیر احمد کی صدارت میں پیش کی گئی۔ "خدا حافظ" کے عنوان سے ۲۵ مئی ۱۹۰۰ء کو ایک نظم منشی محبوب غلام کے سفر یورپ کے الوداعی جلسے منعقدہ اسلامیہ کالج میں پڑھی گئی "یتیم کا خطاب ہلال عید سے" (ترکیب بند ۱۵) انجمن حمایت اسلام کے سولہویں اجلاس منعقدہ ۱۹۰۱ء میں پیش کی گئی۔ "اشک خون" کے عنوان سے نظم (ترکیب بند ، دس بند) ملکہ وکٹوریہ کے انتقال (۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء) پر لکھی گئی اور اس کا

انگریزی ترجمہ ہوا اور شائع ہوا۔ اسی زمانے میں ''ہمالہ'' تخلیق ہوئی جو ''مخزن'' کے پہلے شمارے (اپریل ۱۹۰۱ء) میں شائع ہوئی)'' (۲۶۹)

اقبال نے انجمن کے سٹیج پر پہلی مرتبہ ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کے سالانہ جلسے میں اپنی نظم ''نالہ یتیم'' پڑھی اقبال نے جس سوز و گداز کے ساتھ یتیموں کی بے کسی کا نقشہ کھینچا اس سے عام لوگوں کی آنکھیں اشکبار ہوگئی۔ اور جب اقبال اس یتیم کو دربار نبویؐ میں لے گئے تو لوگوں کی چیخیں نکل گئی۔

عبدالمجید سالک ذکر اقبال میں تحریر کرتے ہیں:

''۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کا جو سالانہ جلسہ ہوا اس میں اقبال نے ایک نظم ''نالہ یتیم'' کے عنوان سے ترنم کے ساتھ پڑھی۔ نظم بے حد موثر تھی اور ترنم اس سے بھی زیادہ موثر تھی۔ چنانچہ اس پر ہزاروں حاضرین اشک بار ہوئے اور دور دور تک اس نظم کی دھوم مچ گئی بہت سی مجلسوں اور انجمنوں کی طرف سے اقبال کو فرمائش موصول ہونے لگیں انہوں نے ہمیشہ ان فرمائشوں کی تعمیل سے انکار کیا'' (۲۷۰)

اس نظم کی کاپیاں آناً فاناً فروخت ہوگئیں۔ اقبال کے والد نے جو اس وقت گیلری میں موجود تھے سولہ روپے کی ایک جلد خریدی یہ نظم انیس و دبیر کے مرثیے سے بھی زیادہ دردناک لہجے میں موجود تھی۔ لوگوں نے اقبال کو مجبور کر کے دوبارہ نظم پڑھوائی تھی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''اس کے بعد اقبال کی نظمیں انجمن کے سالانہ جلسوں کی ایک امتیازی خصوصیت بن گئیں۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء میں انجمن کے اجلاس میں اقبال نے اپنی نظم ایک ''یتیم کا خطاب ہلال عید سے'' پڑھی۔ ۱۹۰۲ کے اجلاس میں ''خیر مقدم'' دین و دنیا اور اسلامیہ کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے پڑھیں۔ ۱۹۰۳ء کے اجلاس میں ''فریاد امت'' پڑھی'' (۲۷۱)

ادبی اور قومی حلقوں میں اقبال کی شعری خدمات کا اعتراف ہونے لگا تھا اقبال نے اسی زمانے میں اپنی نظم ''تصویر درد'' پڑھی ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''۱۹۰۴ء کے اجلاس میں انہوں نے نظم تصویر درد پڑھی اس موقع پر

دیگر شخصیات کے علاوہ حالی، ارشد گورگانی، سر محمد شفیع، سر عبدالقادر، سر فضل حسین، مولانا ابوالکلام آزاد اور خواجہ حسن نظامی موجود تھے۔ نظم ترنم سے پڑھی گئی اور نہایت توجہ سے سنی گئی۔'' (۲۷۲)

اس کے علاوہ اس زمانے میں دیگر قابل ذکر نظموں کی اشاعت ''مخزن'' کے شماروں میں ہوئیں ان میں ''زہد اور رندی'' دسمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ ''طفل شیر خوار'' فروری ۱۹۰۴ء میں ''رخصت اے بزم جہاں'' مارچ ۱۹۰۴ء اور ''بلال'' ستمبر (۱۹۰۴ء) ''ہمارا دیس'' اکتوبر (۱۹۰۴ء) میں شائع ہوئی ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' ''نیا شوالہ'' بھی اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی تحریر کا اختتام بھی تصویر درد پر ہی کیا ہے۔

''۱۹۰۴ء میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام میں اپنی آخری نظم ''تصویر درد'' پڑھی جو (۱۲۸) اشعار پر مشتمل ہے۔ لیکن بانگ درا میں صرف (۶۹) اشعار اس کے انتخاب کیے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ نظم علامہ اقبال کے ابتدائی کلام میں شامل نہیں کی جاسکتی لیکن اس کی خاص اہمیت کے لیے اس کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس نظم میں وطن کا حال زار وطن سے پیار اور اقبال کا اضطراب نمایاں ہے۔ یہ وہی نظم ہے جس کو سن کر حالی نے دس روپے کا چندہ دیا اور خواجہ حسن نظامی نے اقبال کے سر پر اپنا عمامہ رکھ دیا۔'' (۲۷۳)

اقبال کا تصور زماں و مکاں

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے عرفانی زاویے میں معروف سائنس دان ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی تصنیف اقبال کا تصور زماں و مکاں پر تبصرہ بھی تحریر کیا ہے۔ زمان و مکان کے تصور کو سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ مگر رضی الدین صدیقی کی اس تصنیف کو پڑھنے کے بعد یہ مسئلہ سمجھنا قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مضمون پر تبصرہ سے قبل اس کتب کا تعارف کروایا ہے کہ یہ کتاب (۴۸) صفحات پر مشتمل ہے جسے عبدالرزاق تاجر کتب نے حیدر آباد دکن سے ۱۹۲۴ء میں شائع کیا ہے۔ تقی عابدی نے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے اقبال کے زمان و مکان کے تبصرے کو

واضح کرنے کے لیے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ جب کہ اس وقت اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی منظر عام پر آچکا تھا۔ چونکہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اعلیٰ پائے کے سائنس دان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ادبی محقق بھی تھے اس لیے ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے عجز کا اظہار اس طرح سے کیا ہے۔

''اگر چہ اس تعارفی مضمون میں میرے لیے یہ بات ممکن نہیں کہ اس کتاب کے تمام گوشوں اور نتائج کو پیش کر سکوں کیونکہ خود ڈاکٹر رضی الدین نے سمندر کو کوزہ میں سمو دیا ہے لیکن بہر حال میری کوشش ہوگی اس گلشن فکر و خیال سے اس طرح گزر جاؤں کہ مشام زمان و مکاں قاری کو اس گلشن یعنی اس کتاب کے مطالعہ کے لیے آمادہ کر دے۔'' (۲۷۴)

اگر چہ ڈاکٹر تقی عابدی نے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے مضمون کو بہت ہی مختصر طریقے سے واضح کر دیا ہے۔ لیکن نہایت عمدگی سے اقبال کے اشعار کو بھی جا بجا اس نظریے کی رو سے استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے بہت ہی جامعیت اور سائنسی انداز میں پہلے تصور زماں اور مکان کو واضح کیا ہے۔ پھر اس نظریے کے متعلق عوام کی رائے کو بھی ملحوظ رکھا۔ اور دنیا کے مختلف فلسفیوں کے نظریات کے ذریعے زمان و مکان کو واضح کیا۔ جب مسئلہ اتنے نظریات کے درمیان بھی سمجھ سے بالاتر رہا تب رضی الدین صدیقی نے اس کو علامہ اقبال اور قرآن کے ذریعے حتمی شکل تک پہنچایا ہے ۔ علامہ اقبال کے خطبات میں بھی جا بجا اس نظریے کا ذکر ملتا ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اپنے مضمون کا آغاز ہی اس بات سے کرتے ہیں:

''اقبال نے اپنے کلام خطبات اور دوسری تحریروں میں جن بنیادی مسئلوں پر غور و فکر کیا ہے ان میں زمان و مکاں کا سائنسی اور فلسفیانہ مسئلہ بھی شامل ہے جو ان کے زیر نظر بہت زیادہ رہا ہے حتیٰ کہ خطبات کا بیشتر حصہ محض اسی مسئلے کی توضیح و تشریح اور اس کے اطلاقات پر مشتمل ہے۔'' (۲۷۵)

علامہ اقبال کا خیال تھا کہ زمان و مکاں پر ہی زندگی اور موت کا دارومدار ہے اسی لیے وہ زمان و مکاں کے مسئلے کو زندگی اور موت کا مسئلہ خیال کرتے تھے۔

''دوسری طرف اسلامی تہذیب کی تاریخ کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالص ذہنی مسائل ہوں یا مذہبی نفسیات یعنی اعلیٰ تصوف کے مسائل ہوں سب کا نصب العین اور مقصود یہی ہے کہ لامحدود کو محدود کے اندر سمولیا جائے ظاہر ہے کہ جس تہذیب کا یہ مطمع نظر یہ ہو اس میں زمان و مکاں کا سوال درحقیقت زندگی اور موت کا سوال ہے۔'' (۲۷۶)

اقبال یہ بات بخوبی سمجھتے تھے کہ حکمت اور سائنسی علوم انسان کے لیے مستقل راہ نہیں بن سکتے۔ لیکن انسانی زندگی کے لیے بہت اہمیت کے حامل ہیں اسی لیے اقبال نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''جاوید نامہ'' میں اس مسئلے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ''پیام مشرق'' اور ''رموزِ بیخودی'' میں بھی اس خیال کی ترجمانی کی ہے۔

گفت حکمت را خدا خیر کثیر
ہر کجا ایں خیر رابینی بگیر
علم حرف و صوتِ را شہپر دھد
پاکی گوہر بہ ناگوہر دھد
علم را براوج افلاک است رہ
ناز چشم مہر برکند دنگہ
نسخہ او نسخہ تفسیر کل
بستہ تقدیر او تقدیر کل
دشت را گوید حبابے دہ دھد
بحر را گوید سرابے دہ ھد
چشم او ہر واردات کائنات
تا بیند محکمات کائنات
دل اگر بندد پیغمبری است
ورزحق بیگانہ گردد کافری است (۲۷۷)

یعنی اقبال نے حکمت اور سائنس کو اسلام سے جوڑ دیا ہے۔ خدا نے حکمت کو نیک کام کہا ہے لہٰذا اس نیکی کو حاصل کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ پھر اسی سائنس کو موسیٰ کے عصا اور ان کے ہاتھ کا علم قرار دیتے ہیں۔ علم اسما سے ہی انسان کی حفاظت اور انسانیت کا اعتبار قائم رہتا ہے اور اسی علم کی تاثیر سے قطرہ سمندر کو موتی بنا سکتا ہے۔ سائنس چونکہ غور و فکر کا نام ہے اور دل حق کی تلاش کرلے تو پیغمبری ہے ورنہ کافری ہے۔ اقبال کائنات پر غور و فکر اور تحقیق کو عبادت کی ایک قسم قرار دیتے ہیں۔ اقبال خطبات میں سائنس کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

> ''غرض کہ جو تشریح ہم نے اوپر دی ہے وہ طبیعی سائنس کو ایک نئی روحانیت عطا کرتی ہے۔ نیچر کا علم خدا کی خدائی کا نام ہے جب ہم نیچر کا مشاہدہ کرتے ہیں تو گویا ہم انائے مطلق سے قریب تر ہوتے ہیں اور یہ بھی ایک قسم کی عبادت ہے۔'' (۲۷۸)

اقبال کے نزدیک جدید سائنس فلسفے اور مذہب کے بنیادی مسئلوں کو سمجھنے میں مدد کر سکتی ہے۔ اور زمان و مکاں جیسے بنیادی مسئلوں کو سمجھے بغیر الہیات کی تشکیل نہیں ہو سکتی۔ اقبال نے زمان و مکاں کو سمجھنے کے لیے قدیم اور جدید دونوں نظریوں کو سامنے رکھ کر تنقیدی نقطہ نظر سے وضاحت کی ہے۔ اور ان نظریوں کی روشنی میں اپنے موقف کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ کن تصورات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کی تائید کی جا سکتی ہے زمان و مکاں کے متعلق عوام کا تصور پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی تحریر کرتے ہیں۔

> ''زمان و مکان کے بارے میں عامیانہ تصور کچھ اس طرح کا ہوتا ہے۔ ایک دن میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں وہ ایک سادہ ترتیب سے واقع ہوتے ہیں جس طرح کہ ایک مالا میں موتی ایک ترتیب سے یکے بعد دیگرے پروئے ہوتے ہیں مالا کو ہم وقت کہہ سکتے ہیں اور واقعات کی جو ترتیب ایک دوسرے کے لحاظ سے ہوتی ہے وہ پہلے اور بعد کے الفاظ سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔ جس طرح مالا میں دو موتیوں کے درمیان بعض حصے خالی ہوتے ہیں اسی طرح ممکن ہے کہ دو واقعات کا درمیانی وقت خالی

گزرے جس میں کوئی ایسا واقعہ رونما نہ ہوا ہو جس کا ہمارے ذہن پر کوئی خاص اثر ہو۔ ہمارا ذہن اس کو خالی آن قرار دے گا۔" (۲۷۹)

ڈاکٹر تقی عابدی نے بھی عوام کے اس تصور کو موضوع بحث بنایا ہے ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وقت ایک خارجی شے ہے جو انسان کے شعور سے اس طرح گزرتا ہے جسے کوئی دریا ایک پل کے ستونوں میں سے ہوتا ہوا بہتا ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے زمان کے علاوہ مکان کے متعلق بھی عوام کے تصور کو واضح کیا ہے۔

"لیکن مکان کے بارے میں ہمارا تصور اس سے مختلف ہے فضا میں اشیاء کے مقامات کا تعین ہم آنکھ کے ذریعے کرتے ہیں اور ہماری آنکھ کی ساخت کچھ اس قسم کی ہے کہ جو شعاعیں ایک ہی سمت سے آتی ہیں وہ ایک ہی نقطے پر جمع ہوتی ہیں۔ اس طرح اشیاء کے متعلق ہماری پہلی ترتیب سمت کے لحاظ سے ہوتی ہے۔" (۲۸۰)

لیکن سمت کے ذریعے ہم مکان کا تعین نہیں کر سکتے کیونکہ جگہ بدلنے سے مکان بھی بدل جاتا ہے۔ باہم متصل دو اشیاء اب علیحدہ علیحدہ دکھائی دینے لگتی ہیں۔ دونوں کے درمیان خالی فاصلہ ضرور ہوتا ہے رضی الدین صدیقی اقبال کے تصور زمان و مکان میں تحریر کرتے ہیں:

"غرض واضح ہے کہ فضا میں اشیاء کا تعین کوئی غیر متغیر مطلق یا خارجی شے نہیں ہے۔ بلکہ وہ موضوعی اور شخصی ہے اس کے برعکس ہم دیکھ آئے ہیں کہ دو واقعات کے درمیان وقت کی ترتیب ایک خارجی چیز ہے جو ہمارے ذاتی اثرات سے قطعاً بے نیاز ہے۔" (۲۸۱)

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے علامہ اقبال کے موقف کی وضاحت کرنے سے قبل اہل یونان کا تصور بھی بیان کیا ہے۔ بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ مختلف مادی اشیاء کی ترتیب کے لیے ایک واسطے کا کام دے یہ تصور یونان کے مشہور فلسفی افلاطون کا ہے۔ اسی طرح زینو کے مطابق فضا کے کسی حصے کو جس قدر چاہیں چھوٹے اجزاء میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مطابق فضا میں حرکت محض ایک فریب نظر ہے کیونکہ محدود وقت میں لامحدود نقطے طے کرنا ناممکن ہے یونانیوں کی حتی الامکان کوشش ہوتی

ہے کہ حرکت کے تصور کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اسی وجہ سے وہ علم حرکت کی تشکیل نہیں کر سکے۔ ان کے آرٹ اور بت تراشی کے نمونوں میں حرکت ناپید نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی تحریر کرتے ہیں:

> ”جس طرح ان کے اصنام بجائے عمل کے صرف سکون کو تعبیر کرتے ہیں اسی طرح ان کی جیومیٹری میں بھی بجائے واقعات کے صرف نقطوں سے بحث ہوتی ہے۔“ (۲۸۲)

یونانیوں کے علاوہ ہمارے علمائے اسلام نے بھی زمان و مکاں کے متعلق اپنے اپنے تصورات بیان کیے ہیں ان میں اشاعرہ معتزلہ وغیرہ نے تفصیل سے اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ علامہ اقبال نے ابن حزم طوسی اور عراقی کے افکار پر تنقید اور تبصرہ کیا ہے۔ اشاعرہ کا تصور کو اٹم تصور ہے۔ انہوں نے زینو کے نظریے کو رد کر دیا ہے کہ حرکت ناممکن ہے اور زمان مکان اور حرکت ناقابل تقسیم نقطوں اور آنوں پر مشتمل ہے اشاعرہ نے چھلانگ کا تصور بھی پیش کیا کہ سالمے دوران حرکت میں تمام درمیانی نقطوں پر سے گزرنے کے بجائے صرف چند نقطوں پر سے گزرتے ہیں اور بقیہ فضا چھلانگ جاتے ہیں لیکن مولوی عبدالباری ندوی کے مطابق چھلانگ کا نظریہ معتزلہ کا ہے۔ جو پلانک اور بوھر کے موجودہ کوانٹم سے ملتا جلتا تصور ہے۔ اقبال نے اشاعرہ کے نظریے کے ایک پہلو کی تردید کر دی ہے ان کے مطابق بغیر نفسیاتی زندگی کے وقت ناممکن ہے اور بغیر وقت کے حرکت ناممکن ہے ان کے مطابق زمان بھی کوئی مطلق شے نہیں ہے بلکہ نفسیاتی زندگی پر منحصر ہے۔ لیکن اشاعرہ کے اس نقطے کے ساتھ متفق نظر آتے ہیں کہ زمان و مکاں باہم متصل ہیں۔ ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح اشاعرہ کے برعکس اقبال نقطہ سے زیادہ ان کو اساسی قرار دیتے ہیں۔ اقبال کا یہی نظریہ نظریہ اضافیت کی رو سے بالکل ٹھیک مانا گیا۔ علامہ جلال الدین رومیؒ اور صوفی شاعر عراقی نے وقت کا ایک اضافی تصور لیا ہے۔ ان کے مطابق مختلف ہستیوں کے لیے زمان کی نوعیت مختلف ہے۔ مادّی اشیاء کے لیے وقت آسمانوں کی گردش سے پیدا ہوتا ہے اور اس کو ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اور وقت کی نوعیت یہ ہے ایک دن کے ختم ہونے کے بعد دوسرا دن شروع نہیں ہوتا ہے۔ مادی ہستی کے لیے جو مدت ایک سال کی ہے وہ غیر مادی ہستی کے لیے ایک دن کی ہے۔ اور غیر مادی ہستیوں کی درجہ بدرجہ تقسیم میں ارفع مقام ربانی یا الٰہی کا ہے۔ جس کے لیے وقت کی نہ تقسیم

ہے نہ ترتیب اور نہ تغیر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی تحریر کرتے ہیں:

''اس لیے اس میں نہ تقسیم ہے نہ ترتیب اور نہ تغیر۔ یہ دوام سے بھی بالاتر ہے اور اس کا نہ آغاز ہے اور نہ انجام یہی وہ وقت ہے جس کو قرآن کریم نے اُم الکتاب کا لقب دیا ہے اور جس میں ساری تاریخ عالم علت و معلول کے سلسلے سے آزاد ہو کر ایک مافوق الدوام ''ب'' میں سما جاتی ہے۔'' (۲۸۳)

اسی طرح عراقی نے بھی مختلف اجسام کے لیے مختلف درجہ بندی کر دی ہے۔ اس کے مطابق فضا کے تین طبقوں میں سے پہلا طبقہ مادی اشیاء کا ہے دوسرے درجے میں ہوا اور اس جیسی ہلکی چیزیں جب کہ تیسرے درجے میں نور یا روشنی کی فضا شامل ہے۔ پہلے طبقے میں فضا میں موجود دو نقطوں کی وضاحت کی جا سکتی ہے دوسرے طبقے میں غیر مادی ہستیوں یعنی فرشتے وغیرہ شامل ہیں۔ ملائکہ اور ارواح دیوار پھلانگ کر بھی گزر سکتے ہیں۔ تیسرے طبقے میں ربانی یا الٰہی فضا شامل ہے جو تمام ابعاد اور فاصلوں کی قیدوں اور بندشوں سے آزاد ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی عراقی کے اس نظریے کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

''اس طرح عراقی نے مکان کے جدید تصور تک یعنی اس تصور تک پہنچنے کی ناتمام کوشش کی ہے کہ فضا ایک لامحدود سلسلہ ہے اور حرکیاتی خواص رکھتی ہے۔'' (۲۸۴)

دور حاضر کے مغربی مفکرین میں دے کارت کا فلسفہ اشیاء کو ذہن یا مادہ دونوں میں سے کسی ایک کا حصہ قرار دیتا ہے۔ جب کہ ذہن اور مادے کا آپس میں کوئی رشتہ بھی نہیں ہے۔

''ذہن کی خاصیت خیال ہے جو نہ جگہ گھیرتا ہے اور نہ فضا میں کسی خاص ترتیب کا حامل ہے۔ مادے کی خاصیت جگہ گھیرنا اور فضا میں واقع ہوتا ہے۔'' (۲۸۵)

اس کے بعد نیوٹن نے زمان اور مکان کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا۔ نیوٹن اپنے تصور کو یوں بیان کرتا ہے۔:

''مطلق فضا (مکان) کسی خارجی شے کے لحاظ سے نہیں بلکہ فی نفسہ

محض اپنی حقیقت کی بنا پر غیر متغیر اور غیر متحرک ہے۔اضافی مکان مطلق مکان کا ایک حرکت پذیر حصہ ہے ہمارے حواس اس کو دوسری اشیاء کے لحاظ سے اس کے مقام کے ذریعے محسوس کرتے ہیں۔'' (۲۸۶)

نیوٹن نے مکان کے ساتھ ساتھ تصور زمان کو بھی بیان کیا۔

''مطلق''، حقیقی اور ریاضیاتی وقت کسی خارجی شے کے لحاظ سے نہیں بلکہ فی نفسہ اور بذات خود یکساں طور پر بہتا ہے۔اضافی ظاہری اور معمولی وقت حقیقی اور مطلق وقت کا ایک خارجی ناپ ہے جسے ہم روزمرہ کے کاروبار میں استعمال کرتے ہیں اور جو گھنٹے دِن مہینے اور سال سے تعبیر ہوتا ہے۔'' (۲۸۷)

علامہ اقبال کو نیوٹن کے اس نظریے پر کافی اعتراضات تھے۔اقبال خطبات میں نیوٹن کے نظریے کو پیش نظر رکھ کر لکھتے ہیں:

''اگر وقت کوئی ایسی چیز ہے جو خود بخود اور بلا کسی خارجی شے کے حوالے کے مسلسل طور پر بہتا ہے تو ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ کسی شے کے اس بہاؤ میں داخل ہونے سے کوئی تغیر پیدا ہو سکتا ہے۔اور وہ اس سے مختلف ہو سکتی ہے جس نے اس بہاؤ میں حصہ نہ لیا ہو۔اور اگر ہم وقت کو ایک ندی کے بہاؤ کے طور پر سمجھنے کی کوشش کریں تو پھر ہم اس کی ابتداء انتہا اور حدود کو نہیں سمجھ سکتے۔'' (۲۸۸)

اقبال نے نٹشے کے تصور زمان و مکان پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔بلکہ اس کے تصور کو بہت سخت قسم کی میکانیت اور جبریت قرار دیتے ہیں۔ڈاکٹر رضی الدین صدیقی تحریر کرتے ہیں:

''اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ نٹشے کا یہ تصور تقدیر اور قسمت کے قدیم تصور سے بھی زیادہ قنوطی اور یاس انگیز ہے ہم محض اس شے کے لیے جدوجہد کر سکتے ہیں جو بالکل نئی اور انوکھی ہو اور چونکہ نٹشے کے مطابق کائنات میں کوئی نئی واردات نہیں ہو سکتی لہٰذا یہ تصور انسان کے عمل اور جدوجہد کے

رجحان اور رغبت کو معدوم کر دیتا ہے۔"(۲۸۹)

آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کی رو سے مکان کوئی مطلق شے نہیں ہے بلکہ اضافی ہے۔ چونکہ وقت خود اضافی شے ہے اس لیے فاصلہ جو وقت پر منحصر ہے لازماً اضافی ہوگا۔ نظریہ اضافیت کی رو سے زماں اور مکان ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ کائنات میں زمان اور مکاں دو مختلف چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی چیز زمان و مکاں بتائی جاتی ہے۔ مشاہدہ کے مقام اور اس کی رفتار کے ساتھ جسم کی کمیت شکل اور جسامت بدلتی رہتی ہے۔ حرکت اور سکون بھی مشاہدہ کے لحاظ سے اضافی ہیں۔ زمان و مکان کی اس اضافی خاصیت کو اقبال نے بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج ؟ انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعور از جذب و شوق
وار ھاند جذب و شوق از تحت وفوق
ایں بدن باجان ماانبار نیست
مشت خاک مانع پرواز نیست(۲۹۰)

رومی اقبال کے زمان و مکان کو زندگی کی مختلف حالتوں میں سے ایک حالت قرار دیتے ہیں۔ جب انسان زمان و مکان پر غالب آجائے تو آسمانی سفر ممکن ہوسکتا ہے اور جسم خاکی سے مبرہ ہونا بھی ضروری ہے۔

برمکاں و برزمان اسوار شو
فارغ از پیچاک ایں زنار شو
چشم بکشا برزمان و برمکاں
ایں دو یک حال است از احوال جاں(۲۹۱)

اس کے بعد جب زمان و مکاں کا فرشتہ یعنی زروان اقبال کے سامنے آتا ہے۔ اقبال اس فرشتے کی دو مختلف صورتیں بتلاتے ہیں جن کا مقصد زمان و مکان کی اضافی خاصیت کا اظہار کرنا ہے۔

زاں سحاب افرشتہ آمد فرود

باد و ظلمت ایں چو آتش آں زنار شو(۲۹۲)

علامہ اقبال آئن شطائن کے نظریہ سے متفق ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ نظریہ اشیاء کی ساخت سے بحث کرتا ہے مگر اشیاء کی ماہیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ اور یہ زمان کی بہت سی خصوصیات کو نظر انداز بھی کر جاتا ہے۔ اقبال نے زمان کے متعلق جو تصور پیش کیا ہے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اس کو یوں تحریر کرتے ہیں:

> ''حقیقی زمان ایک قسم کی تخلیقی فعلیت ہے اس کے متعلق تواتر کا تصور نہیں کہا جا سکتا اور نہ اس کو ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے بلکہ زمان خالص دوران و مرور ہے۔ ہمارا ذہن اپنی سہولت کی خاطر اس خالص زمان کو متواتر آفات میں تقسیم کر لیتا ہے تا کہ اس طرح حقیقت کی فعلیت کا تصور اور اس کی پیائش کی جا سکے۔'' (۲۹۳)

اقبال کا نظریہ ہے کہ زمان کا خط پہلے سے کھنچا ہوا موجود نہیں بلکہ اس خط کی کشش جاری رہتی ہے تا کہ زندگی کے امکانات ظاہر ہوتے رہیں۔ روح اقبال میں ڈاکٹر یوسف حسین خان تحریر کرتے ہیں:

> ''حوادث کے لیے زمان ظرف کی حیثیت نہیں رکھتا زمان عارضی ہے اُن اشیا کے لیے جو ممکنات رکھتی ہیں۔ اس طرح زندگی نت نئے روپ اختیار کرتی رہتی ہے اور پھر اپنے ارتقاء کی منزلوں کو طے کرتی جاتی ہے۔'' (۲۹۴)

اقبال نے داخلی زندگی کے لحاظ سے انا کے دو رُخ بیان کیے ہیں: فاعل انا اور عاقل انا یہ ماڈی اور روحانی زندگی سے مربوط ہیں۔ فاعل انا طبیعی دنیا سے زمان و مکاں کا ربط پیدا کرتا ہے۔ اور عاقل انا کی تشریح خود قرآن کریم نے کی ہے۔ اس انا کا پتا ہمارے شعوری تجربے کی تحلیل سے چلتا ہے۔ لیکن انسان زندگی کے خارجی مظاہر میں اس قدر مصروف ہو جاتا ہے کہ عاقل انا کے دوران جسے ہم قرنوں اور صدیوں میں شمار کرتے ہیں عاقل انا کے لیے ایک آن واحد ہے۔ روشنی کی موجوں کی

کثرت کو گننے کے لیے لاکھوں سال چاہیے مگر چشم ذوق میں ایک واحد فوری فعل کے ذریعے محسوس کر لیا جاتا ہے روح اقبال میں ڈاکٹر یوسف حسین خان تحریر کرتے ہیں:

"مستقبل پہلے سے بندھا ٹکا اور مقرر نہیں بلکہ ایک کھلے امکان کے طور پر موجود رہتا ہے قرآن پاک نے جس چیز کو تقدیر کہا ہے وہ زمان ہی ہے۔ زمان اور مکان ایک دوسرے سے مل کر زمان و مکان کا چار ابعادی سلسلہ بناتے ہیں لیکن پھر بھی زمان اور مکاں کا بنیادی فرق باقی رہ جاتا ہے۔" (۲۹۵)

اقبال کے نزدیک انسانی زندگی کا المیہ یہ ہے کہ بجائے زمان کی اصلی حقیقت کو سمجھ کر زندگی کو آبدار بنانے کے انسان زمان کو مکاں کی طرح تسلسلی سمجھ کر گردش لیل و نہار میں اسیر ہو جاتا ہے۔

باز با پیمانہ لیل و نہار
فکر تو پیمود طول روزگار
وقت را مثل مکاں گستردہ ای
امتیاز دوش و فردا کردہ ای
عشق و غم عاشو روھم عیداست وقت
سرتاب ماہ و خورشید است وقت (۲۹۶)

بال جبریل میں زمانہ کے نام سے نظم بھی زمان کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس میں فاعل انا کے تسلسلی وقت کا بھی ذکر ہے اصل زمان میں خود زندگی اور تقدیر مضمر ہے جس شخص کی نظر عارفانہ نہیں ہے وہ اصل زمان سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
میری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ (۲۹۷)

اسی طرح پیام مشرق میں "نوائے وقت" اقبال کے تصور زمان کو بہت اچھی طرح پیش کرتی

ہے زمان تقدیر کا نام ہے اگر اس کو قید و بند سے آزاد کر دیا جائے۔ یہ وقت جو تقدیر ہے حقیقی ہے اور تمام اشیاء کی جان ہے

خورشید بہ دامانم انجم بگیر بانم
در من نگری ہیچم در خود نگری جانم
در شہر و بیابانم در کاخ و شبستانم
من در دم و در مانم من عیش فراوانم
من تیغ جہاں سوزم من چشمہ حیوانم (۲۹۸)

کہا ہے وہ زمان ہی ہے جب کہ اس کو عضوی کل کے طور پر دیکھا جائے۔ تقدیر وہ زمان ہے جب کہ اس کے امکانات کو ظہور سے قبل اس پر غور کیا جائے ہر آنے والا لمحہ نہ صرف نیا ہوتا ہے بلکہ اس کے متعلق پیش گوئی کرنا ناممکن ہے۔" (۲۹۹)

چونکہ اسلام نے زمان کو حقیقی مانا ہے اس لیے اقبال نے بھی زمان کو حقیقی کہا ہے مگر طبیعی زمان مکان جس میں انسانی عقل چکر لگاتی ہے اصل حقیقت نہیں

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا اِلٰہ اِلا اللہ
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدان من
چہ زماں وچہ مکاں شوخی افکار من است (۳۰۰)

اقبال کا یقین ہے کہ روح اور مادہ دو الگ چیزیں نہیں ہیں اور انسان ان دونوں چیزوں کا مرکب ہے بال جبریل میں اقبال نے واضح کیا ہے کہ زندگی زمان کے مسلسل تغیر و حرکت کا دوسرا نام ہے۔

سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلہ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلہ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلہ روز و شب ساز ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیروبم ممکنات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے اور نہ
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دِن ہے نہ رات (۳۰۱)

اقبال کے مطابق ہر انسانی تدبیر زمان کی تقدیر کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ زندگی موت اور حشر سب زمان ہی کی حرکتیں ہیں انسان فرشتے اور کائنات سب زمان میں واقع ہوئے ہیں زمان حقیقت آخری کا ضروری جزو ہے۔

تقدیر فسوں من تدبیر فسون تو
تو عاشق لیلائے من دشت جنوں تو
چوں روح رواں پاکم از چندوچگوں تو
تو راز درون من من راز درون تو
از جان تو پیدانم درجاں تو پنہانم
من رھرو و تو منزل من مزرع و تو حاصل
تو ساز صد آہنگے تو گرمی ایں محفل
آواز آب و گل درباب مقام دِل
گنجیدہ یہ جامے ہیں ایں قلزم بے ساحل
از موج بلند تو سر بزدہ طوفانم (۳۰۲)

اقبال کا شاہین

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کی ایک ایسی علامت کو شامل کتاب کیا ہے جو ان کی شاعری کا روح رواں ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے زیر نظر مضمون پر تحقیق کے لیے شاہین کی جغرافیائی، تاریخی، ماحولی اور خاندانی حالات کا پتہ لگوانے کے لیے بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ تا کہ معلوم کیا جاسکے کہ اقبال نے اسی پرندے کو اپنی فکر کا حصہ کیوں بنایا۔ فارسی اور اردو کلام دونوں میں شاہین کی رمز غالب نظر آئی

ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

''یوں تو علامہ اقبال کی شاہین پر مختلف تحریریں اقتباسات، اقبالیات کے دامن میں نظر آتیں ہیں۔ لیکن یہ پہلی تحقیقی تحریر ہے جس میں علامہ کے ۱۶۳ اشعار کو شامل کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر کل فارسی اور اردو اشعار جن کی تعداد ۱۰۶ ہے۔ زیر مطالعہ اور بحث قرار دیئے گئے ہیں۔'' (۳۰۳)

علامہ اقبال سے قبل مختلف شعراء نے مختلف پرندوں کو موضوع بنایا ہے۔ لیکن اقبال کوئی عام شاعر نہ تھے کہ وہ ان پرندوں کو علامت کے طور پر استعمال کرتے۔ ان کو ایسے پرندے کا انتخاب کرنا تھا جو انسان کی کامیاب زندگی کے لیے مستقل راہ بن سکے علامہ اقبال کا خواب تھا کہ ملت اسلامیہ دنیا کی دوسری قوموں میں اس طرح زندگی بسر کرے جیسے شاہین پرندوں کی دنیا میں سب سے الگ۔ اقبال کی شاعری میں جو موضوعات پہلے سے تھے اب ان میں شاہین بھی شامل ہو گیا۔ چنانچہ خودی، بیخودی، تصوف، جہاد، اجتہاد اور مرد مومن کے ساتھ شاہین بھی فکری تخیل کا حصہ بن چکا تھا۔ شاہین بے شک ایک پرندہ ہے اور میں نے اسے اپنے اشعار میں ایک علامتی کردار کی حیثیت بھی دی ہے۔ اس کا اندازہ ان عوامل سے ہو سکے گا جن کا تعلق شاہین کی فطری خصوصیات سے ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ وہ خوددار اور غیر مند ہے اور کسی اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ دوسرا یہ کہ بے تعلق ہے آشیانہ نہیں بناتا، سوم یہ کہ بلند پرواز ہے۔ چہارم یہ کہ خلوت پسند ہے اور سب سے آخری بات یہ کہ تیز نگاہ رکھتا ہے۔

اقبال نے ان تمام خصوصیات کو سامنے رکھ کر مرد مومن کا انتخاب کیا۔ کہ اگر یہ تمام خصوصیات مومن کے اندر موجود ہوں گی تو وہ انسانوں کا بادشاہ ہو گا جیسے شاہین پرندوں کا بادشاہ ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ان پرندوں کا ذکر بھی اس مضمون میں کیا ہے۔ جن کی عادات و اطوار شاہین سے مشابہ ہیں۔ جیسے عقاب، شہباز، اور دریائی عقاب وغیرہ۔ اقبال کی شاعری کے بیشتر شعر وہ ہیں جن کے ذریعے اقبال حرکت اور حرارت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ قوم کے بہت سے گراں بہا متاع عزیز کو مستی گفتار کی بجائے مستی کردار کا علمبردار دیکھنے کے خواہاں ہیں ان کی شاعری میں جہاں کہیں شاہین کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں ان کا اشارہ نژادنو کی جانب ہے۔ اقبال کا مقصد مسلمانوں میں شاہین کی

خوبیوں کو دیکھنا ہے۔ ''اقبالیات کے چند خوشے'' میں ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے بہت ہی عمدہ کہانی کے ذریعے شاہین کی صفات کو اجاگر کیا ہے۔ شاہین اور چیل میں کچھ کھٹ پٹ تھی۔ شاہین بھی چیل کی طرح ایک پرندہ ہے مگر گھونسلا نہیں بناتا اور اونچی چوٹیوں میں بسیرا کرتا ہے۔ پرواز اس قدر بلند ہے کہ نظریں احاطہ نہیں کر سکتیں زیادہ وقت پرواز میں ہی گزارتا ہے۔ اپنے بچوں کو چیل اور کوئے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتا۔ ایک دن شاہین شکار کے لیے پرواز کر گیا تو چیل نے اس کے بچے کو اٹھالیا۔ شاہین شکار کے بعد واپس آیا تو سخت پریشان ہوا کہ بچہ اڑ تو نہ سکتا تھا پھر کہاں گیا یا تو گر گیا یا پھر کسی پرندے کی خوراک بن گیا۔ اچانک اس کے ذہن میں چیل کا خیال آ گیا۔ جب شاہین چیل کے گھونسلے کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہے۔

''چیل ایک مرے ہوئے پرندے کو اٹھا لائی ہے اس کی بدبو دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ مگر چیل کے بچے لطف لے لے کے کھا رہے ہیں شاہین کا بچہ خاموش بیٹھا ہے چیل آہستہ آہستہ اسے سمجھا رہی ہے۔ اس روٹھے ہوئے بچے کو منا رہی ہے اور بار بار مردار کھانے کو کہہ رہی ہے۔ لیکن بچہ ماننے کو تیار نہیں وہ کہہ رہا ہے میں کبھی مردار نہیں کھاؤں گا۔'' (۳۰۴)

چیل شاہین کے بچے کو ہر بہانے کے ذریعے راضی کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جب چیل نے بے حد مجبور کر دیا تو شاہین کے بچے نے مقابلے کی ٹھان لی۔ شاہین نے بات بڑھتے ہوئے دیکھی تو مقابلے کے لیے اتر آیا چیل نے جب شاہین کو دیکھا وہ اس کی جرأت کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی چنانچہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئی۔ ڈاکٹر انعام الحق مزید تحریر کرتے ہیں:

''شاہین کو دیکھ کر چیل اُڑ گئی اور اس کے بچے چیں چیں کرنے لگے۔ شاہین نے چیل کے بچوں کو کہا وہ پرندوں میں بادشاہی کرتا ہے کمزور دل کو کیوں ستانے لگا۔ اس نے اپنے منے کو اٹھایا اور اپنی راہ لی۔'' (۳۰۵)

اگر شاہین کا بچہ چیل کے بچوں کے ساتھ رہتا تو آہستہ آہستہ ان کی صحبت میں ان جیسا ہی بن جاتا۔ اس کہانی کے ذریعے دیکھا جائے تو ڈاکٹر انعام الحق نے ہر ہر جگہ شاہین کی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے اقبال یہ بھی دکھانا چاہتے تھے کہ فریب خودرگی اور صحبت بد کے اثرات سے طلباء، دانشور، رہنما

،حکمران سب کے سب شاہبازی کے طریقوں سے دور ہٹ جاتے ہیں:

اقبال نے ہمیشہ اپنی زوال آمادہ قوم کو جھنجھوڑا ہے اور آرام طلبی کی جگہ حرکت کا سبق دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ مسلمان تو حسب ونسب اور خیالات وافکار کے لحاظ سے شہ لولاک کا شاہین ہے۔

تیرا اندیشہ افلاکی نہیں ہے
تیری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری
تیری آنکھوں میں بے باکی نہیں ہے
تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغ دیدہ افلاک ہے تو
تیرے صیدزبوں فرشتہ وحور
کہ شاہین شہہ لولاکؑ ہے تو(۳۰۶)

(۳۰۷)

اقبال نوجوان نسل میں شاہین کی خوبیاں دیکھنے کے خواہاں تھے اقبال کا خواب تھا کہ مسلمان تیز نگاہ بن جائیں۔ بلند پروازی کو اپنائیں۔ خودداری ان کی صفت اعلیٰ ہو۔

توشاہین ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں(۳۰۸)

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور(۳۰۹)

اقبال چاہتے تھے کہ مسلمان بلوچستان کے خانہ بدوشوں کی طرح فطرت کے قریب رہ کر زندگی گزاریں جیسے شاہین آشیانہ نہیں بناتا اور کسی ایک جگہ کو ٹھکانہ نہیں سمجھ لیتا۔

گزرا وقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہین کے لیے ذلت ہے کار آشیاں بندی(۳۱۰)

نہیں ترا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں (۳۱۱)

ڈاکٹر تقی عابدی نے یہاں بہت ہی خوبصورت علت بیان کی ہے کہ آخر کیوں اقبال کو شاہین کی مثال دے کر مسلمانوں کو خبر دار کرنا پڑا۔

"جامعہ اسلامی میں شہنشاہی نظام جاگیرداری نظام، خانقاہ مزاجی، اور دریوزہ گری کا رواج عام تھا۔ ہر شخص کام وکاج سے کتراتا تھا۔ اور قضاو قدر کا بہانہ کر کے مفت خوری میں مبتلا تھا۔ ہر شخص کی آنکھیں دوسروں کی مال و دولت پر جمی ہوئی تھیں۔ جب کہ دنیا کی دوسری اقوام دِن دوگنی رات چوگنی ترقیاں کر رہی تھیں اور محنت و مشقت ان کا شیوہ تھا۔ اس خوابیدہ قوم کو جگانے کے لیے علامہ نے شاہین صفت کردار کو اپنانے کی پیش کش کی تا کہ مسلمان دوسروں کے محتاج نہ رہیں اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت وعزت دوبارہ حاصل کر سکیں۔" (۳۱۲)

نگاہ عشق دِل زندہ کی تلاش میں ہے
شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں
پھرا فضاؤں میں گرگس اگرچہ شاہین وار
شکار زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا
روز زاغ و گرگس اندر خاک گور
رزق بازاں در سواد ماہ و ہور (۳۱۳)

اقبال کی فکر اس تیسرے شعر سے خوب عیاں ہوتی ہے جب اقبال کہتے ہیں:

"کوے اور گیدڑ کا رزق قبر کی خاک میں ہے لیکن باز کا رزق چاند اور سورج کی جستجو میں چھپا ہے۔" (۳۱۴)

مزید آگے چل کر اقبال شاہین کو پرندوں کی دنیا کا درویش قرار دیتے ہیں اور مسلمانوں میں بھی اسی درویشی اور فقر کی خصوصیات پیدا کرنا چاہتے ہیں:

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہین بناتا نہیں آشیانہ (۳۱۵)

درویش کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے مقصد کی خاطر ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتا رہتا ہے کسی ایک جگہ کو اپنا مسکن تصور نہیں کرتا۔ کسی ایک جگہ بیٹھ جانا اس کے لیے دشواریاں پیدا کر دیتا ہے۔ یہی درویشی فقر کہلاتی ہے تفسیر اقبال میں بہار آلہ آبادی تحریر کرتے ہیں

''قرآن جس فقر کی تعلیم دیتا ہے کوئی شخص وہ اپنے اندر پیدا کرلے تو کائنات پر حکمراں ہو جائے قرآنی فقر موسیقی اور رقص و سرود کا نام نہیں ہے۔۔۔ مسلمان میں یہ شان پیدا ہوتی ہے تو خشکی اور تری یعنی ساری دنیا میں ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے زندگی کے متعلق کافر کا یہ زاویہ نگاہ راہبانہ ہوتا ہے مسلمان کا زاویہ نگاہ مجاہدانہ اور وہ شہادت کو زندگی سمجھتا ہے۔'' (۳۱۶)

اقبال کی اصطلاح میں اگر انسان کے اندر شان فقر پیدا ہو جاتی ہے تو وہ غیر معمولی طاقت کا مالک بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

''خلوت پسندی، اندیشہ گیری اور خودشناسی انسانی اقدار کی اعلیٰ صفتیں ہیں اس سے انسانی جوہر آشکار ہوتا ہے اور ایک بے ذرا بوزر بن جاتا ہے علامہ کا مردِ مومن ان صفات سے مبرہ ہے محافل شعر و رقص درباری اجلاس و جلوس بزم عیش و نوش، خانقاہوں کے رسومات، میخانوں کے حکایات اور میلوں عروسوں کے خرافات جامعہ اسلامی کے لیے افیون کا مرض بن چکے تھے اور علامہ اُس نشہ کو خلوت ترشی سے کاٹنا چاہتے تھے۔ چنانچہ شاہین کی خلوت پسندی کی مثال لے کر ملت اسلامیہ کو خلوت گری خودشناسی اور خودی پر غور کرنے کی دعوت دی۔'' (۳۱۷)

اقبال اسلام کی طرح خلوت پسند ہونے کا پیغام دیتے ہیں۔

مجو انجمن مثل آہو و میش
یہ خلوت گرا چون بنا کان خویش (۳۱۸)

ہرن اور بھیڑوں کی طرح گلہ کی تلاش میں نہیں رہنا چاہیے بلکہ اسلاف کی طرح خلوت پسند ہونا ضروری ہے۔ مسلمانوں کے لیے وہ دور زریں تھا جب ان کے اندر فکر اور تدبر عام تھا۔ لیکن یونہی مسلمانوں نے غور وخوض اور سمجھ بوجھ کو پس پشت ڈال دیا وہ زوال کا شکار ہو گئے۔

شاہین بلند پروازی کرتے ہوئے بھی گھاس اور پاتال میں موجود ٹڈی کو دیکھ سکتا ہے سمندر کی تہہ میں مچھلی کو شکار بنا سکتا ہے تو مسلمان سمندر کی تہہ سے گوہر کیوں نہیں نکال سکتے۔

فیض فطرت نے تجھے دیدہ شاہین بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش
افسوس صد افسوس کہ شاہین نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
یہ مانا اصل شاہینی ہے لیکن
تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے
چیتے کا جگر چاہیے شاہین کا تجس
جی سکتے ہیں بے روشنی دانش فرنگ

شاہین دلیری کی علامت ہے مرد مومن کے اندر بھی یہی غیور اور بہادری ہونی از حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس پرندے پر خاصی تحقیق کے بعد اس کی جسامت کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا وزن ۴۔۵ پونڈ سے بھی کم ہوتا ہے۔ اس کے بدن کی لمبائی ڈیڑھ دو فٹ کے لگ بھگ ہوتی ہے جب کہ شاہین غزالہ بکریوں اور بھیڑوں کا بھی شکار کرتا ہے۔

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے یہ بہانہ (۳۱۹)

انسان کے اندر اگر شاہین کی خصوصیات پیدا ہو جائیں تو وہ مرد کامل بن جاتا ہے جو کہ موت سے کبھی نہیں ڈرتا اقبال نے اس فلسفے کو اشعار کی شکل دی ہے۔

می فتد مرگ آں مرد تمام
مثل شاہینی کہ افتد بر حمام

سینہ ای داری اگر درخوردتیر
درجہاں شاہین بزی شاہین بمیر(۳۲۰)

مومن کی نشانی ہے کہ وہ موت پر شاہین کی طرح جھپٹتا ہے جس طرح وہ کبوتر پر جھپٹتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ شاہین کی طرح دلیری کی زندگی گزار دے اور شاہین کی طرح ہی موت کا انتخاب کرے۔ دلیر اور غیور انسان کی طرح جیئے خودداری کے ساتھ سر اٹھا کر چل سکے۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو سران غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزال تاتاری
عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہم ساز
کہ نیستان کے لیے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو کر دیا شیوہ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری
نگاہ ہم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو
یہ بے کلاہ ہے سرمایہ کلہ داری

ڈاکٹر فرمان فتح پوری ان اشعار کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال کے یہاں فرزند کہستانی یا نژادنو کا ایک اور نام بھی ہے اور وہ ہے شاہین بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اقبال نے اپنے کلام میں اپنے مثالی نوجوان کو عموماً اسی نام سے پکارا ہے اس لیے کہ ایک نوجوان میں وہ جس قسم کے مردانہ اوصاف دیکھنے کے آرزومند ہیں وہ انہیں شاہین میں نظر آتے ہیں۔'' (۳۲۱)

اقبال نے یہ شاعرانہ تشبیہ محض استعمال نہیں کی ہے بلکہ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں خود دار غیرت مند اور ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ بے تعلق ہے، آشیانہ

نہیں بناتا۔ چنانچہ اقبال نے اس کی صفات کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے لیکن اس ذکر سے ان کی مراد نوجوانوں ہی کی سیرت و کرداری کو اجاگر کرنا ہے۔

جوانوں کو مری آہ و سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کر دے
شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا (۳۲۲)

(۳۲۳)

بال جبریل میں موجود نظم شاہین میں خود وہ اپنی زبانی اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ اس کا مسلک جارحیت نہیں، بے نیازی و درویشی ہے جس کا تعلق رہبانیت سے نہیں فقر اسلامی سے ہے۔

یہ یورپ یہ پچھم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ (۳۲۴)

شعر اقبال میں سید عابد علی عابد تحریر کرتے ہیں:

"ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال اپنے شاہین کو بادشاہوں سے بہت دور رکھنا چاہتے ہیں۔ اور آزادی کی قدر شاہین کی حیات میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔" (۳۲۵)

اقبال کو نوجوانوں سے بے حد توقعات وابستہ تھیں۔ اقبال کو یہ بھی معلوم تھا کہ جوانی تجربے اور تدبر سے کم وبیش عاری ہوتی ہے لیکن ذوق عمل کی بے پناہ قوتیں اپنے اندر مخفی رکھتی ہے اسی لیے اقبال یہ دعا کرتے دکھائی دیتے ہیں

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
میرا عشق میری نظر بخش دے

مرے دیدہ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

امنگیں مری آرزوئیں مری
امیدیں مری جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
میرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے(۳۲۶)

ڈاکٹر تقی عابدی پرندہ شناسی محقق زینو۱۹۶۳ کی تحقیق کے متعلق لکھتے ہیں کہ شکار اور جنگوں میں سب سے پہلے چار ہزار سال قبل شاہین کو ہی استعمال کیا گیا۔عرب، ایران، افریقہ اور یورپ میں اسی پرندے کو استعمال کیا گیا۔علامہ بھی یہی چاہتے تھے کہ مسلمان شاہین کی طرح ہوشیار بن کر زندگی بسر کریں جس طرح شاہین دوسرے پرندوں کا شہباز ہے اسی طرح مسلمان کو چاہیے کہ دوسری اقوام کے سردار بن کر زندگی بسر کریں۔

برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر
یہاں فقط سر شاہین کے واسطے ہے کلاہ

شاہین ایک ہی ضرب میں اپنے شکار کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے اس کے جھپٹنے کی رفتار ۱۲۵ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے اس کے پر بادشاہوں کے سر کا تاج بنتے ہیں۔اقبال بھی بادشاہوں کی طرح بلند مرتبہ نوجوان دیکھنا چاہتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ دوسرے تمام لوگ مسلمانوں کی روایت اور اسلامی اصولوں سے فائدہ اٹھا کر آگے نکلتے جا رہے ہیں اور مسلمان ان سے کنارہ کشی کر کے روز بروز گرتے جا رہے ہیں۔

زاغ و دشتی ہو رہا ہے ہمر شاہین و چرغ
کتنی سرعت ہے بدلتا ہے مزاج روزگار

کتنی سرعت ہے بدلتا ہے مزاج روزگار
درّاج کی پرواز میں ہے شوکت شاہین

حیرت میں ہے صیاد یہ شاہین ہے کہ دراج
شاہین کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار
کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغان سحر خیز
زندگی سوز و ساز بہ زسکون دوام
فاختہ شاہین شود از تپش زیر دام

اقبال اپنی ساری شاعری کی توانائی نئی نسل کی تعمیر اور تربیت پر صرف کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ مگر نئی نسل شاہینی صفات رکھتے ہوئے بھی اپنے مکتب مدرسے خانقاہ اور گھریلو ماحول کبوتر صفت درّاج مزاج اور کبک خرام بنا رہے ہیں۔

اُسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا ہوں برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہین زیرِ دام آیا
ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہین بچے کو صحبت زاغ (۳۲۷)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے شاہین کو واضح کرنے کے لیے چند اشعار کو پیش کیا ہے تا کہ اقبال کی فکر کو واضح کیا جا سکے۔ اقبال نے یہ علامت محض شاعری میں شہرت حاصل کرنے کے لیے استعمال نہ کی تھی بلکہ وہ اس رمز کے ذریعے امت مسلمہ کو دلیر اور انسان کامل جیسی صفات سے ممیز کرنا چاہتے تھے۔

علامہ اقبال پر تہمت شراب نوشی

دنیا میں جتنی بھی عظیم شخصیات گزری ہیں ان پر متعدد الزامات لگائے گئے ہیں۔ تاریخ نے کسی کو بھی نہیں بخشا۔ علامہ اقبال بھی ان الزامات سے بری نہیں رہے۔ سرکش ملاؤں نے اقبال پر کفر کا

فتویٰ عائد کیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے بھی اقبال کی زندگی کے اسی پہلو کو مدنظر رکھا ہے۔ کیونکہ اگر کسی معتبر شخصیت پر رکیک فعل کا الزام لگایا جائے تو اس کا سدباب کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ تاکہ مستند حوالاجات کی روشنی میں حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

''علامہ اقبال پر ابو محمد دیدار علی خطیب مسجد وزیر خان نے کفر کا فتویٰ صادر کیا۔ بہت سے نام نہاد علماء اور مولویوں نے ملحد، زندیق، ہوس راں، عیاش اور غنائی کے علاوہ شرابی جیسے الزامات کے انبار لگائے کیوں کہ یہ کم عقل ملا علامہ کی روشن فکری سے خوف زدہ تھے جس سے اُن کے ریاکارانہ افعال کی نقاب کشی ہو رہی تھی۔'' (۳۲۹)

ڈاکٹر تقی عابدی مستند حوالوں کے ذریعے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ علامہ نے عمر بھر شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ حقیقت ہے کہ علامہ کو آواز اور ساز سے بچپن سے خاص شغف تھا۔ اقبال درون خانہ میں خالد نذیر صوفی تحریر کرتے ہیں:

''خود انہیں قوالی وغیرہ سننے کا شوق تھا اور وہ ستار بھی بڑی اچھی طرح بجاتے تھے ایک شاعر کے لیے اچھی موسیقی کا دِل دادہ ہونا قدرتی امر ہے۔'' (۳۳۰)

علامہ نے کالج کی تحصیل کے دوران ہی ستار خریدا تھا اور کسی خاص استاد سے مہارت حاصل بھی کی تھی ستار سے اس حد تک لگاؤ تھا کہ عمر کے آخری حصے تک یہ شوق مسلسل رہا۔ علامہ اقبال کو نغموں اور مجروں سے بھی دلچسپی تھی۔ یہ محفلیں اردو اور فارسی اساتذہ کی غزلیات اور موسیقی کی آلات سے بجی ہوتی تھیں۔ ان محفلوں میں رقص اور شراب عام ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ کسی بھی فرد کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اقبال بھی رقص اور شراب کا استعمال کرتے ہوں گے۔ ذکر اقبال میں عبدالمجید سالک نے اقبال پر رنگ رلیاں منانے کا الزام لگایا ہے۔

''رنگ رلیوں کا ذکر آ گیا تو یہ بھی سن لیجئے کہ اقبال عنفوان شباب میں اپنے عہد کے دوسرے نوجوانوں سے مختلف نہ تھے۔ بلاشبہ وہ مصری کی مکھی ہی رہے۔ شہد کی مکھی کبھی نہ بنے۔'' (۳۳۱)

بلاشبہ اقبال قوالی کے دلدادہ تھے اور تھیٹر سے بھی لگاؤ رکھتے تھے اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا ہے کہ علامہ اقبال ایک انتہائی دین دار اور باشرع گھرانے میں پیدا ہوئے۔ جس میں نیکی، پارسائی عفت اور پاکیزگی کی قدریں بلند تھی علامہ اقبال کی زندگی پر طائرانہ نظر ڈالنے سے شعائرِ اسلام سے ان کی بے پناہ محبت اور خدا اور رسول مقبولؐ سے والہانہ محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے جس شخص کو بچپن ہی سے انتہائی پاکیزہ ماحول اور نیکی سے بھرپور فضا میسر آئی ہو اور انتہائی نیک اصحاب نے تربیت دی اور پروان چڑھایا ہو اس سے شراب نوشی اور رنگ رلیاں منانے جیسی لغزشوں کی امید نا قابل تعین ہی نہیں بلکہ نا قابل فہم بھی ہے۔ اقبال درون خانہ میں خالد نذیر صوفی اپنی والدہ وسیمہ بیگم کے توسط سے بیان کرتے ہیں۔

> ''جب کہ والدہ صاحبہ فرماتی ہیں کہ وہ بلا روک ٹوک حضرت علامہ کے کمرے میں چلی جایا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے باہر جانے کے بعد ان کے کمرے کی پوری طرح تلاشی لیا کرتی تھیں تاکہ کوئی ایسی کتاب مل جائے جو ابھی پڑھی نہ ہو۔ ان حالات میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت علامہ روزانہ رات کو سونے سے بیشتر ایک بوتل شراب پیا کرتے تھے تو وہ خالی بوتل آخر کہاں ہوتی تھی علامہ صاحب کے پاس کونسا جن تھا جو رات کو سونے سے پہلے ان کو شراب پیش کیا کرتا تھا اور پھر خالی بوتل اپنے ہمراہ لے جاتا تھا۔'' (۳۳۲)

اس سلسلے میں اقبال درون خانہ میں وسیمہ بیگم نے چند واقعات بھی بیان کیے ہیں جو اس بات کی نفی کرتے ہیں کہ اقبال نے کبھی شراب کا استعمال نہیں کیا۔ اقبال اپنے کمرے میں اپنے دوست احباب سے حیدر آباد دکن کے واقعات بیان کر رہے تھے۔ حالات سفر بتاتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ حیدر آباد کے وزیر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد نے رات کے کھانے کی دعوت دی کھانے کے بعد ناچ گانا شروع ہوا اور جام چھلکنے لگا۔ دوست احباب نے پوچھا کہ کیا آپ نے بھی شوق فرمایا تو اقبال نے بلا تامل جواب دیا۔

> ''نہیں بھائی! میں محفل سے اٹھ گیا کیونکہ سب جانتے ہیں کہ میں

نے کبھی شراب نہیں پی۔'' (۳۳۳)

اقبال کو جب دردِ گردہ کی شکایت ہوئی تو ڈاکٹروں نے برانڈی کا ایک پیگ بطور دوا تجویز کیا لیکن علامہ اقبال نے اس سے صاف انکار کر دیا اور فرمایا:

''قیام یورپ کے دوران بھی جس چیز کو میں نے کبھی منہ نہیں لگایا اب اس معمولی سی تکلیف کے لیے کیسے استعمال کر سکتا ہوں۔ اور میں تو موت سے بچنے کے لیے بھی کسی حرام چیز کا سہارا لینے کا روا دار نہیں ہو سکتا۔'' (۳۳۴)

اگر علامہ اقبال کو شراب کی عادت ہوتی تو وہ دوا کے طور پر بھی اس کا استعمال کرنے میں گریز نہ کرتے۔ اقبال کا دیرینہ خادم علی بخش بھی اک ایسا قصہ بیان کرتا ہے جو یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ اقبال کو شراب اور شراب پینے والوں سے سخت نفرت تھی۔ ایک دفعہ ایک سکھ علامہ صاحب سے ملنے آیا اور آتے ہی مجھ سے ایک گلاس مانگا۔ گلاس کے آتے ہی سکھ نے جیب سے شراب کی بوتل نکالی اور غٹا غٹ پی گیا۔ اقبال کو یہ دیکھ کر سخت غصہ آ گیا۔ اور مجھے گرج دار آواز میں یوں ڈانٹا۔

''علی بخش! تم نے اس کم بخت کو گلاس کیوں دیا اور جب یہ شراب پینے لگا تھا تو اسے منع کیوں نہیں کیا؟ اب یہ گلاس باہر پھینکو اور اس بدتمیز کو یہاں سے نکال دو۔'' (۳۳۵)

ہماری سوسائٹی میں ایسے بہت سے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اپنا تعلق اقبال سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ خود اقبال کو شراب لا کر دیتا تھا اور کوئی خود پیش کرنے کا دعویٰ کرتا ہے ایسے لوگوں کا مقصد صرف اقبال کی شہرت پر داغ لگانا ہے حیات اقبال کے اس گوشے کا مطالعہ کیا جائے جس میں انہوں نے یورپ کا سفر کیا تھا تو معلوم ہوگا کہ اقبال نے کبھی وہاں گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا تو شراب جیسے ناپاک فعل کو کیسے سرانجام دے سکتے تھے۔ ازدواجی زندگی کے ذہنی قرب سے تنگ آ کر اقبال نے عطیہ فیضی کو لکھا۔

''اس لیے اب واحد علاج یہ ہے کہ میں اس بدبخت ملک کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں یا پھر شراب نوشی میں پناہ ڈھونڈوں کہ خودکشی کا مرحلہ

آسان ہو جائے۔" (۳۳۶)

یہ خط اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اقبال ۱۹۰۹ء تک شراب نوش نہ تھے بلکہ شراب نوشی کو خودکشی کے مترادف قرار دیتے تھے۔ قیام یورپ کے دوران اقبال نے ہر اس چیز سے پرہیز کیا جو اسلام کی رو سے حرام تھی۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے آئینہ اقبال سے بھی عبداللہ قریشی کی زبانی ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ کہ ایک دفعہ اقبال کے دوست فوق ان سے ملنے آئے تو اقبال کتابوں کو آگے پیچھے کر رہے تھے۔ فوق نے اقبال سے پوچھا کہ وہ کیا ڈھونڈ رہے ہیں تو اقبال نے جواب دیا کہ انگور کی شراب ان کتابوں کے پیچھے چھپائی تھی اسے ڈھونڈ رہا ہوں کیونکہ کل شمس العلماء مفتی عبداللہ میرے پاس آئے تھے۔ یہ محض ایک طنزیہ مذاق تھا اس طرح کا ایک اور لطیفہ روایات اقبال کے توسط سے ڈاکٹر تقی عابدی نے تحریر کیا ہے کہ ایک بار میاں شاہ دین نے گھر ایک محفل ضیافت سجائی اور انگریزوں کے لیے علیحدہ کمرے میں خورد و نوش کا انتظام کیا گیا جب اقبال اور مرزا جلال الدین کو میاں شاہ دین نے آتے دیکھا تو بولے کہ آپ دونوں کے لیے علیحدہ کمرے میں انتظام کیا گیا ہے تو اقبال نے ہنس کر کہا کہ ہم نے آپ سے دو ہی باتیں سیکھی ہیں ایک یہ کہ چھپا کر پیو اور دوسرا اپنے گناہ میں کسی کو شریک نہ کرو۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے یہاں، بہت ہی خوبصورت بات کہی ہے

"اسی طرح کے کئی شوخیانہ اور طنزیہ جملوں کو سن کر دشمن اور کینہ صفت افراد نے اقبال کو مے گسار ثابت کرنے کی کوشش کی جس کا اثر اقبال کے چند ناداں حامیوں پر بھی پڑا۔" (۳۳۷)

عبدالمجید سالک نے اقبال پر شراب نوشی کا الزام ایک واقعہ کو سامنے رکھ کر لگایا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں لٹی لاج میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا اقبال اس مشاعرے میں بھی مدعو تھے۔ سالک بھی اس مشاعرے میں موجود تھے مگر اقبال اور سالک سب سے پہلے آ چکے تھے تو اقبال نے حقہ مانگا۔ سالک صاحب نے پوچھا کہ آپ حقہ کیوں نہیں چھوڑ دیتے اقبال نے اپنے مزاج کے مطابق مسکرا کر جواب دیا کہ دوست شراب تو چھوڑ چکا ہوں اور آپ چاہتے ہو کہ حقہ بھی چھوڑ دوں جب سالک کے بغیر وہاں کوئی گواہ موجود نہ تھا تو اس واقعے کا کیسے تعین کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

''بہر حال جس جملہ کا کوئی گواہ اور شاہد نہ ہو اور دوسری طرف ایک شوخیانہ طبیعت جو ہزار اشاروں میں بات کرنے کا فن جانتی ہے تو اہل فکر کے نزدیک یہ مسئلہ خود بہ خود مشکوک اور بے اساس ہو جاتا ہے۔'' (۳۳۸)

یہ بجا ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری میں مئے خوری جیسے الفاظ ضرور استعمال کیے ہیں لیکن اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ اقبال شراب نوش تھے۔ غلام مصطفیٰ تبسم اور عبدالمجید سالک نے چند شعر اس ضمن میں بیان بھی کیے ہیں۔ لیکن شراب طہورہ جام تصوف بادہ عرفان بے خودی اور قلندری کو شراب نوشی کی سند تصور نہیں کیا جاسکتا۔ عطار، سعدی، حافظ، خسرو اور میر تقی میر بھی اس شراب سے بری نہیں تھے۔

عشق با مرغولہ موہان باختم	مدتی بہ لالہ رویاں ساختم
ہر چراغ عاقبت دامان ذوم	بادھا با ماہ سیمابان ذوم
ایں ذر راز دامانم زریخت	ایں شراب از شیشہ جام زریخت

عبدالمجید سالک نے اقبال کے چند اشعار کو بنیاد بنا کر اتنی بڑی بات کہہ ڈالی۔ جب کہ وہ جانتے تھے کہ اقبال جیسی شخصیت کسی بھی وقت کوئی بھی بات کر سکتی ہے۔ جس کو سمجھنا آسان نہیں ہے اہلِ فکر اس کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں عبدالمجید سالک ان اشعار کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

''علاوہ بریں مثنوی ''رموزِ بیخودی کے آخر میں حضور رحمۃ العالمین'' میں عرض حال کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ میں مدتوں عشق مجاز اور اس کے متعلقات میں مبتلا رہا لیکن یہ آرزو میرے سینے میں برابر آباد رہی کہ میری موت حجاز میں ہو۔'' (۳۳۹)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے اس مضمون میں چند ایک حکایات بھی بیان کی ہیں جو اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ اقبال ہر گز شراب نوش نہ تھے ڈاکٹر تقی عابدی جواہر اقبال کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

''ایک مولوی صاحب جو پروفیسر آرنلڈ سے علی گڑھ کالج سے متعارف تھے سیر و سیاحت کے لیے لندن پہنچے پروفیسر آرنلڈ نے اقبال سے

خواہش کی کہ مولوی صاحب کو لندن کی مکمل سیر کروائیں علامہ نے مولوی صاحب کو تمام روز لندن کی سیر کروائی اور پھر شام کو ایک ریسٹورنٹ لے گئے جہاں چند ناچنے والی لڑکیوں نے مولوی صاحب کو گھیر لیا کسی نے ناز و عشوہ سے قہوہ پلایا کسی نے داڑھی پر دست نوازش پھیرا اور کسی نے مولوی کے چہرے پر لپ اسٹک کا نشان چھوڑ دیا جس پر مولوی صاحب بہت بگڑے اور آرنلڈ سے اقبال کی شکایت کی۔ جب آرنلڈ نے اقبال سے اس کی وجہ پوچھی تو اقبال نے کہا کہ میں نے آپ ہی کے کہنے کے مطابق مولوی صاحب کو لندن کی زندگی کے دونوں رُخ دکھائے تاکہ مولوی صاحب کو سکہ کے دونوں رخوں کا علم ہو سکے۔" (۳۴۰)

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ڈاکٹر تقی عابدی نے ابولیث صدیقی کے توسط سے بیان کیا ہے کہ اقبال رقص و سرود کی محفل میں شریک ضرور ہوتے تھے مگر نام نہاد مولوی بھی ان محفلوں کا لطف اٹھاتے تھے اگر ان کی نظر میں اقبال مسلمان نہ تھے تو یہ نام نہاد مولوی وہاں کیا کرنے جاتے تھے۔

"جب اقبال مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ گئے تھے وہاں جب شام کو اقبال کسی محفل نغمہ و رقص میں پہنچے تو وہاں ایک مولوی صاحب بھی پہلے سے موجود تھے جو فوراً اقبال کو دیکھ کر فرار ہو گئے۔ لیکن اپنا شناختی کارڈ بھول گئے جس کو علامہ نے ایک نامہ بَر کے ذریعے صدر کانفرنس کے توسط سے مولوی صاحب تک پہنچایا جس میں لکھا تھا چونکہ میرے پاس مولوی صاحب کا ایڈریس نہیں ہے اس لیے یہ شناختی کارڈ آپ کے توسط سے پہنچا رہا ہوں جسے مولوی صاحب نے محفل نغمہ و رقص میں چھوڑ دیا تھا۔" (۳۴۱)

ڈاکٹر تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق اقبال بہت ہی زندہ دل انسان تھے۔ رقص و سرود کی محفلوں میں اس وجہ سے شرکت کرتے تھے کہ وہاں اردو اور فارسی کے اساتذہ کی غزلیات کو ترنم کے ساتھ پڑھا جاتا تھا اور اقبال موسیقی کے دلدادہ تو پہلے ہی تھے۔ سید فقیر وحید الدین روزگار فقیر میں تحریر کرتے

ہیں کہ فقیر سید نجم الدین طاؤس بہت اچھا بجاتے تھے۔ اقبال یہ چاہتے تھے وہ ان کے گھر میں آکر طاؤس بجایا کریں۔ مگر فقیر سید نجم الدین صرف طاؤس کے شوقین تھے باہر جا کر طاؤس نہیں بجاتے تھے۔ نجم الدین مان گئے اور اقبال کے گھر پر محفل خوب جمی۔ فقیر نجم الدین تیس سال سے طاؤس بجا رہے تھے۔ روزگار فقیر میں سید وحید الدین بیان کرتے ہیں:

''اس فن میں انہیں خاصی شہرت حاصل تھی انہوں نے بہت دیر تک طاؤس بجایا درباری مالکوس اور ایمن ان کے پسندیدہ راگ تھے جسٹس آغا حیدر اور ڈاکٹر صاحب اس نغمہ سرائی سے بہت محظوظ ہوئے اور یہ محفل بڑے کیف کے عالم میں برخاست ہوئی۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب خود بھی ستار نوازی کے شائق تھے اور ان کے تار بجانے کی مضراب ڈاکٹر جاوید اقبال کے پاس کافی دنوں محفوظ رہی۔'' (۳۴۲)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے اس مضمون میں عطیہ فیضی اور اقبال کے تعلقات کو بھی موضوع بحث بنایا ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اقبال ذہنی کرب کا شکار تھے اور ایسے میں انسان شراب نوشی میں ہی پناہ ڈھونڈتا ہے یہاں ڈاکٹر تقی عابدی نے عطیہ فیضی کے ساتھ ساتھ تین عورتوں کا ذکر کیا ہے جن سے اقبال کے دوستانہ مراسم رہے ان میں امراؤ بیگم، انبالوی لڑکی رامی اور مس ویگے ناسٹ شامل ہیں۔ لیکن ایسا کچھ نہ تھا کہ اقبال عشق میں ناکام ہو چکے تھے۔ عطیہ فیضی سے اقبال کو عشق نہ تھا۔ اقبال درون خانہ میں تحریر کرتے ہیں:

''یہ ایک حقیقت ہے کہ علامہ اقبال عطیہ بیگم کو ایک علمی دوست کی حیثیت سے تو پسند کر سکتے تھے لیکن بیوی کے روپ میں وہ ان کے لیے ناقابل قبول تھیں کیونکہ وہ جس قسم کی بیوی کے خواہش مند تھے وہ عطیہ بیگم سے مختلف تھی۔۔۔ صاف ظاہر ہے اقبال عطیہ کی دیرینہ خواہش کو پورا کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔'' (۳۴۳)

اقبال اپنی ازدواجی زندگی سے مکمل مطمئن تھے۔ والدہ جاوید سے شادی کے بعد ان کا کہنا تھا کہ شادی کی وجہ سے ان کو جنت الفردوس مل گئی ہے۔ درون خانہ میں خالد نذیر صوفی تحریر کرتے ہیں:

''یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ علامہ اقبال کبھی بھی آزاد پریوں کی عشوہ طرازیوں کے دل دادہ نہیں رہے اور نہ ہی وہ ان پری وشوں کی کمزوری سے لذت گیر ہونے کے قائل تھے عطیہ بیگم۔ ویگے ناسٹ اور سی شیل جیسی عالم خواتین سے علمی وادبی استفادے ضرور ہوتے رہے لیکن ان ملاقاتوں سے اقبال کی حیات معاشقہ کا مفروضہ تشکیل دینا نا مناسب ہی نہیں ناواجب بھی ہے۔'' (۳۴۴)

ڈاکٹر تقی عابدی نے نہایت ہی عمدگی سے اور مستند حوالوں کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ اقبال شراب نوش نہ تھے بلکہ بہت ہی مذہبی خاندان سے تعلق ہونے کی بنا پر ساری زندگی پارسا رہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مضمون کا اختتام اقبال کی پاک دامنی کے متعلق کہے گئے خواجہ حسن نظامی کے ایک فقرے سے کیا ہے۔

''میرا تقویٰ اور میری پارسائی تیرے ایک لحہ کی فکر و تخیل پر نثار''

ازدواجی زندگی

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے عرفانی زاویے میں اقبال کی ازدواجی زندگی کو بھی موضوع بحث بنایا ہے اس مضمون میں ڈاکٹر تقی عابدی نے بہت ہی سرسری طور پر اقبال کی ازدواجی زندگی کے متعلق بتایا ہے اور صرف گنے چنے الفاظ اور صفحات میں ان کی ازدواجی زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ حوالے کے طور پر عطیہ فیضی کے نام ایک خط کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ پہلی شادی اقبال نے ۱۸۹۳ء میں والدین کے اصرار پر کی تھی۔ پروفیسر غلام حسین ذوالفقار اقبال کا ذہنی و فکری ارتقاء میں بیان کرتے ہیں:

''اقبال کی پہلی شادی ۱۸۹۳ء میں ہوئی جب کہ وہ بیس (۲۰) سال کے تھے ان کی پہلی بیوی جو عمر میں ان سے بڑی تھی گجرات کے ایک معزز خاندان سے تھیں۔ اس بیوی کے بطن سے اقبال کی ایک دختر تھی جو ابتدائی عمر میں فوت ہو گئی اور ایک فرزند آفتاب اقبال تھا۔'' (۳۴۵)

کریم بی اقبال سے تین سال عمر میں بڑی تھیں اور ڈاکٹر عطا محمد کی بیٹی تھی۔ جو مشہور سرجن

تھے۔ کریم بی بی سے معراج بیگم ۱۸۹۶ میں پیدا ہوئیں جو انیس برس کی عمر میں ۱۹۱۵ء میں گجرات میں انتقال کر گئیں تھیں کریم بی بی نے زندگی کا زیادہ حصہ میکے میں ہی گزارا ان کے والد شیخ عطا محمد بہت اونچے عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ ۱۸۸۸ء میں خان بہادر کا اعزاز بھی انگریز سے حاصل کر چکے تھے۔ کریم بی بی کا تعارف کرواتے ہوئے دانائے راز میں سید نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں:

''ان کی بڑی صاحبزادی سے محمد اقبال کی شادی ہوئی شاید جدہ یا کامران میں پیدا ہوئیں۔ وہیں پرورش پائی۔ عربی بولتی اور سمجھتی تھیں'' (۳۴۶)

اس طرح اقبال کے سسر شیخ عطا محمد کے متعلق تحریر کرتے ہیں

''شیخ صاحب بڑے دین دار بڑے عبادت گزار اور نیک انسان تھے۔ حافظ قرآن بھی تھے۔ ۱۸۹۱ء میں کامران سے واپس آئے پنجاب کے مختلف اضلاع میں سول سرجن تعینات رہے۔ ان کا شمار میڈیکل اسکول آف کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے اولین سند یافتہ طلباء میں ہوتا تھا۔'' (۳۴۷)

چونکہ اقبال ابھی میٹرک کے امتحانات دے چکے تھے جب شادی ہوئی۔ تو ایک طرف اقبال کی بارات کھڑی تھی اور ساتھ ہی انٹرنس میں پاس ہونے کی خبر مل گئی۔ عبدالمجید سالک ذکر اقبال میں تحریر کرتے ہیں:

''ابھی انٹرنس کے امتحان کا نتیجہ نہیں نکلا تھا کہ اقبال زنجیر ازدواج میں جکڑ دیئے گئے گجرات میں ایک دولت مند بزرگ خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد رہتے تھے ان کی بڑی صاحب زادی سے رشتہ طے پایا جب بارات سیالکوٹ سے گجرات کے لیے تیار ہوئی سہرا باندھا گیا۔ اقبال گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ تو پاس ہونے کی خبر کی خوشی کا تار آیا۔ اقبال کی پہلی شادی ناکام ہوئی۔'' (۳۴۸)

اقبال کے ذہنی وفکری ارتقاء میں غلام حسین ذوالفقار نے پہلی شادی کے وقت اقبال کی عمر

بیس سال بتائی ہے لیکن زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اقبال کی عمر سولہ سال لکھی ہے اس دوران اقبال نے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر اقبال چار سال کے لیے لاہور چلے گئے اور ہاسٹل میں مقیم رہے۔ اس دوران کریم بی بی زیادہ میکے میں رہتیں اور کبھی کبھار سیالکوٹ آجاتی تھی۔ دونوں بچوں کی پیدائش کے بعد اقبال اور کریم بی بی میں کشیدگی پیدا ہونا شروع ہوگئی تھی۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۰۵ء تک کی پانچ سالہ ملازمت کے دوران جب اقبال بھاٹی دروازے والے مکان میں رہائش پذیر تھے۔ کریم بی بی نے ان کے ساتھ اس مکان میں قیام نہ کیا۔ نذیر نیازی کی رائے میں کریم بی بی سے کشیدگی کی ابتداء انہی ایام میں ہوگئی تھی ۱۹۰۵ سے لے کر ۱۹۰۸ء تک کے تین سال اقبال نے یورپ میں گزارے۔'' (۳۴۹)

یورپ سے واپسی پر بھی کریم بی بی اقبال کے ساتھ رہنے پر راضی نہ تھیں اور نہ طلاق لینے پر آمادہ تھیں اقبال اور کریم بی بی کے درمیان کشیدگی کی چند وجوہات بھی ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مضمون میں شامل کی ہیں ان میں سب سے پہلی وجہ تو متوسط خاندان سے تعلق ہونا شامل تھا۔ کیونکہ اقبال کا گھرانہ معاشی لحاظ سے اس قدر اعلیٰ نہ تھا جس قدر شیخ عطا محمد کا تھا ان کا گھر کسی عالیشان کوٹھی سے کم نہ تھا۔ وہ آسائش جو کریم بی بی کو میکے میں میسر تھیں۔ اقبال کے گھر میں موجود نہ تھیں ڈاکٹر جاوید اقبال زندہ رود میں کشیدگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''افسوس ہے کہ اس شادی کی ناکامی کے حقیقی اسباب بتا سکنے والا آج کوئی بھی نہیں لیکن راقم کے قیاس کے مطابق شادی کی ناکامی کا اصل سبب زوجین کے طبائع کی عدم مناسبت تھا شادی کے وقت اقبال کی عمر سولہ برس اور کریم بی بی کی عمر انیس برس تھی۔'' (۳۵۰)

اقبال معاشی لحاظ سے خود کفیل بھی نہ تھے۔ اور ابھی اپنے بھائی اور باپ کے دست نگر تھے۔ اس بات کا اثر شادی کے کچھ عرصے بعد ان کی ازدواجی زندگی پر نظر آنے لگا تھا۔ اقبال نے ۱۹ اپریل

۱۹۰۹ء کو عطیہ فیضی کو لکھا:

''میں کوئی ملازمت کرنا نہیں چاہتا مری خواہش ہے کہ جلد سے جلد اس ملک سے بھاگ جاؤں اس کی وجہ آپ کو معلوم ہے میں اپنے بھائی کا ایک قسم کا اخلاقی قرض دار ہوں اور صرف اسی چیز نے مجھے روک رکھا ہے۔ میری زندگی نہایت مصیبت ناک ہے۔ یہ لوگ میری بیوی کو زبردستی مجھ پر منڈھ دینا چاہتے ہیں میں نے اپنے والد کو لکھ دیا ہے کہ انہیں میری شادی کر دینے کا کوئی حق نہ تھا بالخصوص جب کہ میں نے اس قسم کے تعلق میں پڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اس کی کفالت کرنے پر آمادہ ہوں لیکن اسے اپنے پاس رکھ کر اپنی زندگی کو عذاب بنانے کے لیے ہرگز تیار نہیں'' (۳۵۱)

اقبال نے نباہ کی بہت کوشش کی تھی کہ کوئی صورت نکل آئے مگر بات نہ بنی۔ والدہ آفتاب کی طبیعت کا انداز بہت سخت تھا۔ یوں حالات بگڑتے چلے گئے شادی کی ناکامی کا زیادہ اثر دونوں بچوں کی تربیت اور شخصیت پر پڑ رہا تھا معراج بیگم اور آفتاب اقبال کے بچپن اور جوانی کا بیشتر زمانہ ماں کے ساتھ ننھیال میں گزارا۔ کچھ بڑے ہوئے تو دادا دادی کے پاس آ گئے۔ یوں زیادہ باپ کی شفقت سے محروم ہی رہے اقبال معراج بیگم سے بہت پیار کرتے تھے ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''معراج بیگم ماں باپ کے تعلقات میں کشیدگی پر اندر ہی اندر کڑھتی رہتیں لیکن کیا کر سکتی تھی۔ بے بس تھیں۔ انہیں جوانی میں ہی خنازیر کا مرض لاحق ہوا۔ اور انیس برس کی عمر میں ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو وفات پا گئیں۔'' (۳۵۲)

ماں باپ کی کشیدگی کی وجہ سے ہی آفتاب اقبال کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ان کی والدہ کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے یوں آفتاب اقبال اور علامہ اقبال میں کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔ یہ ایک ذہنی کرب تھا جو ہر وقت اقبال کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ شادی کی ناکامی کے سبب ہی اقبال کی خداداد صلاحیتوں اور غیر معمولی قابلیت نشوونما پانے کے بجائے گھٹ کر رہ گئی اور اقبال اپنے علم کے وسیع

ہونے کے باوجود وہ نہ بن سکے جو بن سکتے تھے۔ اور ذہنی کیفیت اقبال کو مفلوج کر رہی تھی اسی دوران اقبال یورپ چلے گئے مگر حالات اسی طرح خراب تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں۔

''اس دور میں فراہمی روزگار کے ساتھ اقبال ازدواجی سکون کی تلاش میں بھی سرگرداں تھے۔ یورپ سے واپسی پر ان کی عمر اکتیس (۳۱) برس کی ہو چکی تھی اور پہلی بیوی سے کشیدگی کی ناگوار صورت حال طلاق میں نہیں تو مستقل علیحدگی کی شکل میں ختم ہو چکی تھی۔'' (۳۵۳)

اقبال کے سامنے آرنلڈ کا گھر اور دوسرا اکبر حیدری کی مثال موجود تھی۔ اقبال بھی اسی ذہنی سکون کی تلاش میں تھے بہت سی خواتین اقبال سے شادی کی خواہاں تھیں لیکن اقبال روشن خیال ہونے کے باوجود بعض معاملات میں اپنی قدامت پسندی کو چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ کیونکہ وہ کسی ایسی خاتون کی تلاش میں تھے جو ان کی بیوی کی حیثیت سے ان کے خاندان کے افراد سے ان کے گہرے تعلق اور وابستگی کو قائم رکھ سکے۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''دوسری شادی کے سلسلے میں جو ۱۹۱۰ء میں ہوئی مرزا جلال الدین کا بیان ہے کہ اقبال کے دوست شیخ گلاب دین وکیل نے موچی دروازے کے ایک کشمیری خاندان کی صاحبزادی کے متعلق تحریک کی جو اس وقت وکٹوریہ گرلز اسکول میں پڑھتی تھی۔ جب بات پکی ہوگئی تو اقبال کے بڑے بھائی سیالکوٹ سے آئے اور مرزا جلال الدین شاہنواز مولوی احمد دین اور شیخ گلاب دین کو ساتھ لے کر اقبال کے سسرال پہنچے اور وہاں ان کا نکاح سردار بیگم سے پڑھا گیا اس موقع پر صرف نکاح ہوا اور رخصتی عمل میں نہ آئی۔'' (۳۵۴)

مگر اس شادی سے بھی اقبال کو سکون نصیب نہ ہوا تھا نکاح کے بعد رخصتی نہ ہو سکی تھی۔ مگر نکاح کے فوراً بعد ہی اقبال کو گمنام خط ملنا شروع ہو گئے تھے جس میں سردار بیگم کے چال چلن کے متعلق غلط بیانی کی جاتی تھی پہلی بیوی سے علیحدگی اور دوسری بیگم کے متعلق یہ صورت حال اقبال کے لیے کسی کرب سے کم نہ تھی۔ یوں اقبال نے سردار بیگم کو بھی طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اسی کشمکش میں تین سال گزر گئے۔ اقبال اور مرزا جلال الدین نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ گمنام خط بھیجنے والا کوئی وکیل تھا

جو اپنے بیٹے کی شادی سردار بیگم سے کرنا چاہتا تھا اسی دوران سردار بیگم نے ہمت کر کے ایک خط اقبال کے نام لکھا جس میں ان کو یقین دلایا کہ قیامت تک میں آپ کا انتظار کروں گی۔

لیکن اسی دوران اقبال تیسری شادی بھی کر چکے تھے۔مختار بیگم کا خاندان لدھیانہ میں نولکھیوں کا خاندان کہلاتا تھا اس شادی کی تاریخ نہیں دی گئی۔ مگر اقبال نے مختار بیگم کو لے کر انار کلی والے مکان میں قیام کیا۔اقبال نے جب سردار بیگم کا خط پڑھا تو اندر ہی اندر بہت شرمندہ ہوئے اور سردار بیگم کو گھر لانے کا فیصلہ کر لیا۔ چونکہ طلاق دینے کا ارادہ کر چکے تھے اس لیے دوبارہ نکاح پڑھوایا گیا۔اور یوں اقبال سردار بیگم کو لے کر سیالکوٹ آئے اور چند ہفتوں کے بعد لاہور اسی مکان میں دونوں بیویاں ہنسی خوشی رہنے لگیں۔ یوں اقبال کی زندگی کی ساری رونقیں پھر سے لوٹ آئیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مضمون کا اختتام کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۳ء یعنی دس سال کے عرصے میں اگرچہ سردار بیگم اور مختار بیگم اقبال کے ساتھ زندگی گزار رہی تھیں لیکن صاحب اولاد نہ ہو سکیں۔اور اتفاقاً ۱۹۲۴ء میں دونوں بیویاں ایک ہی زمانے میں حاملہ ہوئیں چنانچہ مختار بیگم ماں کے پاس لدھیانہ گئیں لیکن وہاں شدید بیمار ہو گئیں علامہ مختار بیگم کے آخری وقت لدھیانہ پہنچے اور ان کے مرنے سے کچھ منٹ قبل بات چیت کی سردار بیگم کے بطن سے ۱۹۲۴ء سیالکوٹ میں جاوید اقبال پیدا ہوئے اور اس کے بعد آٹھ سال بعد ایک لڑکی منیرہ بیگم پیدا ہوئیں۔ سردار بیگم ۱۹۳۵ء میں انتقال کر گئیں اور لاہور میں دفن ہیں۔

اقبال اور فلسطین

اقبال کو فلسطین کے مسلمانوں سے بے حد لگاؤ تھا فلسطین کے مسلمان اس وقت زوال کا شکار ہو چکے تھے۔ فلسطین پیغمبروں کی مقدس سرزمین امت مسلمہ کا قبلہ اوّل، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر معراج کی پہلی سیڑھی ہے۔ یہ وہ ارض مقدس ہے جہاں حضرت داؤدؑ، حضرت سلمانؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ حضرت اسحاق کے مزارات ہیں۔ فریدہ الٰہی علامہ اقبال اور تحریک آزادی فلسطین میں فلسطین کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے تحریر کرتی ہیں:

''نبیوں کا سلسلہ حضورؐ پر آ کر ختم ہو گیا حضور مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے

اور وہیں انہیں لوگوں کی ہدایت کے لیے خدا تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز کیا مگر انہیں بیت المقدس کی سیر کرادی۔ یہیں سے حضورؐ معراج پر تشریف لے گئے اور حضور کی امامت میں جلیل القدر انبیاء نے نماز پڑھی۔ رسولؐ کے بعد حضرت عمر وہ پہلے مسلمان خلیفہ تھے جنہوں نے یہاں نماز کی امامت کرائی مسلمانوں کا پہلا قبلہ بیت المقدس بھی یہیں موجود ہے چنانچہ فلسطین کی سر زمین مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے یکساں متبرک ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فلسطین انبیاء کرام کے پیروکاروں اور ان مسلمانوں کا ہے جو خدائی تعلیمات کی پیروی کرنیوالے ہیں اسے سرزمین ابنیاء بھی کہا جاتا ہے۔" (۳۵۵)

یہ وہ وجوہات تھیں جس کی بناء پر اقبال کو فلسطین سے بے حد عقیدت تھی۔ لیکن ۱۹۱۷ء کو وزیر خارجہ لارڈ بالفور نے فلسطین کی تاریخ کو بدل دینے والا اعلان کیا جو کہ لارڈ روتھ شیلڈ کے نام ایک خط کی صورت میں تھا۔

"Dear lord Rothschild,

I have much pleasure in conveying to you on behalf of his Majesty's Government the following declaration of sympathy with Jewish Zionist aspiration which has been submitted to and approved b the Cabinet "His Majesty's Government view with favour the establishment in palestine of a National Home for the Jewish people and will we their best endeavour to facialiate the achievement of this object, It being clearly understood that nothing shall be done which may prejudice the civil and religious rights of and political status enjoyed by the Jews in any other country"

I shall bring this declaration to the knowledge of Zionist federation (۳۵۶)

Yours sincerely,

Arthur Belfour"

اب فلسطین میں یہودیوں کو بہانے بہانے سے بسانے کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ کیونکہ یہودیوں کو برطانیہ کی سرپرستی حاصل تھی یوں بیت المقدس پر قبضے کے لیے صلیبی جنگوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ یوں ۱۹۲۰ء میں صلح کانفرنس میں فلسطین کو برطانیہ کے زیر انتداب علاقہ قرار دے دیا گیا اس کے ساتھ ہی سر رابرٹ سمویئل فلسطین کا پہلا ہائی کمشنر مقرر ہو کر بیت المقدس پہنچا تو یوں فلسطین میں یہودیوں کی ریشہ دوانیاں مزید تیز ہوگئیں۔ یوں یہودیوں نے پوری منصوبہ بندی کے ذریعے فلسطین کی زمینیں خرید کر عربوں کو بے دخل کرنا شروع کر دیا ۱۹۴۷ء تک یہودیوں کی تعداد ۸۳ ہزار ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے بھی نہایت عمدگی سے مسئلہ فلسطین کو اقبال کے نقطہ نظر سے بیان کیا ہے۔ اقبال کو بھی مسئلہ فلسطین کے حل کے لیے کمیشن میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی اقبال ۲۹ فروری ۱۹۲۲ء کو مولانا گرامی کو لکھتے ہیں:

> ”ترکوں کے ساتھ اتحادیوں کا جو عہد نامہ ہوا تھا اس کی رو سے مقامات مقدسہ فلسطین و شام کے لیے ایک کمیشن مقرر ہونے والی ہے۔ جس کے ممبر مسلمان عیسائی و یہود ہونگے۔ گورنمنٹ نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ آیا میں اس کمیشن کا ممبر بننا قبول کر سکتا ہوں۔ اس کمیشن کے اجلاس مقام یروشلم میں ہوں گے اور دو تین سال تک متعدد بار یہاں سے یروشلم جانا پڑے گا بعد کامل غور آج میں نے فیصلہ کر دیا ہے کہ میں اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔“ (۳۵۷)

اس کمیشن کا مقصد فلسطین کے مقامات مقدسہ کی حفاظت کرنا تھی۔ اور ان مقامات مقدسہ کے متعلق تمام مذہبی ملتوں کے حقوق کا مطالعہ کرنا۔ ان کی حد بندی اور تعین کرنا تھا اقبال چونکہ اتنے دولت مند آدمی نہ تھے کہ اس کمیشن میں شرکت کے لیے بار بار یروشلم جا سکیں۔ یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کے آدھے حصے پر قبضہ کر لیا۔ اس تشویش ناک صورت حال کے مدِ نظر ۷ ستمبر ۱۹۲۹ء کو ایک بڑا جلسہ لاہور کے دہلی دروازے کے قریب منایا گیا جس میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا فلسطین میں مسلمانوں، ان کے بچوں اور عورتوں کو شہید کیا جا رہا ہے اور یہ قتل و غارت مسجد اقصیٰ کے پاس کیا جا رہا ہے جو مقام معراج رسولؐ خدا ہے اسلامی نقطہ نظر سے یہودیوں کو فلسطین پر کوئی قانونی یا تاریخی حق حاصل نہیں۔

یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کے آدھے حصے پر اپنا حق سمجھنا شروع کر دیا۔ اور یوں فلسطین میں فتنہ وفساد برپا ہو گیا۔ عورتوں اور بچوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ یہودی مغرب کے اشارے پر کٹھ پتلی کی طرح ناچ رہے تھے۔

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ

شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی

ڈاکٹر تقی عابدی نے مفتی سید امین الحسینی کی بنائی گئی موتمر کا بھی ذکر کیا ہے جو اتحاد عالم اسلام اور فلسطین کے مسائل کے لیے بنائی گئی تھی۔ اقبال نے بھی موتمر کے اجلاس میں شرکت کی تھی۔ بیت المقدس میں موتمر اسلامی کے انعقاد کی تیاریاں مئی اور جون ۱۹۳۱ء میں شروع ہوئیں تھیں۔ فریدہ الٰہی موتمر کے مقاصد تحریر کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''یہ موتمر اس لیے منعقد کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کو خبردار کیا جائے کہ صیہونیت بڑی تیزی سے فلسطین میں اپنے پنجے جما رہی ہے چنانچہ عالم اسلام کے نمائندوں کو مسئلے کی سنگینی کا احساس دلایا جائے اور صیہونی خطے کے خلاف انہیں متحد کیا جائے۔'' (۳۵۸)

اقبال موتمر اسلامی میں شرکت کے لیے ۶ دسمبر ۱۹۳۱ء کو بیت المقدس پہنچ گئے۔ زندہ رود میں جسٹس جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''۶ دسمبر ۱۹۳۱ء صبح ساڑھے نو بجے اقبال بیت المقدس پہنچے بارش شدید ہونے کے باوجود اسٹیشن پر سید امین حسینی اور دوسرے کارکنان کانفرنس خیر مقدم کے لیے موجود تھے۔ اس کانفرنس میں مفتی اعظم کو صدر محمد علی پاشا علامہ اقبال اور ضیا الدین طباطبائی کو نائب صدر انتخاب کیا گیا۔'' (۳۵۹)

زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے مفتی سید امین الحسینی کے افتتاحی خطبہ کو تحریر کیا ہے۔

''اس موتمر کے انعقاد کا مقصد ہے کہ ہم کسی امت یا دین پر دراز دستی کرنا چاہتے ہیں نہ ہی ہم کسی سے مخاصمت پیدا کرنا چاہتے ہیں بلکہ ہمارا

مقصد تو یہ ہے کہ مسلمان یک جان اور ایک آہنگ ہو کر اپنے مصالح جدوجہد کریں"(۳۶۰)

ڈاکٹر جاوید اقبال نے زندہ رود میں ہی موتمر کے مقاصد کا بھی ذکر یوں کیا ہے:

"مسلمانوں کے اتحاد و تعاون کے لیے جدوجہد صحیح اسلامی اخوت کی نشو و نما مسلمانوں کو اجتماعی اسلامی فرائض کی طرف متوجہ کرنا اور دین اسلام کو عوارض سے بچانا۔ عقاید کو الحاد سے محفوظ رکھنا اور اسلامی تمدن کی اشاعت کرنا۔"(۳۶۱)

اقبال کے اس نو(۹) روزہ قیام کے دوران موتمر کے اجلاسوں میں مسلمان ممالک کے مختلف نمائندوں سے ملاقات کی۔اس کے علاوہ اقبال نے مقامات مقدسہ کی سیر بھی کی اس مقامات مقدسہ کی سیر کے دوران ان کو مسلمانوں کی عظمت رفتہ اور عروج کا زمانہ بہت یاد آیا۔ بال جبرئیل کی شہرہ آفاق نظم "ذوق وشوق" کے اکثر اشعار فلسطین میں ہی قلمبند کیے گئے۔ مقامات مقدسہ کی زیارت کے بعد علامہ کے دل میں مسلم ممالک کی ترقی اور احیائے اسلام کا خواب کروٹیں لینے لگتا ہے اسی احساس کے پیش نظر اقبال نے اپنے احساسات و تصورات کو ذوق وشوق میں رقم کیا یہ نظم سفر فلسطین کا حاصل بھی تھی اور وطن واپسی پر ملت کے لیے ساتھ لے کر آنے والا تحفہ بھی تھی۔ اس نظم کو لکھتے ہوئے فلسطین کا خوبصورت نظارہ اقبال کی نظروں کے سامنے تھا۔ فلسطین ایک خوبصورت خطہ زمین ہے۔نظم کا آغاز خوبصورت منظر کشی سے کیا گیا جو یقیناً فلسطین کے متعلق ہے شاعران مناظر میں صرف گم ہی نہیں ہے بلکہ تخیل کے پردے قافلوں کے ساتھ سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ فلسطین اور بیت المقدس شروع سے قافلوں اور کاروانوں کا ملک رہا ہے۔ قوموں کی گزرگاہ ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ بین الاقوامی اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ پیغمبروں کی اس سرزمین کے مناظر نے شاعر کے سوئے ہوئے جذبات کو پھر سے جگا دیا اور احساس کی اس شدت نے اقبال کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی محبت کو نظم کا روپ دے دیا۔

وہ سجدہ روح زمین جس سے کانپ جاتی ہے
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

سنی نہ مصر فلسطین میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشہ سیماب (۳۶۲)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے الوداعی خطبے کو بھی اپنے اس مضمون میں نقل کیا ہے کیونکہ اقبال اس اجلاس کے اختتام سے پندرہ دن پہلے واپس آگئے تھے۔

"مجھے سخت افسوس ہے کہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے کانفرنس کے اختتام تک نہیں رہ سکتا لیکن میری یہ آرزو ہے کہ اس سرزمین انبیاء اور مقامات مقدسہ کی دوبارہ زیارت کروں آج کل اسلام کو دو بڑے خطرے گھیرے ہوئے ہیں۔ ایک کمیونزم اور دوسرا وطن اور قوم پرستی۔ میں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ ہم دل سے مسلمان ہوں۔ میں اسلام کے دشمنوں سے نہیں بلکہ خود مسلمانوں سے خوف زدہ ہوں" (۳۶۳)

علامہ اقبال نے اس موقع پر فارسی کے تین شعر پڑھے جس سے سامعین پر ایک نشہ طاری ہوگیا وہ فارسی کے اشعار یہ تھے:

طارق چو بر کنارہ ای اندلس سفینہ سوخت
گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطاست

دوریم از سواد وطن باز جوں رسیم
ترک سبب زروئے شریعت کجا رواست
خندید و دست خویش بہ شمشیر بردوگفت
ہر ملک ماست کہ ملک خدائے ماست (۳۶۴)

ڈاکٹر تقی عابدی ان اشعار کا مفہوم یوں ادا کرتے ہیں کہ "طارق نے جب اندلس کے کنارے اپنی کشتیاں جلاڈالیں تو لوگوں نے کہا کہ عقل کی نظر سے یہ کام غلط تھا ہم وطن سے دور ہیں اور شریعت میں گھر کو چھوڑنا جائز نہیں۔ طارق مسکرایا اور شمشیر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ دنیا کا ہر ملک ہمارا ہی ملک ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا کی ملکیت ہے۔

اقبال کو یقین تھا کہ اگر مسلمان متحد ہو جائیں تو اسلام بھی کامیاب ہو جائے گا۔ کیونکہ عرب کے مسلمانوں کے ساتھ اسلام کا مستقبل وابستہ ہے اقبال جانتے تھے کہ حکومت برطانیہ فلسطین پر قبضہ کے لیے پروپیگنڈہ کر رہی ہے کہ عربوں نے یہودیوں کو فلسطین سے نکالا تھا اس لیے یہ سرزمین ان کی ہے۔ اقبال نے اس خیال کو غلط ثابت کیا کہ اگر فلسطین پر یہودیوں کا حق ہے تو عربوں کا حق اسپین ، سسلی اور دوسرے یورپین مفتوحہ علاقوں پر بھی ہو سکتا ہے۔ یہودیوں کا دعویٰ بے بنیاد ہے اور اس کے پیچھے مغرب کا ہاتھ ہے:

ہے خاک فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا
مقصد ہے ملوکیت انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں تاریخ کا یا شہد و رطب کا (۳۶۵)

اقبال فلسطین کے حالات سے ہمیشہ پریشان رہے۔ اور جہاد بالقلم کرتے رہے ڈاکٹر تقی عابدی نے حکومت برطانیہ کو لکھا گیا اقبال کا خط بھی شامل کیا ہے جس میں اقبال کی فلسطین کے لیے تشویش اور اضطراب کی کیفیت کا بیان ملتا ہے۔ لیکن یہاں تقی عابدی نے خط کی تاریخ واضح نہیں کی ہے:

> ''فلسطین کے حالات سے ہندوستانی مسلمانوں میں تشویش اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے چونکہ برطانیہ کی سیاست یہ ہے کہ عربوں کے فائدے کے خلاف فلسطین میں یہودیوں کی حکومت برقرار رہے یہ سیاسی دشمنی جو مسلمانوں کے ساتھ کی جارہی ہے فوراً ختم کی جائے اور بالفور کے ایجنڈے کو واپس لے لیا جائے تاکہ مسلمانوں اور حکومت برطانیہ کے تعلقات اس سے بدتر نہ ہوں۔'' (۳۶۶)

حکومت برطانیہ نے فلسطین کی تقسیم کا اعلانیہ منتشر کیا تو اقبال بے حد رنجیدہ ہو گئے۔ چنانچہ ۱۲ جولائی ۱۹۳۷ء کو موچی دروازے کے پاس ایک عظیم جلسہ منایا گیا جس کی صدارت جناب ملک برکت علی نے کی اس جلسہ میں علامہ اقبال نے جو خطبہ دیا وہ ان الفاظ میں ڈاکٹر تقی عابدی نے نقل کیا ہے۔

''عربوں کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے وہ ہر مسلمان کے لیے باعث اضطراب اور رنج ہے یہ مسئلہ مسلمانان جہاں کو ایک موقع فراہم کرتا ہے جس کے ذریعے وہ اس امر کا پوری قدرت سے اعلان کریں کہ مسئلہ فلسطین سے برطانوی حکومت یہودیوں کے حق میں حل کرنا چاہتی ہے وہ محض مسئلہ فلسطین نہیں بلکہ اسلامی مسئلہ ہے جس کا شدید اثر اکثر تمام تر دنیائے اسلام پر ہوگا۔'' (۳۶۷)

علامہ بخوبی جانتے تھے کہ فلسطین میں یہود کے لیے ایک قومی وطن کا قیام تو محض حیلہ ہے حقیقت تو یہ ہے کہ حکومت برطانیہ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ میں مستقل انتداب اور سیاست کی شکل میں اپنے لیے ایک مقام کی تلاش میں ہے علامہ یورپ کی اس سازش کا ذکر ان اشعار میں کرتے ہیں

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے
ہر ملت مظلوم کا یورپ ہے خریدار
جلتا ہے مگر شام و فلسطین سے مرا دل
تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدہ دشوار

اقبال فلسطین کے مسلمانوں کے لیے انتہائی قدم اٹھانے کے لیے بھی تیار تھے انہوں نے فلسطین کے بگڑتے ہوئے حالات کے پیش نظر ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۷ کو قائداعظم کو خط لکھا:

''مسئلہ فلسطین مسلمانوں کے ذہن کو بہت متاثر کر رہا ہے مجھے امید ہے کہ اس جلسہ میں نہ صرف ایک قرارداد پاس کی جائے بلکہ مسئلہ فلسطین پر ایک عظیم کانفرنس برصغیر میں منعقد کریں تاکہ مسلمانان ہند سے فلسطین کے مسئلہ کو فائدہ پہنچے۔ ذاتی طور پر ایسے مقصد کے لیے جیل جانے کے لیے بھی تیار ہوں'' (۳۶۸)

ڈاکٹر تقی عابدی اپنے اس مضمون کے اختتام پر علامہ کے سفر کے متعلق بہت ہی دلچسپ واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ مگر انہوں نے واقعہ کو تحریر نہیں کیا۔ اگر ڈاکٹر تقی عابدی اس اہم واقعہ کو بھی قدرے

تفصیل سے بیان کر دیتے تو اقبال کے شائقین کے لیے معلومات کا باعث ہوتا۔ اس قیام کے دوران اقبال مختلف ملکوں کے نوجوانوں سے ملے جن میں مراکش، مصر، یمن، شام، عراق اور جاوا کے نمائندے شامل تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے مضمون کا اختتام ان الفاظ میں کیا ہے۔

''علامہ ہی کی دعوت اور ان کے اصرار پر مفتی اعظم فلسطین سید حسینی ہندوستان آئے چنانچہ عطیہ فیضی کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قیام بمبئ میں بواھیر پیشوا سیدنا سیف الدین کے پاس رہا۔ اور اس سفر جو مئی ۱۹۳۳ء میں ہوا علامہ نے مفتی اعظم کی مالی عنایت بھی کی۔'' (۳۶۹)

مفتی اعظم اقبال کے بہت قدرداں تھے۔ اقبال کی وفات کے ۳۶ سال بعد وہ پاکستان آئے تو انہوں نے اقبال کے جذبات کو فلسطینی تنظیم کی روح قرار دیا۔ اقبال چاہتے تھے کہ آنے والے دور میں ترک وعرب باہم متحد ہو جائیں کلمہ توحید اور دشمنان اسلام کے حملوں سے اللہ کے گھر کی حفاظت ان کے وحدت اور اتحاد کی بنیاد ہونی چاہیے۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ (۳۷۰)

لیکن مسلمانوں نے اقبال کے اس پیغام کی طرف دھیان نہیں دیا یہی وجہ ہے کہ آج اسرائیلی طاقت کے سامنے مسلمان خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ فلسطین کی سرزمین پر کسی جواز کے بغیر سراسر ظلم اور ناانصافی کے ذریعے قائم کی جانیوالی یہودی ریاست کا وجود ہی ظلم سے عبارت ہے اس لیے اس سے کسی امن دوستی اور انصاف پسندی کی توقع رکھنا فضول ہے۔ اقبال نے اس بربریت کو محسوس کر لیا تھا یورپ اور یہود کے عنوان سے اس صورتحال کا نقشہ یوں کھنچا ہے

یہ عیش فراواں یہ حکومت یہ تجارت
دل سینہ بے نور ہیں محروم تجلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادی ایمن نہیں شایان تجلی (۳۷۱)

فلسطین میں یہود کے لیے ایک قومی وطن کے قیام کے لیے جو شور مچایا جا رہا تھا اقبال اس کی

حقیقت سے بھی آگاہ تھے وہ جانتے تھے کہ یہودیوں کے لیے وطن کی تلاش تو محض ایک حیلہ ہے اس کے پیچھے بے شمار مقاصد کارفرما ہیں۔ دراصل فلسطین میں اسرائیل کی ریاست قائم کرنا مشرق وسطیٰ کے عین قلب میں امریکی اجارہ داری اور سرمایہ داروں کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے ایک فوجی اڈے کی فراہمی ہے۔ اقبال دیکھ رہے تھے کہ فلسطین کا مسئلہ دن بدن خراب ہوتا جارہا ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں

مقصد ہے ملوکیت انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں تاریخ کا یا شہد و رطب کا

مسئلہ فلسطین صرف عربوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ پورے عالم اسلام کے قبلہ اول کا مسئلہ ہے اس لیے پورے عالم اسلام پہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ قبلہ اول کو بچانے کے لیے بھرپور جدوجہد کریں۔ اوران مظلوموں کا پورا پورا ساتھ دیں جو یہودیوں کے ظلم وستم کی چکی میں پس رہے ہیں۔

فریدہ الٰہی نے فلسطین پر قبضے کی ایک اور وجہ بھی بیان کی ہے:

''یہودیوں نے نہ صرف فلسطین پر قبضے کا خواب پورا کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کا یہ مطالبہ ہے کہ مسجد اقصیٰ پر ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی جائے ۔ہیکل سلیمانی کی حقیقت یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کے ہمراہ صحرا میں مارے مارے پھرتے تھے تو اس زمین میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خیمہ عبادت بنانے کا حکم دیا۔ یہ خیمہ وہ ہر جگہ اپنے ساتھ لیے پھرتے تھے۔ اس میں کئی حصے تھے عودسوز قیام عبادت اور تابوت سکینہ کی جگہ وغیرہ'' (۳۷۲)

یوں ہیکل تعمیر کرنے کا عملی کام بھی شروع کر لیا گیا ۱۹۶۷ء میں یہودیوں نے مسجد اقصیٰ پر مکمل قبضہ کر لیا اور سرنگیں کھودنی شروع کر دیں تاکہ اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کیا جاسکے اور کسی قدرتی آفت یا طوفان کے نتیجے میں مسجد خود ہی گر کر شہید ہو جائے اور اس کی جگہ ہیکل تعمیر کیا جا سکے۔ ۲۱ اگست ۱۹۶۹ء میں آسٹریلوی عیسائی نے مسجد اقصیٰ میں آگ لگا دی۔ ساڑھے تین گھنٹے تک آگ لگی رہی اور قبلے کی چھت کا بڑا حصہ گر گیا۔ یوں وقت کے ساتھ ساتھ مسجد کی بے حد بے حرمتی کی گئی۔ جس سے حالات مزید کشیدگی اختیار کرتے چلے گئے۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں:

"اصل مسئلہ محض مسجد اقصیٰ کی حفاظت کا نہیں۔ مسجد اقصیٰ محفوظ نہیں ہوسکتی۔ جب تک بیت المقدس یہودیوں کے قبضے میں رہے اور خود بیت المقدس بھی محفوظ نہیں رہ سکتا جب تک فلسطین پر یہودی قابض ہیں۔ اس لیے اصل مسئلہ فلسطین کو یہودیوں کے غاصبانہ تسلط سے آزاد کرانے کا ہے۔" (۳۷۳)

اقبال اور حیدر آباد دکن

علامہ اقبال نے نوجوانی میں حضرت داغ دہلوی سے شاگردی خط و کتابت کے ذریعے کی تھی۔ تب سے ہی اقبال کو خواہش تھی کہ وہ ملک دکن کی سرزمین کو دیکھیں۔ اس سلسلے میں اقبال نے ایک شعر بھی تحریر کیا تھا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال زندہ رود میں تحریر کرتے ہیں:

"وہ گاہے بگاہے خط و کتابت کے ذریعہ کلام پر اصلاح لیتے رہے۔ اقبال کی داغ کے ساتھ بالمشافہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی البتہ اس خواہش کی طرف اشارہ ان کے ایک شعر میں موجود ہے۔

یہی ہے جو شوق ملاقات حضرت
تو دیکھیں گے اک بار ملک دکن بھی (۳۷۴)

اقبال نے دکن کا دوبار سفر تو کیا مگر حضرت داغ سے ملاقات نہ ہوسکی کیونکہ داغ دہلوی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اقبال نے ۱۸ مارچ ۱۹۱۰ء کو پہلی دفعہ حیدر آباد کا سفر کیا۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اقبال کے پہلی دفعہ حیدر آباد کا سفر کرنے کی وجہ معقول آمدنی کی تلاش بتائی ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

"ظاہر ہے اقبال معقول آمدنی کے کسی ایسے ذریعے کی تلاش میں تھے جو کشاکش روزگار سے انہیں کم از کم اتنی مہلت دے کہ وہ اپنی قوت فکر کا رخ اس عالم کی سمت کرنے کے قابل ہوسکیں جس کا تعلق تخلیق سے تھا۔ اقبال کی روح کی گہرائیوں میں یہ احساس تڑپ رہا تھا۔ کہ ان کا اصل مقصد شعر کے

ذریعے ایک نیا پیغام عالم اسلام تک پہنچانا ہے۔لیکن بدقسمتی سے برصغیر میں تصنیف وتالیف کا شغل بجائے خود معقول آمدنی کا ذریعہ نہ تھا بلکہ ایسے مقصد کی تحصیل کے لیے کسی نہ کسی مالدار سرپرست کی ضرورت تھی۔'' (۳۷۵)

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حیدرآباد دکن دہلی اور لکھنو کی تباہی کے بعد اردو کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا۔اور اقبال کے کلام کو اہل حیدرآباد خوب پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے چنانچہ اسی باب نے اقبال کو حیدرآباد کی طرف کھنچا پھر ان کے استاد کا ملک بھی تھا۔نظیر حیدرآبادی، اقبال اور حیدرآباد میں تحریر کرتے ہیں۔

''حیدرآباد کا یہ پہلا سفر اقبال نے یورپ سے واپسی کے تقریباً ایک سال بعد کیا تھا اس زمانے میں تخت آصف جاہی پر موجود نظام کے والد اقبال کے استاد بھائی اور داغ کے شاگرد میر محبوب علی خاں آصف متمکن تھے۔داغ کا انتقال ہو چکا تھا لیکن اقبال کے بے تکلف دوست مولانا گرامی شاعر دربار کی حیثیت سے دکن میں موجود تھے۔'' (۳۷۶)

اقبال کے اس پہلے سفر میں حیدرآباد کے عوام اور خواص جس میں ادبی، سماجی اور سیاسی ممتاز افراد شامل تھے سب نے خیر مقدم کیا۔سر اکبر حیدری اور مہاراجہ کشن پرشاد سے اقبال کی نامہ نگاری بھی تھی۔یہاں ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کا ایک خط عطیہ فیضی کے نام بھی شامل کیا ہے:

''اگر طولانی مدت کے لیے حیدرآباد میں قیام کروں تو مجھے یقین ہے کہ عالی حضرت مجھ سے ملاقات کریں گے۔حیدرآباد میں معروف اور سرشناس شخصیتوں سے ملاقات رہی اکثر افراد نے مجھے اپنے گھروں پر دعوت دی۔جناب سر اکبر حیدری اور ان کا خاندان نہایت شریف مہمان نواز اور علم دوست ہے۔'' (۳۷۷)

حیدرآباد میں اقبال نے سر اکبر حیدری کے ہاں قیام کیا تھا۔خط وکتابت کے ذریعے سر اکبر حیدری سے تعارف ہو چکا تھا۔غائبانہ تعارف مولانا گرامی کے ذریعے بھی ممکن ہے۔سر اکبر حیدری علم وادب کے بیحد قدرشناس تھے اور ان کی اہلیہ بھی علم وادب سے خاصی شغف رکھتی تھیں۔خاطر

مدارت کے علاوہ انہوں نے اقبال کی ملاقات حیدر آباد کی متعدد ہستیوں سے کروائی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے نظم طباطبائی کا بھی ذکر کیا ہے جن سے اقبال کی ملاقات اکبر حیدری نے کروائی تھی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''حیدر آباد میں قیام کے دوران اقبال نے نظم طباطبائی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ نظم ان ایام میں نظام کالج میں فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے مامور تھے۔ سر اکبر حیدری نے انہیں بلوا بھیجا اور اقبال سے تعارف کرایا۔ کچھ دیر بات چیت کے بعد اقبال نے ان سے اپنا کلام سنانے کی درخواست کی نظم نے اپنے ایک نعتیہ قصیدے کی تشبیب کے اشعار سنائے

پردہ ظلمت سے نکلا روئے سلمائے سحر
ناقۂ گردوں سے کھینچی لیلیٰ شب نے مہار

اشعار سن کر اقبال نے نظم کو ان کی قادر الکلام ہونے پر بے انتہا داد دی اور بعد میں انہوں نے نظم ہی کی زمین میں مدحیہ قصیدہ ''شکریہ'' تحریر کیا جو مہاراجہ کشن پرشاد سے منسوب ہے۔'' (۳۷۸)

نظم طباطبائی کے علاوہ جلیل حسن مانک پوری اور میر محبوب علی پاشا سے ملاقات کی جناب ظہیر دہلوی اور مہاراجہ کشن پرشاد سے بھی ملے۔ حیدر آباد کے قیام کے دوران ہی اقبال نے (۵۸) اشعار پر مشتمل نظم گورستان شاہی لکھی جو مخزن میں ۵ جون ۱۹۱۰ء میں چند مقدماتی جملوں کے ساتھ شائع ہوئی اس کا خلاصہ بھی ڈاکٹر تقی عابدی نے تحریر کیا ہے۔

''حیدر آباد کے مختصر قیام کے دوران جناب نذر علی صاحب کے ہمراہ قطب شاہی مقبروں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ مقبرے جن کی عظمت باشکوہ اور جن کی تاریخ درس آموز ہے جہاں سلاطین قطب شاہی آرام کر رہے ہیں۔ یہاں خاموشی ہے سکوت شب میں آسمان پر ابر کے ٹکڑوں کا ہجوم اور چاند کا منظر دردناک اور احساساتی بھی ہے اس منظر نے مجھ پر ایسا اثر طاری کیا ہے جسے میں ہرگز بھول نہیں سکتا۔ یہ اشعار میرے حیدر آباد کے سفر کی یادگار کے

ساتھ ساتھ جناب سر اکبر حیدری اور اُن کی بیگم کی مہمان نوازی اور محبت کی یاد بھی تصور کیے جا سکتے ہیں۔ اقبال ۲۳ مارچ ۱۹۱۰ء کو حیدر آباد سے لاہور واپس ہوئے سفر کے دوران دو روز اورنگ آباد میں قیام کیا اور عالمگیر اورنگ زیب کی قبر کی بھی زیارت کی۔'' (۳۷۹)

حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری نے اقبال کے اعزاز میں اعشائیہ بھی دیا تھا۔ اس اعشائیہ میں متعدد شاعروں اور ادیبوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ مولانا ظہیر بہت ضعیف تھے اور اونچا سنتے تھے حیدر آباد میں کشن پرشاد سے ملاقات بھی بہت مفید رہی۔ اقبال نے حیدر آباد سے واپسی ۱۳ مارچ ۱۹۱۰ء کو اختیار کی۔ راستے میں دو دن حیدر آباد میں قیام کیا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں:

''اقبال ۲۳ مارچ ۱۹۱۰ء کو حیدر آباد سے واپس لاہور روانہ ہوئے راستے میں دو دن اورنگ آباد میں قیام کیا اورنگ زیب عالمگیر کے مقبرے کی زیارت کی۔ مرزا اورنگ زیب عالمگیر کی زیارت کے وقت اقبال کے ساتھ بڑے بھائی شیخ عطا محمد بھی تھے۔ لیکن وہ تعظیماً مزار پر آویزاں قناعت کے اندر داخل نہ ہوئے۔ کیونکہ بقول ان کے ان کی داڑھی غیر مشروع تھی۔'' (۳۸۰)

ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کی ایک خواہش کا بھی ذکر کیا ہے یہ خواہش مہاراجہ کشن پرشاد کو ایک خط کے ذریعے ظاہر کی گئی ہے اقبال خواہش مند تھے کہ جسٹس سید ہاشم بلگرامی کی جگہ خالی آسامی کو پر کرنے کی مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا بعد میں سر اکبر حیدری نے پیشکش کی مگر اقبال نے مسترد کر دی۔ اس کے بعد اقبال کا دوسرا دورہ جو حیدر آباد دکن کی طرف، ڈاکٹر تقی عابدی نے تحریر کیا ہے۔ یہ دورہ تعلیمی لیکچر دینے کے لیے تھا جو ۱۹۲۹ء میں کیا گیا۔ اقبال نے عثمانیہ یونیورسٹی میں لیکچر دیئے تھے عبدالمجید سالک ذکر اقبال میں تحریر کرتے ہیں:

''میسور سے حضرت علامہ ۱۴ جنوری کو حیدر آباد دکن پہنچے۔ اسٹیشن پر ان کو بتا دیا گیا کہ آپ اعلیٰ حضرت حضور نظام کے خاص مہمان ہیں۔ پلیٹ فارم پر صدہا اشخاص جمع تھے۔ معززین حیدر آباد یونیورسٹی کے پروفیسر، طلباء، دوسرے اہل ذوق اور مداح قطار باندھے اقبال کا قومی ترانہ گا رہے تھے۔

علامہ مہمان خانہ شاہی میں تشریف لے گئے اور ۱۸ جنوری ۱۹۲۹ء کو گیارہ بجے قبل دوپہر اعلیٰ حضرت کی حضور میں باریاب ہوئے۔‘‘(۳۸۱)

۱۸ جنوری کو باغ عامر کے ہال میں اقبال کا پہلا لیکچر تھا مہاراجہ کشن پرشاد نے اس کی صدارت کی اس لیکچر کو سننے کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ شامل تھے۔ اسی رات مہاراجہ کشن پرشاد نے ایک ضیافت کے ساتھ مشاعرے کا بھی اہتمام کیا۔ جس کے مدعونین کو یہ شرط بتادی گئی تھی کہ آصف شاہی دستار اور بگلس یعنی ریاستی لباس پہن کر آئیں۔ تمام مشہور اُردو اور فارسی کے شعراء یہی لباس پہن کر آئے۔ اس مشاعرے میں جن جن شعراء نے شرکت کی ان کی تفصیل ڈاکٹر جاوید اقبال زندہ رود میں تحریر کرتے ہیں:

> ’’طعام کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ حیدر یار جنگ طباطبائی، نواب ضیاء یار جنگ بہادر نواب عزیز یار جنگ، بہادر مولوی مسعود علی نجدی، جوش ملیح آبادی، نظام شاہ لبیب، تیموری میر، کاظم علی باغ اور دیگر شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ اقبال کسی کو داد دیئے بغیر خاموش بیٹھے رہے۔‘‘(۳۸۲)

اقبال نے دوسرا لیکچر باغ عامہ میں دیا۔ اسکی صدارت نواب اعظم نے کی۔ ۱۸ جنوری کو اقبال نظام سے ملے یہاں ڈاکٹر تقی عابدی نے بیان کیا ہے کہ اقبال نے نظام کو اپنی فارسی کی کتاب ’’رموز بیخودی‘‘ پیش کی۔ اور ان سے خواہش ظاہر کی کہ ان کے پاس جو چمکدار ہیرا ہے وہ دیکھایا جائے اور اقبال کے ہیرا دیکھنے کی خواہش پر نظام نے انہیں فوراً وہ ہیرا منگوا کے دکھایا تھا۔ ایک اور بات بھی اقبال سے منسوب کی جاتی ہے کہ نظام دکن نے اقبال سے شکایت کی کہ ہم دہلی گئے ہوئے تھے جہاں لاہور قریب تھا مگر تم ہم سے ملنے نہیں آئے۔ جس کے جواب میں اقبال نے بیماری کے متعلق بتایا تھا اور کہا تھا کہ اب اسی لیے ڈیڑھ ہزار میل کی مسافت طے کر کے آیا ہوں۔ تو نظام نے ان کو وزیر قانون بننے کی پیش کش کی تھی۔ لیکن جاوید اقبال نے اس کی تردید کی ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال تحریر کرتے ہیں۔

> ’’درحقیقت نظام سے اقبال کی ملاقات محض ایک رسمی ملاقات تھی۔ اقبال نے ملاقات کے دوران میں نظام کو انجمن حمایت اسلام کے آئندہ

سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے پنجاب آنے کی دعوت دی جو نظام نے قبول کرلی۔ بعد میں اس سلسلے میں اقبال کی نظام کے ساتھ خط و کتابت بھی ہوئی لیکن بالآخر نظام اپنی بعض ناگزیر مجبوریوں کے سبب پنجاب نہ آسکے ۱۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو اقبال حیدر آباد سے لاہور روانہ ہوئے اور یوں جنوبی ہند کا یہ دلچسپ علمی دورہ اختتام پذیر ہوا۔'' (۳۸۳)

حواشی

۱ تقی عابدی، ڈاکٹر، سید، اقبال کے عرفانی زاویے (لاہور: اردو بازار ۲۰۰۱ء) ص ۲۱

۲ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۷۲ء)، ص ۹۰۶

۳ خواجہ حمید یزدانی، شرح ارمغان حجاز (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۱۰ء) ص ۲۳

۴ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ص ۹۰۷

۵ خواجہ حمید یزدانی، شرح ارمغان حجاز، ص ۲۴

۶ عابد علی عابد، سید، شعر اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۳ء)، ص ۱۶۳

۷ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۹۴ء)، ص ۹۰۶

۸ ایضاً، ص ۲۰۷

۹ سالک، عبدالمجید، ذکر اقبال (لاہور بزم اقبال، ۱۹۸۳ء)، ص ۲۳۷

۱۰ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اُردو)، ص ۴۰۵

۱۱ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ص ۹۰

۱۲ زیب النساء سرویا، اقبال کی رسولؐ سے وابستگی، ص ۷۴

۱۳ ایضاً، ص ۷۷

۱۴ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۱۲۸

۱۵ ایضاً، ص ۱۳۱

۱۶ زیب النساء سرویا، اقبال کی رسولؐ سے وابستگی، ص ۸۰

۱۷ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو)، ص ۲۱۷

۱۸ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ص ۲۵۶

۱۹ عابد علی عابد، سید مرتبہ شیما مجید نفائس اقبال (لاہور: اقبال اکادمی ۱۹۹۰ء)، ص ۱۸

۲۰ ایضاً، ص ۱۵۵

۲۱ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) ص ۴۱۷

۲۲ عابد علی عابد، سید، شعر اقبال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۳ء)، ص ۱۶۳

۲۳ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ص ۱۹

۲۴ بہار الہ آبادی، تفسیر اقبال (سرینگر کشمیر: گلشن پبلیشرز ۱۹۸۲ء)، ص ۳۶۲

۲۵ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۱۹
۲۶ اسلم جراجپوری، آثار اقبال، (دکن: حیدر آباد، ۱۹۴۶ء) ص ۹
۲۷ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو)، ص ۲۰۷
۲۸ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اقبال کی طویل نظمیں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز: ۲۰۰۹ء) ص ۲۳
۲۹ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو)، ص ۲۰۸
۳۰ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اقبال کی طویل نظمیں ، ص ۲۳
۳۱ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو)، ص ۱۹۸
۳۲ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۲۶
۳۳ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۲ء) ، ص ۶۶۰
۳۴ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۹۰۰
۳۵ خواجہ حمید یزدانی، شرح ارمغان حجاز، ص ۲۱
۳۶ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۹۰۱
۳۷ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۲۱
۳۸ جاوید اقبال ، ڈاکٹر ، زندہ رود ، ص ۶۱۸
۳۹ ایضاً ، ص ۵۲۲
۴۰ ایضاً ، ص ۹۰۶
۴۱ خواجہ حمید یزدانی، شرح ارمغان حجاز، ص ۳۳
۴۲ نذیر نیازی، سید، اقبال کے حضور (لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۸۱ء) ص ۶۰/۵۹
۴۳ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۲۸۱
۴۴ ایضاً ، ص ۹۱۰
۴۵ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۹۲۷
۴۶ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۱۵
۴۷ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) ، ص ۳۸۶
۴۸ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۱۷
۴۹ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) ، ص ۲۵۳
۵۰ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۲۰

۵۱ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۱۹
۵۲ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۲۰
۵۳ خواجہ حمید یزدانی، شرح بال جبریل (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۹ء)، ص ۱۴۱
۵۴ صابر کلوری، پروفیسر، اقبال ہم نشین (لاہور: مکتبہ خلیل ۱۹۸۵ء) ، ص ۷۷
۵۵ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۳
۵۶ نورالحسن، نوراللغات (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن ۱۹۸۵ء) ، ص ۴۷
۵۷ اردو معارف اسلامیہ (دوم) (لاہور: دانش گاہ پنجاب ۱۹۸۶ء) ، ص ۳۲۰
۵۸ ابوالاعلیٰ، مودودی، سید، تفہیم القرآن (چہارم) (لاہور: ترجمان القرآن ۱۹۸۸ء)، ص ۴۱۹
۵۹ منیر حسین، سید، اقبال کی دعائیہ شاعری، (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ۱۹۹۵ء)، ص ۶
۶۰ محمد یعقوب کلینی، شیخ، مرتبہ الثقافی (مترجم) سید ظفر حسین (کراچی: شمیم بکڈپو ۱۹۹۱ء) ص ۷۷
۶۱ محمد بن عیسیٰ، ترمذی، جامع ترمذی (دوم) مترجم محمد صدیق (لاہور: فرید بک سٹال ۱۹۸۴ء) ، ص ۵۶۴
۶۲ نذیر نیازی، سید، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (لاہور: بزم اقبال ۲۰۱۲ء) ، ص ۱۴۴
۶۳ ایضاً ، ص ۱۴۷
۶۴ خالد نظیر صوفی، اقبال درون خانہ (اوّل) (لاہور: اقبال اکادمی ۲۰۰۸ء)، ص ۱۷۷
۶۵ عشرت حسین انور، ڈاکٹر، اقبال کی مابعد الطبیعات (لاہور: اقبال اکادمی ۱۹۸۸ء)، ص ۱۳۵
۶۶ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) ، ص ۳۲
۶۷ محمد منور، میزان اقبال (دوم) (لاہور: اقبال اکادمی ۱۹۸۶ء) ، ص ۱۸
۶۸ محمد ریاض، ڈاکٹر، آفاق اقبال (لاہور: گلوب پبلیشرز ۱۹۸۷ء) ، ص ۱۰
۶۹ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (ا و) ، ص ۲۱۲
۷۰ منیر حسین، سید، اقبال کی دعائیہ شاعری، (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ۱۹۹۵ء)، ص ۹۶
۷۱ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۳
۷۲ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۳۹۶
۷۳ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۴

۷۴ ایضاً ، ص ۵
۷۵ ایضاً ، ص ۵
۷۶ محمد عبدالمعبود، تذکرہ اہل بیت اطہار، (راولپنڈی: الفتح پبلی کیشنز ۲۰۱۰ء) ، ص۲۹۶
۷۷ ایضاً ، ص ۲۹۷
۷۸ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۳۲۶
۷۹ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) ، ص ۶۸۰
۸۰ ایضاً ، ص ۳۵۵
۸۱ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۶۶
۸۲ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۱۱۰
۸۳ ایضاً ، ص ۱۱۱
۸۴ ایضاً ، ص ۱۱۱
۸۵ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۴۵
۸۶ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۱۱۰
۸۷ ایضاً ، ص ۱۱۰
۸۸ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۱۰۰
۸۹ ایضاً ، ص ۱۱۰
۹۰ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) ، ص ۳۶۵
۹۱ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۱۰۲۸
۹۲ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۴۳
۹۳ مظفر حسین، برنی، کلیات مکاتیب اقبال (اوّل) (دہلی: اردو اکادمی ۱۹۹۲ء)، ص ۶۱۴
۹۴ غلام یٰسین، رانا، بادہ وناب (لاہور: اولیس پبلشرز اُردو بازار ۲۰ء)، ص ۲۶
۹۵ محمد عبدالمعبود، تذکرہ اہل بیت اطہار ، ص۲۶۲
۹۶ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۱۵۲
۹۷ محمد عبدالمعبود، تذکرہ اہل بیت اطہار ، ص۲۷۵
۹۸ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۱۵۲
۹۹ مظفر حسین، برنی، کلیات مکاتیب اقبال (اوّل) (دہلی: اردو اکادمی ۱۹۹۲ء)، ص ۶۲۴

۱۰۰ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۴۱
۱۰۱ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۱۵۳
۱۰۲ ایضاً ، ص ۱۵۳
۱۰۳ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۴۳
۱۰۴ ایضاً ، ص ۳۳
۱۰۵ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۹۷
۱۰۶ ایضاً ، ص ۴۸
۱۰۷ محمد عبدالمعبود، تذکرہ اہل بیت اطہار ، ص ۱۰۸
۱۰۸ ایضاً ، ص ۱۱۱
۱۰۹ غلام یٰسین، رانا، بادہ وناب ، ص ۲۶
۱۱۰ محمد عبدالمعبود، تذکرہ اہل بیت اطہار ، ص ۱۱۱
۱۱۱ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۴۸
۱۱۲ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۴۷
۱۱۳ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۳۸
۱۱۴ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۳۰۱
۱۱۵ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) ، ص ۳۳۳
۱۱۶ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۳۵۴
۱۱۷ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۲۹
۱۱۸ بابر علی، سید، قصیدہ بردہ شریف (اسلام آباد: اکادمی ادبیات ۲۰۰۷ء) ، ص ۳۵
۱۱۹ دائرہ معارف اسلامیہ (لاہور: دانش گاہ پنجاب ۱۹۸۶ء) ، ص ۵۲
۱۲۰ ایضاً ، ص ۵۲
۱۲۱ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۲۹
۱۲۲ دائرہ معارف اسلامیہ ، ص ۵۲
۱۲۳ بابر علی، سید، قصیدہ بردہ شریف (اسلام آباد: اکادمی ادبیات ۲۰۰۷ء) ، ص ۳۶
۱۲۴ بابر علی، سید، قصیدہ بردہ شریف، ص ۳۷
۱۲۵ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۱۱۲

۱۲۶ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۳۰

۱۲۷ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۱۶۷

۱۲۸ انیلہ محمود، علامہ اقبال کا تصورتوحید (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء) ص ۹۴

۱۲۹ مظفر حسین، برنی، کلیات مکاتیب اقبال (اوّل) ، ص ۷۰۷

۱۳۰ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۲۹۴

۱۳۱ مظفر حسین، برنی، کلیات مکاتیب اقبال (دوم) (دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۱ء)، ص ۷۷

۱۳۲ ایضاً ، ص ۱۳۷

۱۳۳ ایضاً ، ص ۵۳۹

۱۳۴ مظفر حسین، برنی، کلیات مکاتیب اقبال (سوم) (دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۲ء)، ص ۳۹۷

۱۳۵ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۱۲۱

۱۳۶ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۱۲۲

۱۳۷ ایضاً ، ص ۲۵۱

۱۳۸ ایضاً ، ص ۲۵۱

۱۳۹ ایضاً ، ص ۲۷۷

۱۴۰ ایضاً ، ص ۲۷۷

۱۴۱ جاوید اقبال، ڈاکٹر ، زندہ رود ص ۲۷۶

۱۴۲ ایضاً ، ص ۲۷۶

۱۴۳ ایضاً ، ص ۲۷۸

۱۴۴ ایضاً ، ص ۲۷۸

۱۴۵ ایضاً ، ص ۲۸۲

۱۴۶ ایضاً ، ص ۲۸۴

۱۴۷ ایضاً ، ص ۲۸۵

۱۴۸ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۲۸۵

۱۴۹ ایضاً ، ص ۳۸۷

۱۵۰ مظفر حسین برنی، کلیات مکاتیب اقبال، ص ۴۸۵

۱۵۱ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۲۸۵

۱۵۲ ایضاً ، ص ۲۹۱

۱۵۳ عبدالمجید سالک ، ذکر اقبال ، (لاہور: بزم اقبال،۱۹۸۳ء)، ص ۱۴۸

۱۵۴ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۱۱۸

۱۵۵ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۴۳۹

۱۵۶ ایضاً ، ص ۴۲۹

۱۵۷ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۴۹

۱۵۸ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۱۱۹

۱۵۹ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۴۳۰

۱۶۰ ایضاً ، ص ۴۳۰

۱۶۱ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۸۳ء) ، ص ۱۴۸

۱۶۲ وحیدالدین، فقیر، سید، روزگار فقیر (اوّل) (کراچی: لائن آرٹ پریس، ۱۹۶۶ء)، ص۸۱

۱۶۳ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۹۸

۱۶۴ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۱۲۰

۱۶۵ ایضاً ، ص ۱۲۰

۱۶۶ ایضاً ، ص ۱۲۱

۱۶۷ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال ، ص ۲۹۴

۱۶۸ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۷۶۰

۱۶۹ ایضاً ، ص ۷۶۰

۱۷۰ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۷۶۰

۱۷۱ ایضاً ، ص ۷۶۸

۱۷۲ غلام احمد پرویز، علامہ، شرح جاوید نامہ (لاہور: ادارہ طوع اسلام، ۲۰۱۳ء)، ص ۴۹۰

۱۷۳ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۷۶۸

۱۷۴ غلام احمد پرویز، علامہ، جاوید نامہ ، ۴۹۰

۱۷۵ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۷۹۹

۱۷۶ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۱۲۲

۱۷۷ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۷۶۹

۱۷۸ ایضاً ، ص ۷۷۰

۱۷۹ غلام احمد پرویز، علامہ، جاوید نامہ، ص ۶۹۳

۱۸۰ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۷۷۰

۱۸۱ غلام احمد پرویز، علامہ، جاوید نامہ، ص ۶۹۴

۱۸۲ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۷۷۱

۱۸۳ غلام احمد پرویز، علامہ، جاوید نامہ، ص ۶۹۴

۱۸۴ ایضاً ، ص ۶۹۵

۱۸۵ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۷۷۱

۱۸۶ غلام احمد پرویز ، علامہ ، جاوید نامہ ، ص ۶۹۶

۱۸۷ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۸۰

۱۸۸ ایضاً ، ص ۸۱

۱۸۹ مظفر حسین، برنی، کلیات مکاتیب اقبال (اول) ، ص ۴۸۵

۱۹۰ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۲۶۹

۱۹۱ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۸۳

۱۹۲ ایضاً ، ص ۸۲

۱۹۳ ایضاً ، ص ۸۲

۱۹۴ مظفر حسین، برنی، کلیات مکاتیب اقبال (دوم) ، ص ۴۳۹

۱۹۵ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۱۲۷

۱۹۶ ایضاً ، ص ۱۲۸

۱۹۷ وحید الدین، فقیر، سید، روزگار فقیر ، ص ۱۵۲

۱۹۸ وحید الدین، فقیر، سید، روزگار فقیر ، ص ۱۵۳

۱۹۹ ایضاً ، ص ۱۵۴

۲۰۰ ایضاً ، ص ۱۶۰

۲۰۱ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۱۳۱

۲۰۲ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۳۹۰

۲۰۳ مظفر حسین، برنی، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم) (دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۸ء) ص ۴۸۷

۲۰۴ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۳۹۰

۲۰۵ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، ص ۶۷۱

۲۰۶ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے، ص ۹۰

۲۰۷ ایضاً، ص ۱۰۰!

۲۰۸ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، ص ۹۴

۲۰۹ ایضاً، ص ۹۹

۲۱۰ ایضاً، ص ۹۴

۲۱۱ ایضاً، ص ۹۴

۲۱۲ ایضاً، ص ۹۴

۲۱۳ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، ص ۱۵

۲۱۴ عبداللہ قریشی، محمد، حیات جاوداں (لاہور: زم اقبال ۱۹۸۷ء)، ص ۱۰۵

۲۱۵ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے، ص ۱۰۰

۲۱۶ ایضاً، ص ۱۰۱

۲۱۷ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، ص ۲۰۰

۲۱۸ مظفر حسین، برنی، کلیات مکاتیب اقبال (اول) ص ۱۷۳

۲۱۹ نذیر نیازی، سید، دانائے راز (لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۸۸ء)، ص ۷۷

۲۲۰ ایضاً، ص ۷۸

۲۲۱ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، ص ۲۰۲

۲۲۲ ایضاً، ص ۶۰۱

۲۲۳ مظفر حسین، برنی، کلیات مکاتیب اقبال (سوم) ص ۱۹۹

۲۲۴ مظفر حسین، برنی، کلیات مکاتیب اقبال (سوم) ص ۲۰۸

۲۲۵ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے، ص ۱۰۴

۲۲۶ ایضاً، ص ۱۵۳

۲۲۷ عابد علی عابد، سید، شعر اقبال، ص ۴۷

۲۲۸ عابد علی عابد، سید، سفر اقبال، ص ۴۷

۲۲۹ ذکر اقبال، عبدالمجید سالک ص ۶۱

۲۳۰ ایضاً ، ص ۶۳

۲۳۱ ایضاً ، ص ۶۹

۲۳۲ ایضاً ، ص ۶۹

۲۳۳ جاویداقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۹۲

۲۳۴ مظفرحسین، برنی، کلیات مکاتیب اقبال (اول) ص ۷۹

۲۳۵ ایضاً ، ص ۴۱۷

۲۳۶ جاویداقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۹۳

۲۳۷ مظفرحسین، برنی، کلیات مکاتیب اقبال (دوم) ص ۸۳

۲۳۸ جاویداقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۱۰۸

۲۳۹ عبدالمجید سالک، ذکراقبال، ص ۱۱

۲۴۰ جاویداقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۴۷

۲۴۱ نذیرنیازی، سید، دانائے راز، ص ۱۲

۲۴۲ ایضاً ، ص ۳۵

۲۴۳ جاویداقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۸۳

۲۴۴ نذیرنیازی، سید، دانائے راز، ص ۲۶

۲۴۵ جاویداقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۸۴

۲۴۶ محمداقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اُردو) ، ص ۹۷

۲۴۷ محمداقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اُردو) ، ص ۸۵

۲۴۸ وحیدالدین، فقیر، سید، روزگارفقیر ، ص ۹۲

۲۴۹ عبدالمجید سالک، ذکراقبال، ص ۲۱

۲۵۰ نذیرنیازی، سید، دانائے راز، ص ۳۵

۲۵۱ جاویداقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۸۴

۲۵۲ عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر، روایات اقبال (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء)، ص ۲۴

۲۵۳ وحیدالدین، فقیر، سید، روزگارفقیر ، ص ۱۲۷

۲۵۴ نذیرنیازی، سید، دانائے راز، ص ۳۷

۲۵۵ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، اقبال عرفانی زاویے ، ص ۱۴۵

۲۵۶ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، ص ۸۴

۲۵۷ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۱۴۵

۲۵۸ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص

۲۵۹ ایضاً ، ص ۹۲

۲۶۰ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، ص ۱۵

۲۶۱ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۹۱

۲۶۲ ایضاً ، ص ۹۱

۲۶۳ ایضاً ، ص ۹۱

۲۶۴ غلام حسین ذوالفقار، پروفیسر، ڈاکٹر، اقبال کا ذہنی وفکری ارتقاء (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۹۸ء) ، ص ۱۳

۲۶۵ ایضاً ، ص ۱۴

۲۶۶ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۹۳

۲۶۷ غلام حسین ذوالفقار، پروفیسر، ڈاکٹر، اقبال کا ذہنی وفکری ارتقاء ، ص ۱۴

۲۶۸ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال ، ص ۷۸

۲۶۹ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود ، ص ۱۲۳

۲۷۰ ایضاً ، ص ۱۲۴

۲۷۱ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۲۲

۲۷۲ ایضاً ، ص ۴۸

۲۷۳ رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر، اقبال کا تصور زمان ومکاں (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۲ء)، ص ۸۳

۲۷۴ نذیر نیازی، سید، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ (لاہور بزم اقبال، ۲۰۱۲ء)، ص ۸۴

۲۷۵ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۶۶۲

۲۷۶ نذیر نیازی، سید، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ، ص ۷۷

۲۷۷ رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر، اقبال کا تصور زمان ومکاں ، ص ۸۴

۲۷۸ ایضاً ، ص ۸۷

۲۷۹ ایضاً ، ص ۸۸

۲۸۰ ایضاً ، ص ۹۰

۲۸۱ ایضاً ، ص ۹۴

۲۸۲ ایضاً ، ص ۹۶

۲۸۳ ایضاً ، ص ۹۷

۲۸۴ ایضاً ، ص ۹۸

۲۸۵ ایضاً ، ص ۹۹

۲۸۶ رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر، اقبال کا تصور زمان ومکاں ، ص ۱۰۲

۲۸۷ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۶۱۲

۲۸۸ ایضاً ، ص ۶۱۱

۲۸۹ ایضاً ، ص ۶۱۳

۲۹۰ رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر، اقبال کا تصور زمان ومکاں ، ص ۱۲۲

۲۹۱ یوسف حسین خان، ڈاکٹر، روح اقبال (لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۴ء)، ۳۴۹

۲۹۲ ایضاً ، ص ۱۳۱

۲۹۳ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۴۷

۲۹۴ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اُردو) ، ص ۴۲۱

۲۹۵ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۲۵۹

۲۹۶ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص۳۵۲

۲۹۷ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) ، ص ۴۷۷

۲۹۸ ایضاً ، ص ۳۸۵

۲۹۹ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۲۶۰۲

۳۰۰ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۵۳

۳۰۱ انعام الحق کوثر، ڈاکٹر، اقبالیات کے چند خوشے (کوئٹہ: سیرت اکادمی، ۱۹۹۶ء)، ص۳۴

۳۰۲ ایضاً ، ص ۳۴

۳۰۳ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اُردو) ،ص ۳۷۴

۳۰۴ ایضاً ، ص ۳۷۶

۳۰۵ ایضاً ، ص ۳۵۳

۳۰۶ ایضاً ، ص ۴۹۸
۳۰۷ ایضاً ، ص ۳۰۶
۳۰۸ ایضاً ، ص ۴۱۲
۳۰۹ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۵۶
۳۱۰ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) ، ص ۴۵۶
۳۱۱ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۵۶
۳۱۲ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) ، ص ۴۵۷
۳۱۳ بہار آلہ آبادی، تفسیر اقبال ، ص ۱۵۹
۳۱۴ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، عرفانی زاویے ، ص ۵۷
۳۱۵ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۲۷۲
۳۱۶ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) ، ص ۴۵۷
۳۱۷ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۳-۲۷
۳۱۸ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے (لاہور: گنج شکر پریس، ۲۰۱۲ء)، ص ۵۲۲
۳۱۹ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) ، ص ۳۷۸
۳۲۰ ایضاً ، ص ۲۳۴
۳۲۱ ایضاً ، ص ۴۵۷
۳۲۲ عابد علی عابد، سید، شعر اقبال، ص ۲۱۴
۳۲۳ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اردو) ، ص ۴۱۷
۳۲۴ ایضاً ، ص ۳۵۰
۳۲۵ ایضاً ، ص ۴۰۸
۳۲۶ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۹۲
۳۲۷ خالد نظیر صوفی، اقبال درون خانہ، ص ۳۸
۳۲۸ عبدالمجید سالک ، ذکر اقبال، ص ۷۰
۳۲۹ خالد نظیر صوفی، اقبال درون خانہ، ص ۸۵
۳۳۰ ایضاً ، ص ۸۵
۳۳۱ ایضاً ، ص ۸۵

۳۳۲ ایضاً ص ۸۶
۳۳۳ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۹۴
۳۳۴ ایضاً ، ص ۹۵
۳۳۵ ایضاً ، ص ۹۵
۳۳۶ عبدالمجید سالک ، ذکر اقبال، ص ۷۱
۳۳۷ تقی عابدی، سید، عرفانی زاویے ، ص ۹۷
۳۳۸ ایضاً ، ص ۹۷
۳۳۹ وحیدالدین، فقیر، سید، روزگار فقیر ، ص ۱۰۰
۳۴۰ خالد نظیر صوفی، اقبال درون خانہ، ص ۹۳
۳۴۱ ایضاً ، ص ۹۴
۳۴۲ غلام حسین ذوالفقار، اقبال کا ذہنی وفکری ارتقاء، ص ۱۲
۳۴۳ نذیر نیازی، سید، دانائے راز ، ص ۴۷
۳۴۴ ایضاً ، ص ۱۲
۳۴۵ عبدالمجید سالک ، ذکر اقبال ، ص ۴۷
۳۴۶ ایضاً ، ص ۴۷
۳۴۷ ایضاً ، ص ۱۵
۳۴۸ جاوید اقبال، ڈاکٹر ، زندہ رود ، ص ۲۰۱
۳۴۹ ایضاً ، ص ۲۰۰
۳۵۰ مظفر حسین برنی، کلیات مکاتیب اقبال (اوّل) ، ص ۱۷۳
۳۵۱ جاوید اقبال، ڈاکٹر ، زندہ رود ، ص ۲۰۱
۳۵۲ ایضاً ، ص ۲۰۲
۳۵۳ ایضاً ، ص ۲۰۲
۳۵۴ فریدہ الٰہی ، علامہ اقبال اور تحریک آزادی فلسطین (اسلام آباد: جاوداں پبلیکشرز ۲۰۰۷ء)، ص ۲۴
۳۵۵ ایضاً ، ص ۴۳
۳۵۶ مظفر حسین برنی، کلیات مکاتیب اقبال (دوم)، ص ۳۲۸
۳۵۷ فریدہ الٰہی ، علامہ اقبال اور تحریک آزادی فلسطین ، ص ۵۱

۳۵۸ جاوید اقبال، ڈاکٹر ، زندہ رود ، ص ۵۲۵

۳۵۹ ایضاً ، ص ۵۲۶

۳۶۰ ایضاً ، ص ۵۲۶

۳۶۱ ایضاً ، ص ۳۲۹

۳۶۲ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، عرفانی زاویے ، ص ۱۴۱

۳۶۳ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی) ، ص ۲۹۹

۳۶۴ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اُردو)، ص ۶۱۸

۳۶۵ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، عرفانی زاویے ، ص ۱۶۳

۳۶۶ ایضاً ، ص ۶۳

۳۶۷ مظفر حسین برنی، کلیات مکاتیب اقبال (چہارم) ، ص ۵۹۳

۳۶۸ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، عرفانی زاویے ، ص ۱۶۶

۳۶۹ محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اُردو)، ص ۲۶۶

۳۷۰ ایضاً ، ص ۱۰۲

۳۷۱ فریدہ الٰہی، علامہ اقبال اور تحریک آزادی فلسطین ، ص ۱۹۰

۳۷۲ ایضاً ، ص ۹۶

۳۷۳ جاوید اقبال، ڈاکٹر ، زندہ رود ، ص ۹۳

۳۷۴ ایضاً ، ص ۱۷۴

۳۷۵ نظیر حیدر آبادی، اقبال اور حیدر آباد (لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۸۱ء) ، ص ۱۸

۳۷۶ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، عرفانی زاویے ، ص ۸۴

۳۷۷ جاوید اقبال، ڈاکٹر ، زندہ رود ، ص ۱۷۶

۳۷۸ تقی عابدی، سید، ڈاکٹر، عرفانی زاویے ، ص ۸۸

۳۷۹ جاوید اقبال، ڈاکٹر ، زندہ رود ، ص ۱۷۸

۳۸۰ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال ، ص ۱۴۹

۳۸۱ جاوید اقبال، ڈاکٹر ، زندہ رود ، ص ۴۳۶

۳۸۲ ایضاً ، ص ۴۳۳

باب چہارم

ڈاکٹر تقی عابدی کی علمی زندگی میں مطالعہ اقبال کی اہمیت و معنویت

شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کی حیات شخصیت اور شعری و ادبی خدمات کو بہت سے مصنفین نے
پنی تحقیق و تجزیے کا عنوان بنایا ہے۔ اقبال سے متعلق موضوعات اور جہات پر توجہ دی ہے۔ ڈاکٹر تقی
ابدی نے اپنے گراں قدر علمی و ادبی تحقیق کے پیش نظر محقق ہونے کی بناء پر اقبال پر لکھنے کے لیے
ئے نئے ادبی گوشے تلاش کر لیے ہیں۔ اقبال کے ساتھ غیر معمولی وابستگی، عرق ریزی ان پر لکھی گئی
کتب سے عیاں ہوتی ہے۔ تقی عابدی نے چوں مرگ آید لکھ کر اقبالیات کے پیاسوں کو ایک نیا رُخ
یا ہے۔ اس سے پہلے اقبال کی علالت اور ان کی زندگی کے آخری دنوں پر سید نذیر نیازی، خالد نذیر
سوفی، جاوید اقبال، فقیر سید وحید الدین، عبدالمجید سالک، صہبا لکھنوی، ممنون حسن خان، غلام رسول
ہر اور بہت سے دوسرے اصحاب نے لکھا۔ لیکن تقی عابدی نے اقبال کے مکاتیب کو مستند حوالوں کے
ور پر بہت ہی عمدگی سے استعمال کر کے ان کی بیماریوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اقبال کے عوارض کے
ختلف پہلوؤں پر بہت باریک بینی سے نگاہ ڈالی ہے۔ بہت سے پہلو ایسے تھے جو تقی عابدی کی توجہ
ے پہلے نظر انداز کیے جاتے رہے تھے۔ عوارض چشم، عوارض گردہ، عوارض قلب، پھیپھڑوں کی
کالیف، درد گلو، ملیریا، اور کم خوابی غرض اقبال تاحیات جن جن بیماریوں میں مبتلا رہے تقی عابدی نے
ی نقطہ نظر سے ہر ایک پر نگاہ ڈالی ہے اور بہت سے پوشیدہ راز افشاں کرنے کی کامیاب کوشش کی
ہے۔ اقبال کی غذائی عادتوں کو بھی موضوع فکر بنایا گیا ہے۔ تیس سے پچیس سال تک تمباکو نوشی کرنا
ور ورزش سے پرہیز نے ان کی طبیعت کو مزید بگاڑا تھا۔ مُرغن غذاؤں کا استعمال اور چرب کھانے،
ی گھی، نمک، میٹھے کا مسلسل استعمال، اکسیر، معجونوں، اور کشتوں کا استعمال جن میں سونے چاندی
ور دیگر دھاتیں وغیرہ شامل تھیں، اقبال کے قلب و جگر کو کمزور کر دیا۔ شلغم کا اچار اور سوڈے کا استعمال

تبخیر معدہ پر مُضر اثرات ڈالتا رہا۔ مصنف نے اس بات کا اعتراف بھی کیا کہ اقبال وہ خوش قسمت ہستی تھے جن کو علاج کے لیے بڑے بڑے ڈاکٹر اور حکیم علاج کے لیے مہیا میسر تھے وہ فردوسی، عطار، حافظ اور جعفر زٹلی وغیر کی طرح بدنصیب نہ تھے کہ ان کو قتل کر دیا گیا یا مفلسی کی موت نے ان کو آگھیرا۔ اقبال بہت سی موذی بیماریوں میں گرفتار رہے اور اکسٹھ باسٹھ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اقبال کے مرض معمولی نوعیت کے نہ تھے۔ اس کے تدراک کے لیے اقبال نے بہت سے ڈاکٹروں اور حکیموں کو خطوط لکھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ان خطوط کو ہی مستند حوالے کے طور پر استعمال کر کے چوں مرگ آید لکھی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ اقبال نے ایلو پیتھک اور ہومیو پیتھک سے کس حد تک استفادہ کیا۔ اقبال کے روزمرہ کے معمولات اور نظام اوقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مسواک سے لے کر خوراک اور اجابت تک کے مسائل جو عموماً بیان نہیں کیے جاتے ان کو تقی عابدی نے شامل گفتگو کیا ہے۔ تقی عابدی نے بہت ہی عمدگی سے اقبال کی ذہنی کیفیت ہمت اور استقلال کو بھی بڑے پُر سوز انداز میں بیان کیا ہے۔ تقی عابدی نے چوں مرگ کے دیباچے میں بتایا ہے کہ جان انسان کی سب سے پیاری چیز ہے جب جان خطرے میں پڑ جاتی ہے تو جذبات کی گہرائیوں سے ایسے افکار ابلتے ہیں جو آب زلال سے بھی خالص اور بغیر کسی ملاوٹ اور بناوٹ کے ہوتے ہیں۔ عمر اور بیماری کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انسان کی قوت احساس بھی بڑھ جاتی ہے جب کہ قوت بدنی کم ہو جاتی ہے۔ اس کشمکش زیادہ اور کم سے جو جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا ہے اس کا سرچشمہ جو اقبال کی کئی آخری عمر کی نظموں میں نظر آتا ہے، قابل تفکر و تائید ہے۔

اس کتاب کا لفظ بہ لفظ خطوط کے متن آئینے میں پرکھ کر منتخب کیا گیا ہے۔ جو اقبالیات کے طالب علموں کے لیے ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کی تقریباً بیس سے زیادہ بیماریوں کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ جن کے لیے تیس سے زیادہ معالجین جن میں حکیم، ڈاکٹر اور دلسوز پرستاروں کا ذکر بھی بطور خاص کیا گیا ہے۔ بیماری قلب کا ذکر کرتے ہیں تو اقبال کی تیس پچیس سال کی عادتوں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ تمباکو نوشی کی کثرت، ورزش کا فقدان، مرغن غذاؤں کا استعمال جن میں چربی اور دیسی گھی وغیرہ شامل ہے۔ قلبی امراض کی شدت میں نمک اور میٹھے کا زیادہ

استعمال بھی تھا۔ اکسیروں معجونوں اور کشتوں کا زیادہ استعمال تھا۔ جو قلب وجگر کے لیے مضر تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے امراض قلب کا ذکر کرتے ہوئے شراب نوشی اور اقبال کے متعلق غلط رائے کو بھی موضوع بنایا ہے کہ اقبال ہرگز شراب نوش نہ تھے بلکہ شراب نوشی کو خودکشی کے مترادف قرار دیتے تھے۔ وہ غیر اسلامی طریقوں سے ذبح شدہ گوشت نہ کھاتے تھے تو وہ شراب نوشی کس طرح کر سکتے تھے۔ طب سے تعلق کی بناء پر تقی عابدی نے علامہ کی پھیپھڑوں کی بیماری کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جس میں برونکائٹس، برونشت، دمہ ام فی ضیما، ورم زکوی، اور نمونیا شامل ہے۔ تقی عابدی نے برونکائٹس، برونشت اور ام دمہ فی ضیما کو طبی طور پر (COPD) بتایا ہے۔ جو کہ Chronic Pulmonary Obstructive Diseases کا مخفف ہے۔ تقی عابدی نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت کی بناء پر یہ بھی بتایا ہے کہ یہ چاروں بیماریاں علت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن کم وبیش ان کے اثرات اور علاج کے طریقے مشترکہ ہیں اقبال کی آخری عمر میں سب سے بڑی پریشانی آواز کا بیٹھ جانا تھا۔ تقی عابدی نے اس نادر کتاب میں اس مسئلے کو بہت ہی غائرانہ نظر سے دیکھا ہے اور آواز کے بیٹھ جانے میں جن عوامل کا عمل دخل ہے اُن پر طبی نقطہ نظر سے نگاہ ڈالی ہے۔ جن میں (Vocal Card) آلہ صوت اور اناٹومی شامل ہے۔ ووکل کارڈس ہجرہ یا Larynx کے اندر تنے ہوئے پردے ہوتے ہیں۔ ان پردوں میں جو باریک تار حرکت میں لائے جا سکتے ہیں اور ان کے تنگ اور ڈھیلے ہونے سے آواز پیدا ہوتی ہے انہیں حقیقی ووکل کارڈ True Vocal Card کہتے ہیں جن میں اعصاب یا نرو کو (Recurrent Laryhgeal nerve) کہتے ہیں اسی نرو (Nerve) کی وجہ سے ووکل کارڈ میں حرکت اور اسی حرکت سے ہوا کی نالی سے خارج ہونیوالی ہوا کی مدد سے آواز پیدا ہوتی ہے چنانچہ آواز کے لیے ووکل کارڈ اور نرو دونوں لازم ہیں۔ اگر اس کی وجہ سے نرو قطع ہو جائے یا نرو پر دباؤ پڑنے سے اس کے کام میں فرق ہو جائے تو آواز ختم ہو جاتی ہے۔

آواز کے بیٹھ جانے کی وجہ سے بھوپال میں تین مرتبہ بجلی کا علاج ہوا۔ تقی عابدی نے اس کتاب میں ریح کے عارضہ، قبض، درد قولج، دانتوں کے درد کے ساتھ ساتھ اقبال کی کم خوابی کی بیماری کا بھی ذکر کیا ہے۔ کم خوابی کی وجہ بیماریاں تھیں۔ تقی عابدی نے علاج کے دوران طبی اور انگریزی علاج کا مطالعہ بھی ایک عمدہ تقابلی اسٹیڈی کے طور پر کیا ہے کہ اقبال اگرچہ طبی علاج کے

خواہاں تھے لیکن انہوں نے ایلو پیتھک علاج سے بھی حسب ضرورت فائدہ اٹھایا۔ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ اقبال کے حوصلے اور طبیعت کے تلاطم کو بھی موضوع بنایا کہ اقبال بہت ہی عالی حوصلگی کے مالک تھے۔ جب لاہور کے ریڈیالوجسٹ ڈاکٹر ڈک سینے کے ایکس ریز کے معائنہ کے بعد علامہ کے سینے میں مہلک ٹیومر کی تشخیص دیتے ہیں تو اقبال حوصلے کا دامن تھامے رکھتے ہیں وہ زندگی اور موت کے مباحث میں مشغول نظر آتے ہیں۔تقی عابدی نے بیماریوں کے ساتھ ساتھ ادویات کا ذکر کرنا بھی مناسب خیال کیا ہے۔طبی ادویات کو الگ اور ایلو پیتھک ادویات کو الگ جگہ دی ہے۔طبی ادویات میں روح الذہب، حب تقویت، صلب روح الذہب، جدید، گاؤزبان عنبری، دوالمسک، گل قند، جواہر مہرہ، لیپ (جو چار گوندوں سے بنایا جاتا ہے) سرمہ، روغن گل، موتی منجن، روغن اوجاع، اکیسر آئل لفٹ کی پٹی (جو غلول میں ڈبو کر لگائی جاتی تھی)۔ بہی دانہ، تربت شربت عناب، شرب بنفشہ (Embrocation Dintment) اور ایلو پیتھک ادویات میں نیند کی گولیاں، فروٹ سالٹ Mersyles کا انجیکشن، اموینم کلورائیڈ اور گلسیرین شامل کی ہے۔

تقی عابدی نے اس کتاب میں اقبال کی وقت سے پہلے موت کو بھی ثابت کیا ہے۔ پیشے کے اس طبیب اور ادب کے مریض نے اقبال کی عمر کے متعلق پیش گوئی کی ہے کہ شاعر مشرق حکیم الامت نے بیس سال عمر کم پائی ہے۔اس سے پہلے یہ کام کسی تحقیق نگار نے نہیں کیا کہ اقبال کی عمر کے متعلق تخمینہ لگا سکے۔تقی عابدی نے یہاں میر انیس کا شعر موت کی حقیقت کو واضح کرنے کے لے نقل کیا ہے۔

جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب سرور عالم نہ رہے کون رہے گا

طویل عمر موروثی بھی ہوتی ہے۔تقی عابدی نے اقبال کی عمر کو میڈیکل سائنس کے شعبہ Genetics Tree کے ذریعے ثابت کیا ہے۔اگر اقبال بیماریوں سے محفوظ رہتے تو ابھی بیس سال اور جی سکتے تھے۔تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق موروثی طوالانی عمر میں مہلک اور وبائی بیماریوں سے محفوظ رہنے کی طاقت یا (Immunity) بھی رہتی ہے۔اسی وجہ سے تقی عابدی نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ علامہ اقبال کم زور پھیپھڑوں کو رکھتے ہوئے بھی ۱۹۱۸ء کے جان لیوا انفلیونزا جس سے کروڑوں افراد جان بحق ہوئے، محفوظ رہے۔یہی نہیں بلکہ اقبال (Cholera) ہیضہ، چیچک اور

طاعون سے بھی امان میں رہے۔ جنگ دوم کے اوائل میں عام لوگوں کی لمبی عمریں (۵۵) پچپن سال تھی۔ جو کہ آج کی طبیعی عمر ۷۰ سال کے برابر ہے۔ کیونکہ دور جدید میں بیماریوں کی تشخیص اور علاج کے طریقے بہت کار آمد ہیں اس لیے آج کے زمانے کی طبیعی عمر ستر سال ہے یہاں تک کہ طاقت ور Genese رکھنے والا سو سال کی عمر بھی جی سکتا ہے۔ اقبال کی عمر بھی موروثی تھی۔ اقبال کے خاندان کی عمریں کافی طویل تھی۔ والد کی عمر ۹۳ سال، والدہ کی عمر ۷۵ سال بھی، بہن، بیٹے سب نے اسی سال سے زیادہ کی عمر پائی۔ اقبال کے بیٹے جسٹس جاوید اقبال جو ابھی حیات ہیں ۸۳ سال اور بیٹی منیرہ بیگم ۷۷ سال سے زائد سال کی عمر گزار رہے ہیں۔ اقبال کی کم عمری ان کی بیماریوں کی وجہ سے تھی۔ پھر ان بیماریوں کے علاج کے لیے شدید یونانی علاج جس میں Drug effect کے مضر اثرات شامل تھے۔ انہوں نے بھی اقبال کی اوسط عمر پر اثر ڈالا۔ تقی عابدی نے خاصی تحقیق کے بعد اس کتاب میں اقبال کے خاندان کی اوسط عمروں کا ایک جدول بھی ترتیب دیا ہے اس جدول میں ان افراد کا اقبال سے کیا رشتہ تھا افراد کے نام، تاریخ ولادت، تاریخ وفات اور پھر اوسط عمر دی ہے۔ جن افراد کی تقی عابدی کو تاریخ ولادت اور تاریخ وفات نہ مل سکی ان کے ساتھ انہوں نے نامعلوم لکھ دیا۔ اوسط عمر کے ساتھ جن افراد کی موت کسی بیماری کی وجہ سے ہوئی تقی عابدی نے اس بیماری کا بھی ذکر کیا ہے۔ میں نے بھی تقی عابدی کی اس اعلیٰ تحقیق کو اپنے اس باب کا حصہ بنایا ہے تاکہ اقبال شناسوں کو میری اس تحقیق کا مطالعہ کرتے ہوئے تقی عابدی کی اس تحقیق سے خاطر خواہ فائدہ حاصل ہو۔ اور وہ اقبال کی طبیعی عمر میں کمی کی وجہ سے جاننے کے ساتھ ساتھ ان کے خاندان کی عمروں کے متعلق بھی جان سکیں۔

رشتہ	نام	ولادت	وفات	عمر
	شیخ محمد اقبال	۱۸۷۷ء	۱۹۳۸ء	۶۱ سال کچھ مہینے
والد	شیخ نور محمد	۱۸۳۷ء	۱۹۳۰ء	۹۳ سال
والدہ	امام بی بی	۱۸۴۰ تخمیناً	۱۹۱۴ء	۷۵ سال
بڑے بھائی	شیخ عطا محمد	۱۸۵۹ء	۱۹۴۰ء	۸۱ سال

بڑی بہن	طالع بی بی	۱۸۷۰ء	۱۹۰۲ء	۳۲ سال کی عمر میں وبا کا شکار ہو کر مر گئی
بڑی بہن	فاطمہ بی بی	نامعلوم	نامعلوم	نامعلوم
چھوٹی بہن	کریم بی بی	۱۸۷۸ء	۱۹۵۸ء	۸۰ سال
چھوٹی بہن	زینت بی بی	نامعلوم	نامعلوم	نامعلوم
بڑی بیٹی	معراج بانو	۱۸۹۵ء	۱۹۱۴ء	۱۹ سال کی عمر میں ٹی بی سے مر گئی
بڑا بیٹا	آفتاب اقبال	۱۸۹۸ء	۱۹۷۹ء	۸۱ سال
چھوٹا بیٹا	جاوید اقبال	۱۹۲۴ء	حیات	۸۳ سال
چھوٹی بیٹی	منیرہ بیگم	۱۹۳۰ء	حیات	۷۷ سال

یہ جدول پڑھنے کے بعد اقبال کے خاندان کی اوسط عمریں بہت ہی تفصیل سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر تقی عابدی نے مختلف خطوط کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ اقبال نے وبائے جہانی سے نجات صرف Genes کے طاقت ور ہونے کی وجہ سے حاصل کی۔ تقی عابدی نے اس کتاب میں اقبال کی بیماریوں پر تو تحقیق کی ہی ہے اور وہ اس میں مکمل طور پر کامیاب بھی رہے ہیں، لیکن ان کا تحسین آمیز کارنامہ ان اُمور کی نشاندہی ہے جو اقبال علالت کے باعث مکمل نہ کر سکے۔ ان میں صف اول پر نامکمل کام اقبال کے وہ قرآنی نوٹس تھے جو مقدمہ القرآن کہلاتے ہیں۔ اقبال کو تلاوت سے بچپن سے ہی شغف تھا آخری عمر تک اقبال قرآن پاک کی تلاوت خوش الحانی سے کرتے تھے۔ مگر عمر کے آخری حصے میں آواز کے بیٹھ جانے کی وجہ سے تلاوت کے قابل نہ رہے تھے جس کا اقبال کو بہت زیادہ افسوس تھا۔ اقبال اپنے اس مطالعے کو ''مقدمہ القرآن'' کی صورت میں احاطۂ تحریر میں لانا چاہتے تھے۔ مگر ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ اقبال کو یہ شدید خواہش رہی کہ ان کی صحت اچھی ہو جائے اور وہ اس قابل ہو سکیں کہ مسلمانان عالم کے لیے اپنی بہترین کتاب پیش کر سکیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس کے ساتھ اس کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جو اقبال بیماری کی وجہ سے نہ لکھ پائے۔ اس کتاب کا نام ''ایک فراموش شدہ پیغمبر'' تھا۔ جو صحیفہ کی شکل میں اقبال تحریر میں

لانا چاہتے تھے۔ ان دونوں کتابوں کو مکمل کرنے کی خواہش پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی کیونکہ ضعفِ علالت نے اجازت نہ دی۔ اور یہ خواہش اقبال کی حسرت بن کر دل کی دل میں ہی رہ گئی۔ اقبال انگریزی زبان میں اسلام کے فلسفہ قانون پر ایک کتاب لکھنے کے متمنی تھے۔ میاں محمد شفیع کو اپنی آخری علالت کے زمانے میں کچھ نوٹس بھی بھیجے تھے مگر یہ کتاب بھی دوسری کتابوں کی طرح مکمل نہ ہو سکی۔ تقی عابدی نے اس کتاب کا نام "Construction of Islamic Jurisprudence" بتایا ہے۔ علالت کی وجہ سے اقبال رہوڈر لیکچر بھی نہ دے سکے تھے۔

ان تمام چیزوں کا ادھورا پن صرف اقبال کی علالت کی وجہ سے رہا۔ اور ان بیماریوں کی وجہ سے اقبال متعدد علمی کانفرنسوں، جلسوں اور جشنوں میں شرکت نہ کر سکے۔ فردوسی کی ہزار سالہ جوبلی منانے کے لیے حکومت ایران نے بھی اقبال کو مدعو کیا لیکن اقبال نہ جا سکے۔ علامہ اقبال اپنی علالت سے نجات حاصل کر کے اردو ادب کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ مگر زندگی اب مہلت نہ دے رہی تھی۔ پھر گلے کی خرابی نے اقبال کو تقریر کرنے سے معذور کر دیا تھا اقبال اب صرف دھیمے لہجے میں بات کر سکتے تھے۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو جب اقبال کو "غالب ڈے" منانے کے لیے اینگلو عربک کالج اورینٹل کے وائس پریسڈنٹ سید خلیل احمد نے دعوت دی تو آپ نے گلے کا عذر بیان کرنے کے لیے اُن کو جو خط لکھا وہ کچھ یوں ہے۔

> "میں قریباً دو سال سے علیل ہوں۔ گلے کی بیماری ہے جس کی وجہ سے میں کسی قسم کی تقریر نہیں کر سکتا میں اس رسم کو ادا کرنا اپنے لیے سرمایہ افتخار جانتا ہوں مگر افسوس کہ علالت کی وجہ سے ایسا کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ میں آپ کی سوسائٹی کو غالب کی قدر شناسی پر مبارک باد دیتا ہوں۔"

اب اس عمر میں اقبال کی نظر بھی بہت کمزور ہو گئی تھی۔ خود لکھنے سے بھی معذور ہوتے جا رہے تھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ خطوط حمید صاحب سے لکھوایا کرتے تھے اور دستخط خود نیچے کر دیا کرتے تھے۔ پھر دستخط کرنے کی بھی ہمت نہ رہی۔ اقبال درون خانہ میں اقبال کی بھتیجی وسیمہ بیگم لکھتی ہیں کہ نانا جان قبلہ کی نظر بہت کمزور ہو گئی وہ خود کچھ لکھنے سے معذور ہو گئے۔ تو اکثر خطوط کے جوابات حمید صاحب سے لکھوایا کرتے تھے۔ البتہ خط کے نیچے دستخط خود کر دیا کرتے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا

کہ دستخط کرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ حمید صاحب ہی کو دستخط کرنے کی بھی اجازت دے دی گئی۔ آج بھی حمید صاحب کو یاد ہے کہ وہ کس طرح آپ کے دستخط کیا کرتے تھے۔ انہوں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے دستخط کر کے مجھے دکھائے جو شاعر مشرق کے دستخطوں سے کافی مشابہت رکھتے تھے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے یہاں وسیمہ بیگم جو عطا محمد کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں ان کا ایک واقعہ بھی تحریر کیا ہے کہ اقبال کو علالت کے باعث وسیمہ بیگم کی شادی میں عدم موجودگی کا بہت افسوس تھا۔ وسیمہ بیگم کو سردار بیگم نے دو سال کی عمر میں گود لے لیا تھا۔ وسیمہ بیگم کا قصہ بیان کرنے کے لیے تقی عابدی نے ان کے بیٹے خالد نظیر صوفی کا حوالہ دیا ہے مگر ان کی کتاب کا ذکر نہیں کیا وسیمہ بیگم شادی کے بعد اپنی ساس کے ساتھ سردار بیگم سے ملنے لاہور گئی۔ ان دنوں سردار بیگم کی ران پر پھوڑا نکلا ہوا تھا۔ جس کا آپریشن ہوا تھا سردار بیگم زار و قطار رونے لگ گئی مگر علامہ اقبال نے وسیمہ بیگم کو سردار بیگم کے رنجیدہ ہونے کی وجہ پر معذرت کا اظہار کیا کہ دونوں ہی سخت بیماری کی حالت میں ہے اور اپنی بیٹی کی شادی میں شریک نہ ہو سکے۔ وسیمہ بیگم بتاتی ہیں کہ اقبال ان دنوں بہت کمزور ہو گئے تھے ان کا چہرہ بہت ہی کمزور اور پیلا ہو چکا تھا۔ آپ کے گلے میں اس وقت بھی شدید تکلیف تھی۔ اور آپ بڑی مشکل سے بات کر رہے تھے۔ زور لگانے سے گلے کی رگیں پھول جاتیں اور چہرہ سرخ ہو جاتا۔

استقامت اور اُمید اقبال کی زندگی کا خاصہ تھی۔ استقامت اور توکل ان کے ایمان کا جز تھا۔ اتنی علالتوں کے باوجود بھی اقبال کے پایۂ استقامت میں لغزش نہ آئی تھی ان کا عزم پختہ رہا۔ آخری وقت تک حیات و ممات کے مسائل پر دلچسپی سے گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے عطیہ فیضی کو لکھے گئے خط کو بھی اسی گفتگو کا حصہ بنایا ہے۔ اقبال نے ۱۷ جولائی ۱۹۰۹ء کو عطیہ فیضی کو لکھا۔

> ''بلا شبہ ہر شخص کے لیے زندگی موت کے انتظار کا نام ہے میں اگلے جہاں کی سیر کا آرزو مند ہوں۔ وہاں پہنچ کر چاہتا ہوں کہ اپنے خالق کی زیارت کروں اور اُس سے تقاضا کروں کہ میری ذہنی کیفیت کی عقلی وضاحت کی جائے۔ اور یہ کوئی آسان کام نہ ہوگا مجھ سے آپ کو شکایت نہ ہونی چاہیے میں تو خود اپنے لیے بھی ایک معمہ ہوں برسوں گزرے میں نے کہا تھا۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں ، واللہ نہیں ہے

وہ خیالات جو میری روح کی گہرائیوں میں ایک طوفان بپا کیے ہوئے ہیں عوام پر ظاہر ہو جائیں تو پھر مجھے یقین واثق ہے کہ میری موت کے بعد میری پرستش ہوگی۔ دنیا میرے گناہوں کی پردہ پوشی کرے گی اور مجھے اپنے آنسوؤں کا خراج عقیدت پیش کرے گی''

اقبال کی طبیعت میں کسی قسم کا اضمحلال پیدا نہ رہا تھا طرح طرح کے عوارض اور مرض کی روز افزوں شدت سے ان پر یاس و ناامیدی کی کوئی کیفیت طاری ہوئی نہ اس سے گھبرا کر انہوں نے کسی تلخی اور افسردگی کا اظہار کیا۔ یہاں تقی عابدی نے بہت ہی عمدہ الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اقبال سے متعلق بہت ہی تحسین آمیز بات کہی ہے۔

''وہ ہر لحظہ زندہ تھے اور اس سے کہیں بڑھ کر یہ کہ ان کا دل زندہ تھا۔'' (۱۲)

کیونکہ علامہ اقبال کا ایمان بہت پختہ تھا وہ جانتے تھے کہ یہ تمام عوارض اللہ کی طرف سے ہیں آپ نے ان تمام مشکلات کا مقابلہ بہت خندہ پیشانی سے کیا۔ خدا کے سامنے اگر کبھی شکوہ کر لیتے تو اسی وقت توبہ توبہ کرتے کہ اس سے شکوہ کرنا روا نہیں ہے۔ بے چینی اور کُرب سے رشتہ ضرور رہا۔ مگر اقبال نے حوصلہ مندی، ثابت قدمی اور خوش ذوقی میں کبھی فرق نہ آنے دیا۔ انہوں نے بیماریوں سے دل گرفتہ ہونا جیسے سیکھا ہی نہ تھا۔ ذرا طبیعت سنبھلتی تو وہی احباب کی محفلیں، علمی مباحث، سیاست ، مذہب ، فلسفہ، منطق ، تاریخ اور تصوف ان میں سے ہر موضوع پر نئے اور پرانے ملاقاتی اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر تبادلہ خیال کرتے اور علمی تشنگی بجھاتے۔

اقبال کو انجمن حمایت اسلام سے خاصی دلچسپی تھی۔ وہ اس حمایت کو مسلمانوں کی تنظیم و تعلیم کے لیے ایک موزوں پلیٹ فارم خیال کرتے تھے۔ کمزوری بصارت کی وجہ سے انجمن کے کاغذات پڑھنے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ آپ نے دستخط کی بجائے مُہر کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اقبال نے بارہا اس انجمن کے پلیٹ فارم پر اپنی نظمیں پڑھی تھی۔ ''شکوہ'' جیسی پُر اثر نظم بھی اسی جلسے میں سُنی گئی تھی۔ آخری بار ۱۹۳۹ء کو اقبال نے اپنی نظم ''خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ'' کسی اور شخص کی

زبان سے اس انجمن میں پڑھی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کے پختہ ایمان ہونے کا بھی تذکرہ شامل کتاب کیا ہے کہ تمام علالتوں کے علاج ایک طرف نگران کا اللہ اور اس کے رسولؐ پر اعتقاد ایک طرف تھا۔ کبھی تو شفا کو مکہ کی صراحی سے حاصل کرتے ہیں اور کبھی سید زادہ کے کہے ہوئے نسخے کو استعمال کر رہے ہیں۔ حکیم نابینا کی روحانیت پر اعتقاد بھی اللہ پر یقین ظاہر کرتا ہے۔ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام کی بارش کر کے باطنی سکون حاصل کرنا قابلِ ذکر ہے۔

سر سید سے متعلق بھی ایک روایت ملتی ہے کہ اقبال نے ان کو خواب میں دیکھا انہوں نے خواب میں پوچھا کہ کس وقت سے بیمار ہو اقبال نے بیمار رہنے کی مدت دو سال بتائی۔ تو سر سید احمد خان نے حضور رسالت مآب کی خدمت میں عرض کرنے کو کہا تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

''میری آنکھ اسی وقت کھل گئی اور اس عرض داشت کے چند شعر جواب طویل نظم ہوگئی ہے میری زبان سے جاری ہوگئے۔ انشاء اللہ ایک مثنوی فارسی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' نام کے ساتھ یہ عرض داشت شائع ہوگئی۔ ۱۴ اپریل کی صبح سے میری آواز میں کچھ تبدیلی شروع ہوئی۔ اب پہلے کی نسبت آواز صاف تر ہے۔ اور اس میں وہ رنگ عود کر رہا ہے جو انسانی آواز کا خاصہ ہے گو اس میں ترقی کی رفتار بہت ست ہے۔ جسم میں بھی عام کمزوری ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں''

غرض اس کتاب میں تقی عابدی نے اقبال کے تمام عوارض اور اس سلسلے میں ہر دوائی اور معالج کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب اقبال کے عرفانی زاویے علامہ محمد اقبال پر اکتیس متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں ۱۸۰ صفحات ہیں اس کتاب میں تقی عابدی نے اقبال کی فکر کو مکمل جامعیت کے ساتھ رقم کیا ہے۔ کتاب کا انتساب والد گرامی کے نام ہے۔ جس میں تقی عابدی نے تحریر کیا ہے

''جنت مکانی خلد آشیانی مرحوم و مغفور سید سبط نبی عابدی منصف (ریٹائرڈ جج) کی محبتوں کے نام جو میرے لیے اقبال شناسی کے پہلے اور آخری معلم ہیں''۔

انتساب میں ہی تقی عابدی نے فارسی کے مشہور استاد عرفی شیرازی کا فارسی شعر بھی لکھا ہے:

دانم نرسد ذرہ بہ خورشید و لیکن

شوق طیراں می کشد ارباب ہمم را

کتاب کا نسخۂ دیانت ڈاکٹر عبدالرحمان عبد نے ۱۴ اگست ۲۰۰۰ء میں تحریر کیا ہے. جس میں انہوں نے یہ انکشاف کیا اکیسویں صدی اقبال کی صدی کہلائے گی۔ کیونکہ اقبال کا شعری اور نثری کلام اخلاقی اور روحانی اقدار پر مبنی ایک ایسے فلسفہ حیات کا حامل ہے. جس نے تمام عالم انسانیت پر گہرا اثر چھوڑ دیا ہے انہوں نے تقی عابدی کی انتھک محنت کو بھی تحسین آمیز الفاظ کے ذریعے داد دی کہ ان کی یہ کتاب دلدادگان اقبال اور اقبالیات کے طلبہ کے لیے ایک گراں بہا تحفہ ہے۔ اقبال پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں جو معلومات فراہم تو کرتی ہیں مگر مغالطے زیادہ پیدا کرتی ہیں۔ کچھ متعصبانہ نظروں نے اقبال کے پیغام کی حقیقی روح کو مجروح کر کے پیچیدہ مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر عبدالرحمان عبد کے خیال میں موجودہ نسل اور آئندہ نسل کو از سر نو کلام و پیام اقبال کو بلا تعصب متعارف کروانے کی ضرورت ہے۔ تقی عابدی نے کلام اقبال کو کم ظرف اور کوتاہ اندیش ناقدین کی آراء کے چنگل سے آزاد کر کے عوام الناس تک بلا گزند پہنچانے کا قصد کیا ہے۔

اقبال کی شخصیت کا اندازہ ان کے کلام کو سامنے رکھ کر لگایا جاتا ہے۔ جو کہ ایک جگہ یکساں نہیں ملتا اور اگر یکجا مل بھی جائے تو وہ تصدیق شدہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا مطالعہ اقبال کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کرنے کے لیے انتہائی جانفشانی کی ضرورت ہے۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی جستجو کو ایک مثبت راستے پر گامزن کیا۔ تقی عابدی نے نہایت ذمہ داری سے مکمل دلائل اور دستاویزات کے ساتھ اس فرض کو نبھایا ہے یہاں ڈاکٹر عبدالرحمان نے بہت ہی خوبصورت انداز سے سید ضمیر جعفری اور تقی عابدی کے لیے الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بابائے ظرافت جناب ضمیر جعفری مرحوم جنہوں نے ڈاکٹر عابدی کو ''نیویارک کے جمیل جالبی'' کا خطاب دیا ہے۔ اگر آج حیات ہوتے تو ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ کے معمول کو دیکھتے تو وہ انہیں ''کتابی کیڑا'' نہیں ''کتابی مگرمچھ'' کہتے۔

کینیڈا میں بیٹھ کر اردو کے ایک ضخیم ذخیرے کا حصول کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ اقبال کی

فکراور شخصیت پر تقی عابدی نے بہت ہی سنجیدگی سے قلم اٹھایا ہے۔ڈاکٹر عبدالرحمان نے نسخہ دیانت کو اگست میں لکھنے کو بھی خوش قسمتی کہا ہے کہ حسن اتفاق دیکھئے کہ اظہار خیال کی یہ سعادت مجھے ماہ اگست کے ان لمحات میں نصیب ہو رہی ہے جو تمام برصغیر کے لیے مژدہ آزادی بن کر آئے تھے۔روئے سخن اس ہستی کی جانب ہے جسے سراپا آزادی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔علامہ اقبال آزادی کے پیامبر تھے منزل آزادی کے خضرِ راہ بھی اور جدو جہد آزادی کے علمبردار بھی۔انسانی حقوق کے تحفظ میں اُن کا پیام ایک مجسم آئین انسانیت کی مثال ہے۔

تقی عابدی نے اپنی توضیحی کتاب کا آغاز علامہ محمد اقبال کی دعا سے کیا ہے۔یہ زبور عجم میں موجود علامہ اقبال کی ایک دعا ہے۔اس دعا سے پہلے تقی عابدی نے بانگ درا کی دو دعاؤں ''بچے کی دعا'' اور ''دعا'' کا بھی حوالہ دیا ہے۔تقی عابدی نے یہ انکشاف بھی ظاہر کیا ہے کہ علامہ اقبال نے اس دعا میں جو کچھ بھی مانگا وہ سب کا سب علامہ اقبال کو مل گیا۔اس کا آغاز 'یارب سے شروع ہو کر' 'بدہ' یعنی'' دے'' پر ختم ہوتا ہے۔علامہ اقبال نے یہ دعا اپنے لیے نہیں مانگی نہ ہی کسی دنیاوی معاملے کے لیے مانگی تھی۔تقی عابدی نے اس دعائیہ نظم کے اشعار کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا ترجمہ اور تشریح بھی گاہے بگاہے بیان کر دی ہے۔سات اشعار کی تشریح آسان الفاظ میں بیان کر دینا اقبالیات کے فارسی کلام کو آسان اردو ترجمے کے ساتھ پیش کر دینا ان کے لیے بہت سی مشکلات کو آسان کر دیتا ہے علامہ اقبال نے اس انوکھی اور دلچسپ دعا میں نام نہاد مسلمان علماء اور مولویوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ان سات اشعار میں علامہ اقبال نے دس دعائیں مانگی تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ پوری ہوئیں۔تقی عابدی نے اس مضمون کا اختتام ایک ایسے شعر پر کیا ہے۔جو علامہ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے دعائیہ انداز میں کہا تھا

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

ڈاکٹر تقی عابدی نے علامہ اقبال کی مثنوی کو سورۃ الاخلاص کا ترجمہ قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ کوئی دوسرا شاعر شاید ہی ایسا ہو جس نے قرآن کی ایک مکمل سورہ کی تفسیر اس انداز میں کی ہو۔مثنوی رموز بیخودی میں سورۃ الاخلاص کی تفسیر (۱۱۵) فارسی اشعار پر مشتمل ہے۔تقی عابدی نے اس مضمون

میں سورۃ الاخلاص کو ایک تہائی قرآن ہونے کا حوالہ بھی دیا ہے کہ سورۃ الاخلاص جس کو سورۃ توحید بھی کہتے ہیں قرآن مجید کا (۱۱۲) واں وہ عظیم معنی و معرفت خیز سورہ ہے۔ جس کی بابت ابن عباس حضور اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ اس سورہ کی عظمت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے ڈاکٹر تقی عابدی نے سورہ اخلاص کی چاروں آیتوں کو اس مثنوی کا لبادہ پہنایا ہے۔ تقی عابدی نے اس مثنوی کے ۱۱۵ اشعار کو ترجمہ کے طور پر پیش کیا ہے تا کہ اقبالیات کے طالب علم اس مثنوی کا اردو ترجمہ پڑھ کر با آسانی اس کو سمجھ سکیں۔ علامہ محمد اقبال کی دعائیہ شاعری اور مثنوی سے ذرا آگے بڑھے تو رحمت اللعالمین کی محبت میں کھو گئے۔ حضرت علامہ کو آپؐ سے بے حد عقیدت تھی اور عشق محمدؐ میں ساری عمر تڑپتے رہے کہ روضہ رسولؐ پر حاضری دے سکیں۔ اسی بات کے پیش نظر ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کی نعتیہ شاعری کو بھی اس کتاب کا حصہ بنایا ہے حسانِ بن ثابت سے یہ سلسلہ نعت گوئی شروع ہوا اور آج تک جاری و ساری ہے۔ لیکن علامہ اقبال نے جس انداز میں عشق محمدیؐ میں ڈوب کر نعت خوانی کی ہے علامہ سے پہلے اور علامہ کے بعد بھی کسی اردو یا فارسی کے شاعر نے نہیں کی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے ان نعتیہ اشعار کو ترجمے کے ساتھ جا بجا بیان کیا ہے۔ عرفی شیرازی کے قول کو بھی اسی مضمون میں رقم کیا ہے کہ نعت گوئی کرتے ہوئے اک اک بات مکمل دھیان سے لکھی جاتی ہے کیونکہ یہ رستہ بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز راستہ ہے۔ کیونکہ ذرا سی غلطی ثواب کے بجائے مورد عتاب بن سکتی ہے۔ اقبال نے بھی اسی راستے کا انتخاب کیا ہے کیونکہ آپ عشق محمدیؐ سے لبریز تھے۔ تقی عابدی نے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی شاعری کو نعتیہ شاعری کا خلاصہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ اقبال مدینہ کو ملت اسلامیہ کا مرکز تصور کرتے تھے۔ رسول معظمؐ جو تمام مسلمانوں سے وابستہ تھے مدینہ میں مدفن ہیں۔ اور اقبال کے مطابق عملی تربیت صرف بارگاہِ نبویؐ سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ آپؐ کی تعلیمات کو بھی نعتیہ شاعری کا حصہ علامہ اقبال نے بنایا۔ آپؐ کی تعلیمات کی وجہ سے نسلی اور نسبی امتیازات مٹ گئے۔ سردار طے کی بیٹی کو اپنی ردا اوڑھا کر آزاد کر دیا۔ علامہ محمد اقبال نے مسلمانوں کو زوال کا احساس دلانے کے لیے قبیلہ طے کی اس لڑکی کی مثال دی ہے کہ آج ہم طے قبیلے کی اس لڑکی سے زیادہ ننگے ہیں کیونکہ ہم اپنے کردار اور عمل کی وجہ سے احترام عالم کے سامنے برہنہ ہو چکے ہیں۔ دنیا اور آخرت دنوں میں کامیابی آپؐ کے دامن سے وابستہ رہنے میں ہے۔ ڈاکٹر

تقی عابدی نے اقبال کے ایک شعر کو بہت ہی خوبصورت انداز میں ترجمہ کیا:

''ہم گلاب کی سو پنکھڑیوں کی طرح ہیں لیکن ہماری خوشبو ایک ہی ہے
جو ہمارے معاشرے اور نظام کی جان ہے۔ وہ بھی صرف ایک ذات
برگزیدہ حضور اکرمؐ ہے۔''

عشق محمدیؐ میں سرشار ہونے کی بناء پر ارمغان حجاز میں بہت سے نعتیہ اشعار لکھے۔ آخری عمر میں آپ کا اسم گرامی سنتے ہی آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ یہاں تقی عابدی نے جب عشق محمدی کا ذکر کیا تو ساتھ ہی عشق کا لغوی مفہوم بھی واضح کر دیا کہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور عشق کی خصوصیات فارسی اور اردو شاعری میں ناپید تھی۔ مگر اقبال نے اس کا ٹھیک استعمال کیا ہے کیونکہ اقبال نے عشق کا مفہوم مولانا روم سے لیا اور مولانا روم کا مبدا قرآن ہے۔ اقبال عقل کو کم مایہ و ناقص اور عشق کو کامل جانتے ہیں۔ تقی عابدی نے یہاں بہت ہی عمدگی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اقبال اور علیم الدین کا واقعہ بیان کیا ہے کہ علیم الدین نے گستاخی رسول کرنیوالوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تو اقبال اس کے جنازے کو حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ اور شدید بیماری کی حالت میں بھی دروازے پر اس کے جنازے کے استقبال میں کھڑے رہے۔ اور بیماری کی حالت میں بڑی دور تک جنازے کو کندھا دیا۔ یہ سب عشق محمدی کا کمال تھا۔ ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' میں اقبال نے اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا ہے کہ جب بھی اقبال نے حضورؐ پر درود بھیجنا چاہا تو وہ شرمندگی سے پانی پانی ہو گئے کیونکہ وہ ابھی اپنے نفس کو اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ حضورؐ کا اسم عظیم اپنے ناپاک ہونٹوں سے لیں۔

عشق محمدیؐ سے سرشار اس عاشق کے والد مرحوم نے یہ کہہ کر دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا کہ تم ملکوں ملکوں پھرتے ہو مگر روضہ اطہر پر حاضری نہیں دی۔ اس وقت کے جذبات کو تقی عابدی نے لفظوں کا حسین جامہ پہنایا ہے کہ اقبال کو روضہ رسول پر جاتے ہوئے شرمندگی محسوس ہوتی تھی کیونکہ وہ ابھی اپنے نفس کا تزکیہ کرنا چاہتے تھے۔ علامہ اقبال کو اکبر الہ آبادی سے خاص عقیدت تھی۔ انہوں نے جس خط میں اکبر الہ آبادی کو روضہ رسولؐ پر جانے کی خواہش کے متعلق بتایا تقی عابدی نے اس خط کو بھی تحریر کیا ہے۔ پھر روضہ رسولؐ پر حاضری نہ دے سکے کیونکہ آخری عمر میں بیماریوں نے آگھیرا تھا۔ لہٰذا اقبال نے عالم خیال میں ہی روضہ رسولؐ پر حاضری دی۔ تقی عابدی نے اقبال کے عشق رسولؐ

سے انتہا کو بیان کرنے کے غلام بھیک نیرنگ کا بیان بھی نقل کیا ہے کہ اگر اقبال اس عمر میں روضہ رسولؐ پر حاضری دیتے تو یقیناً زندہ سلامت واپس نہ آتے بلکہ وہی پر جان بحق ہو جاتے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کی اقبال سے عقیدت بھی اسی رشتے کی وجہ سے بھی تھی کہ تقی عابدی اہل بیت کی محبت میں سرشار ہیں اور اقبال بھی اہل بیت سے حد درجہ عشق کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے بوصیری اور قصیدہ بردہ شریف کا تذکرہ بھی اسی نسبت سے کیا۔ کہ بوصیری کو آپؐ سے عقیدت تھی کیونکہ خواب میں رسول کریمؐ نے بوصیری چادر اوڑھائی اور کہا کہ تم فالج سے صحت یاب ہو جاؤ گے اور صبح کے وقت یوں ہی ہوا۔ یہ (۱۶۰) اشعار پر مشتمل قصیدہ رفع ودفع اور حل المشکلات کہلاتا ہے۔

علامہ اقبال نے بوصیری کا تذکرہ دو دفعہ اور عظیم نعت گو شاعر حسان بن ثابتؓ کا ذکر ایک دفعہ کیا ہے۔ اقبال نے ان دونوں شخصیات کو اپنی شفایابی کی دعا کے لیے حضورؐ کے سامنے بطور حوالہ دیا۔ پھر سرسید کو بھی بھوپال میں خواب میں دیکھا جنہوں نے چند اشعار حضورؐ کی خدمت میں لکھنے کو کہا۔ تقی عابدی نے ان چند اشعار کے متعلق کہا ہے کہ اقبال نے لاہور پہنچ کر چند اشعار لکھے تھے اور اس ''مثنوی کو پس چہ باید کرد'' کے نام سے منسوب کیا۔ یہ سب عشق رسولؐ ہی تھا اور حضرت محمدؐ سے عشق کی بدولت علامہ اقبال کو ہر اس رشتے سے عشق تھا جو آپؐ سے منسوب ہے۔ اقبال حضرت علیؓ کو مردِ مومن تصور کرتے تھے اسی لیے اقبال نے مثنوی ''اسرار خودی'' میں حضرت علیؓ کے ناموں خطابات اور القابات کی تشریح بڑے دلکش انداز میں کی ہے۔ آپؐ سب سے پہلے ایمان لانے والے مردوں کے شاہ اور عشق رسولؐ میں غرق، نبی کریمؐ پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ علامہ اقبال نے حضرت علیؓ کو ''ابوتراب'' ''یداللہ'' ''منتخب و پسندیدہ'' جیسے القابات سے نوازا ہے۔ اور شاعری میں جا بجا ان ناموں کا استعمال کیا۔ اقبال نے حضرت علیؓ کو علم وحکمت کا سمندر قرار دیا۔ تقی عابدی نے ''اسرار خودی'' ''بانگ درا'' ''ضرب کلیم'' ''جاوید نامہ'' سے حضرت علیؓ کی محبت اور بہادری میں لکھے گئے اشعار کو یہاں نقل کیا ہے اور ساتھ ساتھ اقبال کی فکر کی بھی توضیح فرما دی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا وہ شعر جو عشق علیؓ کا خلاصہ ہے وہ بھی اسی توضیحی کتاب میں بیان کیا ہے۔ جس کا ترجمہ کرتے ہوئے تقی عابدی تحریر کرتے ہیں:

''اے شہر محبت کے دروازے، اے محبت کے سفینہ کے ناخدا، اے

معبود اور عبد کے درمیانی رشتے ، اے قرآنی سورتوں کی تفسیر، اے راز دار نبوت، جس کی روح۔ روح محمدؐ ہے بغیر (علیؓ) محمدؐ تک نہیں جاسکتے اور (محمدؐ) کے بغیر (علیؓ) تک نہیں پہنچ سکتے۔''

یہی وجہ ہے کہ اقبال بڑی دیدہ ریزی اور مشکل پسندی سے اہل بیت کی مدح کرتے تھے۔ اور ان موضوعات پر قلم اٹھاتے وقت دوسرے اساتذہ سخن کے مشوروں اور رہنماؤں سے بہرہ مند بھی ہوتے تھے۔ منقبت حضرت فاطمہؓ لکھتے ہوئے علامہ محمد اقبال نے چھ ہفتے غور وفکر کیا۔ کیونکہ حضرت فاطمہ تین رشتوں کی وجہ سے اقبال کے لیے باعث عزت تھی، حضرت محمدؐ نبی آخرالزماں کی بیٹی ہونے کے ناطے۔ شیرِ خدا کی بیوی اور حضرت امام حسینؓ کی ماں کی نسبت سے۔ اقبال حضرت امام حسین سے والہانہ عشق کرتے تھے۔ اقبال فخر شاہی اور فقر خانقاہی کو مسلمانوں کے لیے مضر خیال کرتے تھے اور اسی لیے ارمغان حجاز میں مسلمانوں کو ''مسلک شبیری'' کی دعوت دیتے ہیں۔ حضرت امام حسینؓ کے نقش قدم پر چلنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ حضرت امام حسینؓ قربانی، فداکاری، ایثار اور عشق حقیقی کا راستہ ہیں۔ حضرت امام حسین نے قیامت کے لیے ظلم وستم کا خاتمہ کر کے اسلام کو ہمیشہ کے لیے زندہ وجاوید کر دیا۔ حضرت امام حسین سے اقبال کی محبت اس بات سے جھلکتی ہے کہ ''امام حسینؓ اپنی امت میں ایسی اہمیت رکھتے تھے جس طرح قرآن مجید میں قل ھواللہ احد''

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ہاشمی کی تصنیف اقبال کا تصور زمان ومکان بھی اسی نادر کتاب کا حصہ ہے اقبال نے اس سائنسی اور فلسفیانہ مسئلہ پر جو سیر حاصل گفتگو کی ہے تقی عابدی نے مکمل اشعار کی روشنی میں اس مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔ مثنوی اسرار خودی کے اشعار اور بال جبرئیل کی نظم ''زمانہ'' کا تذکرہ بھی مناسب ہے۔ شاہین اور مرد مومن کی اصطلاح اقبال کی اختراع ہے۔ تقی عابدی نے اس موضوع کا آغاز بابائے ظرافت سید ضمیر جعفری کے مزاحیہ طنزیہ اور سنجیدہ شعر سے کیا۔ اقبال نے شاہین کی اختراع محض شاعرانہ طور پر نہیں کی بلکہ اس جانور میں پائی جانے والی خصوصیات کو مردِ مومن میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ کہ شاہین اور مرد مومن کی خصوصیات مشترک ہوتی ہیں۔ علامہ اقبال کے اُردو کلام میں (۴۲) اشعار شاہین پر اور پانچ اشعار شاہین صفت پرندے باز، شہباز اور عقاب پر ملتے ہیں۔ جس میں ایک (۸) اشعار پر مشتمل نظم ''شاہین'' بال، جبریل میں شامل ہے۔ آپ کے

فارسی کلام میں (۳۲) اشعار شاہین پر اور (۲۷) اشعار شاہین صفت باز پر نظر آتے ہیں جن میں دو نظمیں ''شاہین وماہی'' اور بند باز بہ بچہ خویش'' ''پیام مشرق'' میں شامل ہے۔ اس طرح اس موضوع پر کل (۱۰۴) اشعار موجود ہیں۔ اقبال نے شاہین اور مرد مومن میں خلوت نشینی، اندیشہ گیری، اور خود شناسی جیسی صفات کی قدر کو مشترک قرار دیا ہے اس مضمون کا نتیجہ اور حاصل گفتگو میں کہا ہے کہ اقبال مسلمانوں کے لیے شاہین وار زندگی کی آرزو اور تمنا رکھتے تھے۔

خواجہ حسن نظامی اکبر الہ آبادی، مہاراجہ کشن پرشاد سے اقبال کے روابط اور تعلق کو واضح کرنے کے لیے حسن نظامی نے تین عنوانات ان کے نام سے ہی شامل کتاب کیے ہیں۔ خواجہ نظامی سے جو قلمی جنگ اسرار خودی لکھنے پر ہوئی اس کو مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اسرارِ خودی کا نام حسن نظامی نے خود تجویز کیا تھا مگر بعد میں حالات بگڑتے چلے گئے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے۔ یہ قلمی جنگ تقریباً تین سال تک جاری رہی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال اور خواجہ حسن نظامی کی قلمی جنگ کی تمام وجہ بھی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ کہ اسرار خودی میں موجود نظریات خواجہ حسن نظامی کے موافق نہ تھے اگلا مضمون اکبر الہ آبادی پر ہے جن کو اقبال اپنا پیر ومرشد تصور کرتے تھے۔ اقبال اپنے دل کا دکھڑا اکبر الہ آبادی کے سامنے روتے تھے۔ اور اکبر بھی اپنے دل کا حال کھول کر اقبال کے سامنے بیان کر دیتے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد سے بھی اقبال کے دوستانہ روابط تھے وہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیوں میں بھی علامہ اقبال سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ان تمام شخصیات کا اگر تذکرہ کیا گیا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اقبال کے استاد مولوی میر حسن کا تذکرہ نہ کیا جاتا۔ اقبال کی ملاقات اپنے محترم استاد سے چار سال اور چار مہینے کی عمر میں ہوئی اور ۴۸ سال تک اقبال ان سے فیض اٹھاتے رہے۔ شاعر مشرق اپنے استاد کا اس حد تک احترام کرتے تھے کہ کبھی بھی اپنے استاد کے سامنے شعر سنانے کی جرأت نہ کی۔ ۱۹۲۳ء میں جب علامہ اقبال کو سَر کا خطاب دیا گیا تو آپ نے اپنے محترم اُستاد کو بھی خطاب دینے کی درخواست کی تھی۔ جس پر گورنر جنرل نے پوچھا کہ ان کی کوئی تصنیف بتائیں جس پر اُن کو خطاب دیا جائے تو آپ نے جواب دیا کہ میں خود ان کی زندہ وجاوید کتاب ہوں۔ سر سید کی وفات پر علامہ اقبال نے مادہ تاریخ استخراج ''مارسلنک الا رحمتہ للعالمین'' نکالا تھا۔ اسی طرز کا دوسرا مضمون داغ دہلوی سے متعلق ہے۔ داغ دہلوی سے اقبال کے

شفقت بھرے تعلقات تھے۔انہوں نے شروع شروع میں داغ دہلوی سے خط وکتابت کے ذریعے اصلاح کا کام لیا تھا۔مگر جلد ہی داغ دہلوی نے اقبال کو کہہ دیا کہ آپ کو اب اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔اقبال کو حضرت داغ سے ملاقات کا بے حد شوق تھا۔اقبال نے حیدرآباد دکن کا سفر ضرور کیا مگر حضرت داغ سے ملاقات نہ ہو سکی کیونکہ وہ داعی اجل کو خیر آباد کہہ چکے تھے۔حیدرآباد دکن میں اقبال کی ملاقات طباطبائی سے ہوئی جلیل حسن مانک، ظہیر دہلوی، مہاراجہ کشن پرشاد سے بھی ملاقات کی۔ واپسی پر دو روز اورنگ آباد میں قیام کیا اور عالمگیر اورنگ زیب کی قبر کی زیارت بھی کی۔۱۹۲۹ء میں ہی اقبال عثمانیہ یونیورسٹی کی دعوت پر لیکچر دینے کے لیے گئے۔اقبال کے استقبال کے لیے سر اکبر حیدری، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر عبداللہ عمادی، ڈاکٹر مظفرالدین قریشی اور یونیورسٹی کے بہت سے اساتذہ شامل تھے۔محفل مشاعرہ میں حیدر جنگ نظم طباطبائی، ضیاجنگ، عزیز یار جنگ، مسعود علی محوی، نظام تموری، کاظم علی باغ، اور جوش ملیح آبادی قابل ذکر ہیں ڈاکٹر تقی عابدی نے ان گراں قدر شخصیات پر خامہ فرسائی کرنے کے ساتھ ساتھ اقبال سے متعلقہ متفرق مضامین بھی جمع کیے ہیں۔جو اقبال کی ذاتی زندگی سے سے تعلق رکھتے ہیں۔پہلا مضمون اقبال کی ازدواجی زندگی سے متعلق ہے۔ اقبال کی تینوں شادیوں کا ذکر قابل تحسین ہے۔عام طور پر لوگوں کو اقبال کی شادیوں سے مکمل آگاہی نہیں ہوتی۔تقی عابدی نے اس معمہ کو اپنی کتاب میں جامعیت کے ساتھ سلجھایا ہے۔پہلی شادی ۱۸۹۳ء کریم بی سے ہوئی۔تقی عابدی نے کریم بی سے اختلاف کو بھی اس مضمون میں واضح طور پر کھول کر بیان کر دیا ہے۔۱۹۱۵ میں دوسری شادی کی۔دوسری بیگم کا نام سردار بیگم تھا چند ناخوشگوار وجوہات کی بناء پر رخصتی نہ ہو سکی۔تیسری شادی لدھیانہ کے لکھ پتی خاندان کی بیٹی مختار بیگم سے ہوئی۔ مختار بیگم کے کہنے پر ہی اقبال سردار بیگم کو گھر لے آئے۔جاوید اقبال سردار بیگم کے بیٹے ہیں۔منیرہ جاوید اقبال کی بہن ہیں۔سردار بیگم ۱۹۳۵ء میں فوت ہوئیں اور مختار بیگم حالت زچگی میں فوت ہو گئیں تھیں۔ایک مضمون اقبال پر لگائے گئے شراب نوشی کے الزام کے متعلق ہے۔ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مضمون میں اس الزام کی تردید کی ہے کہ اقبال ہرگز شراب نوش نہ تھے۔انہوں نے عمر بھر شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔اقبال کو سرود و ساز سے دلچسپی ضرور تھی اور محفل موسیقی میں شرکت کیا کرتے تھے۔رقص اور مے گساری کے بساط بھی بچھے ہوتے تھے۔اقبال نغمات ضرور سنتے تھے لیکن

لغویات سے اُن کو سروکار نہ تھا۔ اقبال بہت شوخ اور بذلہ سنج تھے۔ شراب خوری کے ذکر پر مذاق اڑاتے تھے۔ شراب تخیل شراب طہورہ جام تصوف، بادہ عرفان مستی بے خودی اور قلندری کی اصطلاح استعمال کرنے کو ہم اقبال کے شراب نوش ہونے کے لیے استعمال نہیں کر سکتے۔ اقبال کو شراب سے بے حد نفرت تھی۔ اقبال کو اہل بیت سے اس قدر عقیدت تھی تو وہ شراب جیسی حرام چیز کو کس طرح ہاتھ لگا سکتے تھے اقبال کا وظیفہ سپاس امیرؓ تھا۔ یہ نظم با اظہار عقیدت اقبال صبح کے وقت پڑھا کرتے تھے۔ یہ نظم باقیات اقبال میں موجود ہے تقی عابدی کو اس سپاس امیر کی کاپی جناب احمد حسین نے عنایت کی ہے جو مرحوم تصدق حسین تاج کے بیٹے ہیں۔ تصدق حسین تاج نے ۱۹۳۸ء میں احمد یہ پریس چار مینار سے اس نظم کو شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ان اشعار کو سپاس جناب امیرؓ کے عنوان سے شامل کیا ہے اور یہ چونتیس (۳۴) اشعار ترجمے کے ساتھ موجود ہیں۔ جن سے قاری با آسانی استفادہ حاصل کر سکتا ہے۔ مسئلہ فلسطین بھی تمام عمر اقبال کی شاعری کا موضوع بنا رہا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے مسئلہ فلسطین کی مکمل تاریخ بھی اس مضمون میں رقم کی ہے۔ کہ مسجد اقصیٰ پر کس طرح قبضہ جمانے کی سازش کی گئی۔ ہزاروں فسلطینوں کا قتل عام کیا گیا۔ اقبال کو بھی فلسطین کے حالات پر تشویش تھی۔ ۱۹۳۱ء میں موتمر میں شرکت کے لیے اقبال بیت المقدس بھی گئے اور مقامات مقدسہ کی زیارت کے علاوہ فلسطین کے یتیم خانہ، حضرت عیسیٰ کے محل ولادت اور فلسطین کے اکابروں اور نوجوانوں سے ملاقاتیں کیں۔ اقبال فلسطین کے لیے ساری زندگی جہاد بالقلم میں مصروف رہے مولانا گرامی سید سلیمان ندوی، جیسی گراں قدر شخصیات پر مضامین بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔ مولانا گرامی پر لکھا گیا مضمون کافی طوالت رکھتا ہے اس کتاب کا اختتام ڈاکٹر تقی عابدی نے اقبال کی فارسی مثنوی پر کیا ہے کہ یہ مثنوی سورۃ اخلاص کا فارسی ترجمہ ہے جس کا اردو ترجمہ تقی عابدی نے علاحدہ مضمون میں کیا ہے۔

کتابیات

اسلم جیراجپوری، آثارِ اقبال، (دکن۔حیدرآباد، ۱۹۴۶ء)

ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن (چہارم) (لاہور: ترجمان القرآن، ۱۹۸۸ء)

انعام الحق کوثر، ڈاکٹر، اقبالیات کے چند خوشے (کوئٹہ: سیرت اکادمی، ۱۹۹۶ء)

برنی، مظفر حسین

۔ کلیات مکاتیب اقبال (اوّل) (دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۲ء

۔ کلیات مکاتیب اقبال (دوم) (دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۱ء

۔ کلیات مکاتیب اقبال (سوم) (دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۳ء

۔ کلیات مکاتیب اقبال (چہارم) (دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۸ء

بہار الہ آبادی، تفسیر اقبال (سری نگر: گلشن پبلشرز، ۱۹۸۲ء)

۔ تقی عابدی، چوں مرگ آید، (لاہور: اقبال اکادمی ، ۲۰۰۷ء)

۔ تقی عابدی، اقبال کے عرفانی زاویے (لاہور: القمر انٹرپرائزز، ۲۰۰۱ء)

۔ دیوان رباعیات انیس (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۱۳ء))

۔ یادگار مرثیہ (دہلی: دریا گنج، ۲۰۰۲ء)

۔ فیض فہمی، (لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۱۱ء)

۔ فیض شناسی ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)

۔ کلیات غالب فارسی (دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۰۸ء)

جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)

حمید یزدانی، خواجہ، شرح ارمغان حجاز (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)

۔ شرح بال جبریل (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)

خالد نذیر صوفی، اقبال درون خانہ (لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۰۸ء)

رفیع الدین ، ہاشمی ، اقبال کی طویل نظمیں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)

- رضی الدین صدیقی، اقبال کا تصور زمان ومکاں (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۲ء)
- زیب النساء سرویا، اقبال کی رسولؐ سے وابستگی
- سید بابر علی، قصیدہ بردہ شریف، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۷ء)
- صہبا لکھنوی، اقبال اور بھوپال (لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۰۰ء)
- صابر کلوری، اقبال ہم نشین (لاہور: مکتبہ خلیل، ۱۹۸۵ء)
- عابد علی عابد، سید۔ شعر اقبال، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)
- مرتبہ شیما مجید، نقائس اقبال (لاہور: اقبال اکادمی ۱۹۹۰ء)
- عشرت حسین انور، ڈاکٹر، اقبال کی مابعد الطبیعات (لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۸۸ء)
- عبداللہ قریشی، محمد حیات جاوداں (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۸۷ء)
- عبدالمجید سالک، ذکر اقبال (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۸۳ء)
- عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر، روایات اقبال (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء)
- غلام احمد پرویز، شرح جاوید نامہ (لاہور: ادارہ طلوع اسلام، ۲۰۱۳ء)
- غلام رسول مہر، مطالب اسرار ورموز
- غلام حسین ذوالفقار، اقبال کا ذہنی وفکری ارتقاء (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۹۸ء)
- فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے (لاہور: گنج شکر پریس، ۲۰۱۲ء)
- فریدہ الٰہی، علامہ اقبال اور تحریک آزادی فلسطین (اسلام آباد: جاوداں پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)
- محمد اقبال، کلیات اقبال، (اردو) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۴ء)
- کلیات اقبال، (فارسی) (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۲ء)
- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (لاہور بزم اقبال، ۲۰۱۲ء)
- منیر حسین، اقبال کی دعائیہ شاعری (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۹۵ء)
- محمد یعقوب کلینی، شیخ، مرتبہ الشافی (مترجم سید ظفر حسین (کراچی: شمیم بکڈپو، ۱۹۹۱ء)
- محمد بن عیسیٰ ترمذی، جامع ترمذی (دوم) (مترجم محمد صدیق (لاہور: فرید بک سٹال، ۱۹۸۴ء)
- محمد منور، میزان اقبال (دوم) (لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۸۶ء)

- محمد ریاض، ڈاکٹر، آفاق اقبال (لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۸۷ء)
- محمد عبدالمعبود، تذکرہ اہل بیت اطہار (راولپنڈی: الفتح پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء

نذیر نیازی، سید

- اقبال کے حضور، (لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۸۱ء)
- دانائے راز، (لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۱۲ء)
- نظر حیدر آبادی، اقبال اور حیدر آباد (لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۸۱ء)
- نورالحسن، نوراللغات (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء)
- وحیدالدین، فقیر، سید، روزگارِ فقیر (کراچی: لائن آرٹس پریس، ۱۹۶۶ء)
- یوسف حسین خان، ڈاکٹر، روحِ اقبال (لاہور: آئینۂ ادب، ۱۹۸۴ء)

مقالات

انیلہ محمود، علامہ اقبال کا تصور توحید (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء)

رسائل

- چہار سو ماہنامہ ۲۰۰۹ء (راولپنڈی: فیض اسلام پرنٹنگ پریس) شمارہ مئی۔جون
- الاقربا سہ ماہی سالنامہ ۲۰۱۲ (اسلام آباد: الاقربا فاؤنڈیشن)
- اردو معارف اسلامیہ (دوم) (لاہور: دانش گاہ پنجاب۔۱۹۸۶ء)

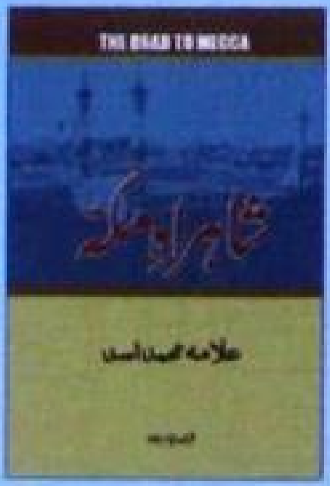
THE ROAD TO MECCA
شاہراہ مکہ
علامہ محمد اسد

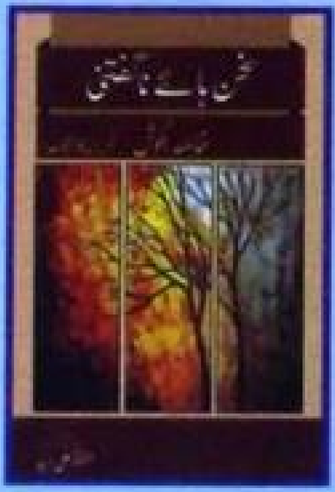

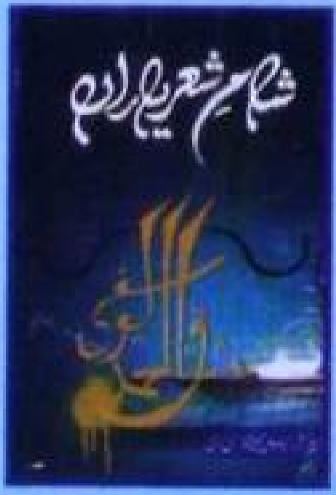

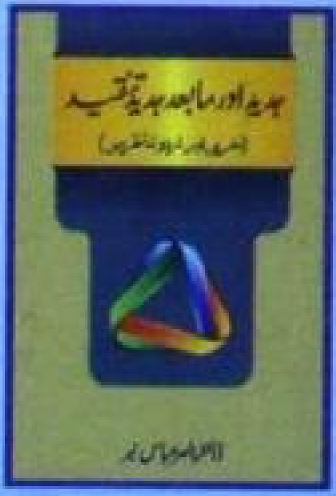
جدید اور مابعد جدید تنقید

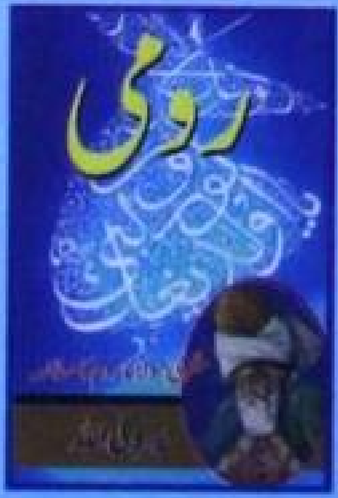
رومی

شازیہ گل اسلام آباد کے ایک کالج میں اُردو ادبیات کی لکچرار ہیں۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے اردو اعزاز کے ساتھ مکمل کیا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے انہوں نے اپنا ایم فل اقبالیات تھیسس (Thesis) مکمل کیا۔ مطالعات اور تحقیق اقبالیات سے ان کی دلچسپی ان کے فراواں شوق ہی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے نامور دانشور اور اردو زبان وادب کے بے بدل محقق اور خدمت گزار ڈاکٹر سید تقی عابدی کی اقبال شناسی کو موضوع تحقیق بنایا۔ ڈاکٹر عابدی جیسے کثیر الجہات محقق اور مصنف کی علمی مساعی کے کسی ایک گوشے کو تقابلی تجزیے کا عنوان بنانا اور اس ذمہ داری کو کامیابی کے ساتھ نبھانا شازیہ گل کی محنت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یقینی طور پر اس تالیف سے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی اقبال شناسی اور اس میدان میں ان کی انفرادیت اور فوقیت کے کئی عنوان سامنے آتے ہیں۔ شازیہ گل آج کل اپنا ڈاکٹریٹ کا پروگرام مکمل کرنے میں مصروف ہیں۔

پروفیسر شاہد اقبال کامران

M. R. Publications
Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books
10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com

ISBN 93-86125-30-7